شکستہ ستون پر دھوپ
(ناول)
انتظار حسین

(ناول)

عطیہ حسین

ترجمہ

انتظار حسین

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

آنکھیں جنھیں خواب میں دیکھنے کی بھی ہمت نہیں
موت کی سلطنت میں
وہ آنکھیں نہیں:
شکستہ ستونوں پر گری دھوپ ہیں
وہاں تو شجر کانپتا ہے
گنگناتی ہوا میں
یہ سرگوشیاں
ماند ہوتے ستارے سے بھی
روکھی، عبرت انگیز ہیں

کھوکھلے لوگ ـــــ ٹی۔ایس۔ایلیٹ
ترجمہ: سعید محمود

پیش لفظ

یوں پڑھنے کو ہم بقدر توفیق بلند پایہ ادب بھی پڑھتے ہیں اور اپنی اپنی ذہنی بساط کے مطابق اور بقدر ذوق اسے سمجھتے ہیں، اس سے حظ اٹھاتے ہیں۔ لیکن یہ لازم نہیں کہ اس کے سحر میں بھی آ جائیں۔ کیسے کوئی ایک تحریر، کوئی نظم، کوئی ناول، کوئی افسانہ پڑھنے والے کو پکڑ لیتا ہے، پکڑے جانے والے کے لیے یہ بتانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ کم از کم میرے لیے یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ اس ناول نے جو انگریزی میں Sunlight on a Broken Column کے نام سے پیش ہوا ہے، کیسے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جب پہلی مرتبہ 1961ء میں یہ شائع ہوا تھا اُس وقت نہ یہ مجھے دستیاب ہوا نہ میں نے اسے پڑھا۔ ہاں جب زمانے بعد دوبارہ لندن کے وراگو پریس نے اسے شائع کیا تو پھر یہ میرے ہاتھ آیا اور جانے وہ کون سی گھڑی تھی کہ میں بس پکڑا گیا۔ ویسے تو میں نے اسی رَو میں عطیہ حسین کے افسانے بھی پڑھے تھے۔ مگر افسانوں سے تو آسانی گزر گیا، ناول پر آ کر پکڑا گیا اور کیا پڑھتا۔ عطیہ حسین نے فکشن کے ذیل میں بس اتنا ہی کچھ لکھا ہے۔ چند افسانے جو Phoenix Fled کے نام سے مجموعے کی شکل میں شائع ہوئے اور یہ ایک ناول۔ یعنی عطیہ حسین کے یہاں تخلیقی جذبے کی عمر کوئی لمبی نہیں ہے۔ لکھنے والوں کی ایک قسم وہ بھی تو ہوتی ہے جو شعر سے یا افسانے سے عمر بھر کا پیمان وفا نہیں باندھتے۔ بس ایک لہر اندر سے اٹھتی ہے، اُس لہر میں جتنا لکھا گیا اتنا لکھا اور فارغ ہو گئے۔ عطیہ حسین کے ساتھ یہی ہوا۔ کسی لہر میں چند کہانیاں لکھیں، ایک ناول تصنیف کیا، پھر اس کام سے فراغت پالی۔

عطیہ حسین کے متعلق مختصراً ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ سال پیدائش 1913ء۔ جس گھرانے میں پیدا ہوئیں اور پلی بڑھیں وہ ایک تعلقہ دار گھرانا تھا۔ اور یہ کہ تعلقہ دار برادری میں یہ پہلی لڑکی تھی جس نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ تعلقہ دار برادری کی پہلی گریجویٹ۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اس سے متاثر ہوئیں۔ اسی اثر میں کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ صحافت اور براڈ کاسٹنگ سے بھی تعلق رہا۔ تقسیم کے ہنگامے میں جب لکھنؤ اجڑنے لگا تو کتنوں نے اس شہر سے اکھڑ کر پاکستان کا رخ کیا۔ عطیہ حسین اپنے شوہر اور دو بچوں کے ہمراہ لندن کی طرف نکل گئیں۔ بس پھر اسی شہر میں بس گئیں۔ وہاں بی بی سی سے رشتہ جوڑا اور بی بی سی ایسٹرن سروس پر عورتوں کے لیے ایک پروگرام پیش کرنے لگیں۔

عطیہ حسین نے تو لکھنؤ کو چھوڑ دیا تھا مگر لکھنؤ نے عطیہ حسین کو نہیں چھوڑا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے لندن

تک گیا۔ اسی اثر میں تو یہ ناول لکھا گیا ہے۔ کہہ لیجیے کہ یہ لکھنؤ کو لکھنؤ کی ایک بیٹی کا آخری سلام ہے۔ لکھنؤ کو اب شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ عطیہ حسین نے اسے بہت عزت سے رخصت کیا ہے۔ ہاں عزت سے تو رخصت کیا ہے، پھر بھی ایک بات کھٹکتی ہے۔ لکھنؤ جس تہذیب کا نام ہے اس کی تو ایک زبان ہے۔ یہاں شرح آرزو زبانِ غیر میں ہوئی ہے۔ جیسے آدمی کسی دوسرے کا لباس پہن لے، وہ بیشک خوب و مرغوب ہو، مگر پہچاننے والے پہچان لیتے ہیں کہ یہ لباس اس کا اپنا نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ ناول انگریزی لفظوں کے بیچ کیوں بھٹک رہا ہے۔ اس کی اصل زبان کیوں نہ لوٹا دی جائے۔ آشیانے کی بیبیوں کو، ماجدہ پھپھی، عابدہ پھپھی کو، حکیمن بوا کو، سلیمن کو اسی زبان میں باتیں کرنی چاہئیں جس زبان میں وہ باتیں کرتی تھیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کام آسان ہے۔ جب کام میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا کہ یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔ ترجمے تو میں نے اس سے پہلے بھی کیے تھے اور بعض ایسوں کو جن کے فن کا سب ہی لوہا مانتے ہیں۔ مثلاً مجھے یاد آیا کہ میں نے تورگنیف اور چیخوف کی بھی بعض نگارشات کے ترجمے کیے تھے۔ وہاں تو دقت محسوس نہیں ہوئی تھی، یہاں کیوں ہو رہی ہے۔ بات شاید یہ ہے کہ بے خبری میں بڑی عافیت ہے۔ وہ روسی تہذیب کیا تھی، اس کے ادب آداب کیا تھے، عورتیں مرد بچے جوان کیسے بولتے تھے، کس لہجے میں بات کرتے تھے، اس کا مجھے کیا پتہ تھا۔ انگریزی ترجمے میں ان اساتذہ کی کہانیاں، ناول پڑھتے ہیں انہیں بھی پتہ ہے۔ مگر صرف پتہ ہے، شناسائی نہیں ہے اور اب یہاں سے ایک اور خیال نے مجھے ستانا شروع کر دیا۔ عطیہ حسین کو کیا قباحت محسوس ہوئی کہ انہوں نے اس ناول کو اس کی اپنی زبان میں لکھنے سے گریز کیا۔

بات یہ ہے کہ لکھنؤ کے دروازے پر ایک جن بیٹھا ہے۔ جو شخص بھی لکھنؤ میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے یہ جن اس سے نام پوچھتا ہے۔ اس جن کا نام رتن ناتھ سرشار ہے۔ عطیہ حسین نے لکھنؤ میں صدر دروازے سے داخل ہونے کی کوشش کی ہوتی تو پہلے اس جن سے آنکھیں چار کرنی پڑتیں۔ انگریزی کی اوٹ میں وہ اس سے بچ کر نکل گئیں۔

سرشار پر تو لکھنؤ کا کوئی کوچہ بند نہیں تھا۔ اپنے میاں آزاد کی طرح وہ بھی زمین کا گز تھے۔ پورے لکھنؤ کو ناپ ڈالا۔ یہاں ہر قسم کی مخلوق نظر آئے گی۔ ان کے اچھے برے سارے شوق، ہر رنگ کی محفل، سب طرح کے میلے ٹھیلے۔ مگر جب لکھنؤ کی گریجویٹ بیٹیوں کا زمانہ آیا تو کچھ لکھنؤ نے بھی نیا رنگ نکال لیا تھا اور کچھ ان لکھنے والیوں کے دیکھنے کا انداز بھی دوسرا تھا۔ اور پھر لاکھ وہ آزاد ہو گئی ہوں اور پردے سے باہر نکل آئی ہوں مگر باہر نکل کر کہاں تک جا سکتی تھیں۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ تعلقہ دار کی روشن خیال بیٹی اپنی حویلی سے نکلے گی تو یونیورسٹی تک چلی جائے گی۔ اس ناول کا مرکزی کردار لیلیٰ ہے جسے عطیہ حسین کا ہمزاد سمجھنا چاہیے۔ وہ اپنی قدامت پسند پھپھیوں کی طرح حویلی کی چار دیواری میں مقید نہیں ہے۔ باہر کی دنیا سے بھی اس کا رابطہ ہے۔ مگر یہ باہر کی دنیا گھر سے کالج تک کی دنیا ہے۔ سرشار والا وسیع و عریض لکھنؤ اپنی متنوع مخلوق، اپنے رنگا

رنگ کھیل تماشوں، میلوں ٹھیلوں کے ساتھ اب بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہے۔ وہ لکھنؤ نظر بھی آتا ہے تو سواری پر تنے ہوئے پردے کی جھریوں میں سے۔ مگر وہ تو پرانا لکھنؤ ہے جو نئے لکھنؤ سے پسپا ہو کر پیچھے کھسکتا چلا جا رہا ہے۔ خود تعلقہ دار تہذیب، جس نے نئے لکھنؤ میں حویلیاں کھڑی کر کے اور اپنے بیٹوں بیٹیوں کو کالجوں میں بھیج کر نئے زمانے کے ساتھ چلنے کی کوشش کی تھی، موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ بابا جان کا چل چلاؤ ہے اور آشیانے میں موت کا سا سناٹا طاری ہے۔

بابا جان اپنے بزرگوں کی میراث کے امین ہیں۔ بلکہ لگتا ہے وہ پورے تعلقہ دار طبقے کی آخری قدآور شخصیت ہیں۔ اس طبقے کا سارا وقار، سارا رعب داب ان کی ذات میں سمٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اب ان کا آخری وقت ہے۔ ان کی موت ایک فرد کی موت نہیں ہے۔ وہ کسی بڑی موت کا استعارہ بنتی نظر آتی ہے۔ آشیانے میں تو زندگی کا طور ہی بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے بیٹے حامد نے خاندانی روایت سے پہلے ہی ایک بہت بڑا انحراف کیا تھا کہ سول سروس کا امتحان دے کر افسر بن گئے۔ اب ریٹائر ہو کر آشیانے میں آ کر بیٹھے ہیں اور بابا جان والے رعب داب کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن زمانہ بدل چکا ہے۔ آشیانے میں بغاوت کے آثار ہیں۔ نئی نسل کے تیور سرکشی والے ہیں۔ بیٹے باپ کے رعب سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ سرکشی لیلیٰ نے دکھائی کہ اپنے سرپرست حامد چچا اور اپنی پیاری پھپھیوں کی مرضی کے خلاف ایسے نوجوان سے شادی کر لی جو مرتبے میں اس تعلقہ دار گھرانے سے کمتر تھا۔ بقول عابدہ پھپھی اس لڑکی نے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی اور غیروں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع دے دیا۔

بہر حال آشیانے میں اب بھی امی جمی ہے۔ معززین کی آمد و رفت جاری ہے۔ بیٹوں بیٹیوں کے واسطے سے نئے تعلیم یافتہ اور نئی تہذیب کے ذائقے سے آشنا نوجوان بھی آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی رنگ کی لڑکیاں بھی اس جھمگھٹے میں نظر آئیں گی۔ روز دعوتیں ہوتی ہیں، بحثیں ہوتی ہیں۔ باہر جو تحریکیں چل رہی ہیں ان کی گونج آشیانے میں سنائی دیتی ہے۔ آشیانہ، نئے زمانے میں سانس لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر تاریخ تیزی سے موڑ کاٹتی ہے اور آشیانے کی ساری رونق ساری زندگی تتر بتر ہو جاتی ہے۔ خاندان بکھر جاتا ہے۔ کچھ افراد خاندان پاکستان کے لیے رخت سفر باندھ رہے ہیں، کچھ ہندوستان ہی میں رہنے پر مصر ہیں۔ مگر آشیانے میں وہ بھی اب نہیں رہ پائیں گے۔ یہ حویلی جو خاندان کی عظمت و شوکت کا نشان تھی اور اپنی جگہ ایک تہذیب نظر آتی تھی، اس کا اُجڑنا اب مقدر ہو چکا ہے۔

آخری ابواب میں نقشہ یہ ہے کہ لیلیٰ، جو اس حویلی سے، جب وہ ایک بھرا گھر تھی، واپس نہ آنے کی قسم کھا کر نکلی تھی، اب ایسے وقت میں واپس آئی ہے کہ وہ خالی ڈھنڈار پڑی ہے۔ خالی ڈھنڈار کمروں میں وہ بھٹکتی پھر رہی ہے اور گئے دنوں کو یاد کر رہی ہے۔

ہمارے زمانے میں ایسے لوگ بھی تو ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم وہاں جا کر اب کیا کریں گے۔ وہ لوگ

ہی نہ رہے، خالی درودیوار کھڑے ہیں۔ مگر خالی درودیوار کبھی خالی درودیوار نہیں ہوتے۔ جانے والے بیشک سارا بستر بوریا سمیٹ کر گئے ہوں، پھر بھی بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ اتنا کچھ کہ سارا بستر بوریا، سارا سمیٹا ہوا سازوسامان اس کے سامنے ہیچ نظر آتا ہے۔ لیلیٰ کے دماغ میں کوئی ایسی ہی بات ہوگی تب وہ یہاں آئی ہے۔ ٹامس مان کے ناول Buddenbrooks میں کیا کچھ ہوتا ہے، اب مجھے پوری طرح یاد نہیں۔ مگر ایک منظر حافظے میں اٹکا رہ گیا ہے۔ بڈن بروک گھرانے کی بیٹی زمانے بعد اس عالیشان مکان کے سامنے سے گزرتی ہے جہاں کبھی یہ خاندان شاد آباد تھا۔ وہ ان درودیوار کو دیکھ کر ٹھٹکتی ہے۔ اس کی آنکھ بھر آتی ہے اور وہ تیزی سے وہاں سے گزر جاتی ہے۔ مگر لیلیٰ تو اہتمام کر کے اس بھائیں بھائیں کرتے مکان میں آئی ہے۔ خالی کمروں میں وہ بھٹکتی پھر رہی ہے اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ کمرے خالی نہیں ہیں۔ یہاں سے جانے والے کچھ بھی تو نہیں لے جا سکے۔ بتائی ہوئی ساری گھڑیاں، ساری خوشیاں، سارے غم یہیں چھوڑ گئے ہیں۔ لیلیٰ یہاں انہیں سمیٹنے کے لیے آئی ہے۔ اُن دنوں کی ایک ایک گھڑی، ہر خوشی، ہر غم جوں کا توں موجود ہے، پورا گھر زندگی سے معمور ہے۔ یا پھر یہ عطیہ حسین کا کمال ہے کہ ان کے بیان سے وہ ساری گھڑیاں پھر سے جی اٹھی ہیں۔

اسی عمل میں لیلیٰ اپنے آپ کو پاتی ہے۔ اب دھیرے دھیرے اس پر منکشف ہوا کہ اسد سے اس کا تعلق خاطر، جسے اس نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی، کس طرح کا تھا۔ اور یہ کہ جس سے اس نے محبت کی اور شادی رچائی اس کے مرجانے کے بعد اس کی اپنی زندگی ختم نہیں ہوگئی۔ اسد اسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا یہاں آتا ہے

''ارے! تم اتنی دیر سے اس خالی ڈھنڈار مکان میں کیا کر رہی ہو؟''

''اسد! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اب میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔''

میں نے ابھی سرشار کا ذکر کیا تھا۔ سرشار کے تو پاؤں دھو کر پینے کو جی چاہتا ہے۔ مگر پھر یوں بھی ہے کہ سارا لکھنؤ آخر اس کے کوچوں، بازاروں اور میلوں ٹھیلوں ہی میں تو نہیں تھا۔ ایک پورا لکھنؤ حویلیوں اور محل سراؤں کے اندر بھی تو سانس لے رہا تھا۔ باہر سے تانک جھانک کر کے تو اس لکھنؤ کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ عطیہ حسین نے اندر بیٹھ کر اس لکھنؤ کا دیدار کرایا ہے۔ اور وائٹ ہیڈ نے کتنی خوب بات کہی تھی کہ تعلیم سے محروم ایسی عورتیں، جنہوں نے دنیا دیکھ رکھی ہو، معاشرے کا سب سے بڑھ کر تہذیب یافتہ عنصر ہوتی ہیں۔ ذرا آشیانے کی ان بیبیوں کو دیکھو جو اس حویلی کی اونچی دیواروں کے بیچ بند بیٹھی ہیں۔ ماجدہ پھپھی، عابدہ پھپھی، حکیمن بوا یہ بی بیاں اپنی ذات میں ایک پوری تہذیب سمیٹے بیٹھی ہیں۔ عابدہ پھپھی خاص طور پر کہ اس تہذیب نے جس عورت کو جنم دیا تھا اس کا وہ مثالی نمونہ ہیں۔ باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے مگر لیلیٰ کو غالب کے شعروں کے معنی سمجھاتی ہیں، لکھنؤ کی تہذیب ان کی معلم ہے۔ انہوں نے لیلیٰ کو پالا ہے۔ سمجھ رہی ہیں کہ خاندان کی ساری روایات اور اپنی تہذیب کی ساری اقدار انہوں نے بھتیجی کو گھول کر پلا دی ہیں۔ انہیں کب جا کر احساس ہوا کہ نئی تعلیم نے ان کی تربیت کا سارا رنگ کاٹ دیا۔

ناول نگار کا جھکاؤ نئی تعلیم کے زیور سے آراستہ لیلیٰ کی طرف ہے۔ مگر اس ناول کے توانا کردار وہ عورتیں ہیں جنہیں نئی تعلیم کی ہوا نہیں لگی، جن کی تربیت خاندانی روایات اور لکھنوی کلچر کے سائے میں ہوئی ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر یہاں نسوانی کردار مردانہ کرداروں سے زیادہ جیتے جاگتے، زیادہ جاندار نظر آتے ہیں، جیسے تہذیب اور روایات کی امانت مردوں سے بڑھ کر ان عورتوں نے سنبھال رکھی ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس گھرانے کی جو بیٹی روایت سے بغاوت کرتی ہے اور اس بنا پر پورے خاندان کا عذاب سہتی ہے، آخر میں وہی اس روایت کے سوگ کا فریضہ انجام دیتی نظر آتی ہے۔ روایتی لڑکی تو زہرا تھی۔ روایت کے پاسبان بزرگوں کو اس نے شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ مگر آخر میں یہ کھلتا ہے کہ وہ روایت کے شعور سے بیگانہ ہے۔ روایت کا شعور تو لیلیٰ کے پاس ہے۔ گویا عابدہ پھپھی خواہ مخواہ لیلیٰ سے ناراض ہوئیں۔ ان کی تربیت ضائع نہیں گئی۔ روایت کے ورثے کو بالآخر ان کی باغی بھتیجی ہی نے سنبھالا۔ بغاوت بھی شاید اس سفر کا ایک مرحلہ تھی۔ لیلیٰ روایت کی نفی کر کے روایت کے اثبات تک پہنچتی ہے اور اس کا سوگ منانے کے لیے اکیلی رہ جاتی ہے۔ مگر یہ کس طرح کا سوگ ہے۔ جب بابا جان مرے تھے تو سوگ منانے کے لیے پورا خاندان اپنے سارے کھڑاگ کے ساتھ اکٹھا ہو گیا تھا۔ اب یہ کیسی موت ہے کہ سوگ منانے کے لیے اکیلی لیلیٰ رہ گئی ہے۔ گویا اصل موت اب ہوئی ہے۔

یہ موت تہہ در تہہ ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ موت ایک استعارہ بن کر پھیلتی چلی جاتی ہے اور بیک وقت کئی موتوں کا بیان بن جاتی ہے۔ ابتدائی سطح پر یہ ایک باوقار عالی مرتبہ خاندان کے ٹوٹنے بکھرنے کی کہانی ہے۔ یہ ایک تعلقہ دار خاندان ہے۔ اس اعتبار سے اسے تعلقہ دار طبقے کے انجام کی داستان کہہ لیجیے۔ مگر ٹوٹنے بکھرنے کی یہ کہانی اسی سطح تک محدود نہیں رہتی۔ پوری لکھنوی تہذیب کے ٹوٹنے بکھرنے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر اس سطح سے بھی آگے نکل کر وہ پوری ہند اسلامی تہذیب کے ٹوٹنے بکھرنے کا استعارہ بنتی نظر آتی ہے۔ جیسے ایک تاریخ اپنے انجام کو پہنچ رہی ہو، جس کا آخری ورق کہ لکھنے سے رہ گیا تھا، لکھا جا رہا ہو۔

تو جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا مجھے یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ تہذیب کے ٹوٹنے بکھرنے کی یہ کہانی اس تہذیب کی اپنی زبان میں کیوں نہیں ہے۔ آؤ اسے اس زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے یہ بات کہی اور مسعود اشعر نے فوراً اچک لی۔ ادارۂ سنگِ میل اسے چھاپنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے اس محنت کو سارجانا اور ترجمہ چھاپ ڈالا۔ مگر خالی محنت سے کیا ہوتا ہے۔ اس تہذیب میں زبان، بیان اور لہجے کی جو نزاکتیں اور لطافتیں تھیں بکھر گئیں۔ اب کوئی دوسرا انیس تو پیدا ہونے سے رہا۔ نہ سرشار دوسرا آئے گا، نہ مرزا ہادی رسوا۔ تو بس اس ناول کو اردو میں پڑھنے کے لیے میری ٹوٹی پھوٹی زبان ہی پر گذارہ کیجیے۔

انتظار حسین

پہلا حصّہ

پہلا باب

جس روز عابدہ پھپھی زنان خانے سے اُٹھ کر بابا جان کے کمرے کے پاس والے مہمان خانے میں منتقل ہوئی تھیں اُسی روز ہمارا ماتھا ٹھنک گیا تھا کہ بابا جان کا اب چل چلاؤ ہے۔

بابا جان تین مہینے سے بیمار پڑے تھے۔ گھر کا نقشہ درہم برہم تھا۔ ساری فضا اس بیماری کے اثر میں تھی۔ گھر والوں کو سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر آنے والا دن پچھلے دن سے بڑھ کر بھاری پڑتا تھا۔

عابدہ پھپھی کو تو پریشانی سے چپ لگ گئی تھی۔ اور ساجدہ پھپھی کا حال یہ تھا کہ رو رہی ہیں اور دعا مانگ رہی ہیں۔ گھر کی نوکرانیوں کی بھی چیخ و پکار اب کم ہی سنائی دیتی تھی۔ اب تو وہ ٹھم ٹھونک کر لڑتی بھی نہیں تھیں۔ اور ملازموں کی آوازیں بھی اب اتنی اونچی نہیں ہوتی تھیں کہ دیوار سے پرے سنی جائیں۔ مالی، دھوبی، بہتر اب پینے پلانے کا شغل زیادہ نہیں کرتے تھے۔ نہ ڈھول ڈھمکا نہ گانا بجانا۔ مہمان جو آتے تھے اس طرح بولتے باتیں کرتے تھے جیسے برابر کے کمرے میں کوئی سو رہا ہے اور ان کی آواز سن کر جاگ نہ پڑے۔ میرا اور زہرا کا یہ حال تھا کہ اپنا آپ ایک بوجھ معلوم ہوتا تھا۔ ایک تذبذب کا عالم تھا اور ڈر سا لگا رہتا تھا۔

میں نے اب پہلے سے زیادہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اب بابا جان کی لائبریری میں آنے جانے پر بھی تو کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ حکیمن بوا جنہوں نے مجھے پالا پوسا تھا پہلے تو پیار سے کہا کرتی تھیں کہ "اے بٹیا! تم تو ایسی کتاب کا کیڑا بنی ہو کہ ساری شرارتیں بھی بھول گئیں۔" لیکن اب وہ سرزنش کرنے پر اتر آئی تھیں کہ "یہ تمہاری کتابیں تمہیں چاٹ جائیں گی۔ میری چندا شہزادی، یہ جو تمہاری تارا سی آنکھیں ہیں ان کی ساری روشنی ماند پڑ جائے گی۔ عینک لگا کے بالکل اُلو لگو گی۔ پھر کون تم سے بیاہ کرے گا۔ آخر زہرا بھی تو ہے۔ تمہارے ابا جان اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے انہیں کی بھیتجی تو بچی ہے۔ لیکن وہ تو تمہاری طرح کی نہیں ہے۔ بٹیا ان کتابوں سے ذرا سر اٹھا کے دنیا کو دیکھو۔ کلام پاک پڑھو، اللہ رسول کا نام لو۔ پھر دیکھو بی بیاں تم پہ کیسی ٹوٹ کے پڑتی ہیں۔ ہر ایک چاہے گی کہ تمہیں اپنی بہو بنا لے۔"

زہرا روز پابندی سے پنج وقتہ نماز پڑھتی تھی۔ روز صبح کو قرآن کی تلاوت کرتی تھی۔ پھر سینا پرونا اور حساب لکھنا۔ لیکن اب اس کے اس سارے وظیفے میں کھنڈت پڑ گئی تھی۔ اب تو وہ دالانوں میں، صحن میں بولائی بولائی پھرتی تھی، بے مقصد، بے مطلب۔ ہر پھر کے میرے پاس آن بیٹھتی تھی۔ ویسے تو ہم میں کوئی

بات مشترک نہیں تھی۔ ہاں خون کا رشتہ تھا۔ یا پھر وسوسوں اور اندیشوں کا رشتہ تھا جو ہم دونوں کے یہاں ایک جیسے تھے۔

ہر پھر کے ایک ہی بات پر آ کر اس کی باتوں کی تان ٹوٹتی تھی۔

''کیا خیال ہے تمہارا؟ ان کے مرنے کے بعد کیا ہوگا۔''

''مجھے کیا پتہ کہ کیا ہوگا۔''

پھر بات کو تھوڑا سا بدل کر پوچھتی ''تمہارا کیا خیال ہے حامد ماموں ریٹائرمنٹ لے لیں گے اور یہاں آ کر رہیں گے؟''

''مجھے اس کا کیا پتہ ہے۔''

''کیا خیال ہے تمہارا، وہ ہمیں یہاں رہنے دیں گے؟''

''کیوں نہیں رہنے دیں گے۔''

''بھئی ان کے تو بہت انگریزی قسم کے خیالات ہیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے تم کالج میں پڑھو گی؟''

''کیوں نہیں؟''

''تمہیں کیا پتہ ہے کہ بابا جان کے انتقال کے بعد کیا حالات ہوں گے۔''

''تمہیں پتہ ہے کہ کیا حالات ہوں گے؟ کس کو پتہ ہے کہ کیا حالات ہوں گے۔''

دوسرا باب

اُس روز میری پندرہویں سالگرہ تھی۔ خیر اور کسی کو تو اس سے غرض نہیں تھی، بس اپنی سالگرہ مجھے ہی یاد آئی تھی۔ ہاں جب سکول میں تھی تو میری استانیوں کو فارم بھرتے ہوئے میرے یوم پیدائش کا خیال آتا تھا۔ یا پھر سیتا کو یہ خیال آتا تھا۔ وہی تو ایک میری پیاری سہیلی تھی۔ آج میں اس کی کمی کو بہت محسوس کر رہی تھی۔ وہ چھٹیوں میں باہر گئی ہوئی تھی۔ مجھے اس پہ بہت رشک آتا تھا کہ اس کے تو ابا جان بھی ہیں، امی بھی ہیں اور خیر سے ایک بھائی۔۔۔۔۔

گھر میں جب بھی سالگرہ کا ذکر کرتی تو عابدہ پھپھی جنہوں نے مجھے پال پوس کے بڑا کیا تھا، کہتیں "ارے تمہاری سالگرہ ہے! کتنی بڑی ہو گئیں تم! واقعی! برس کتنی جلدی جلدی گزرتے ہیں۔ تو اب تم بچی نہیں ہو۔" اور حکیمن بوا کہتیں "میری آنکھوں کا تارا، اچھا ذرا یاد کراؤں کہ تم کب پیدا ہوئی تھیں۔ عابدہ بٹیا! یہ اُسی برس کی بات ہے جب تم گری تھیں اور تمہارا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ اس برس رَو آئی تھی۔ ایسی رَو آئی کہ ندیاں امنڈ پڑیں۔ جل تھل ہو گئے۔ سڑک پار والے کھیتوں میں بھی پانی آ گیا تھا۔ اور احمد میاں اس کے ابا، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، کشتی میں بیٹھ کر کچہری گئے تھے۔ کتنے خوش تھے۔ آنے والے وقت کی انہیں کیا خبر تھی۔ ہاں تو وہ برس تھا جب رَو آئی تھی۔"

پندرہ۔۔۔۔۔ سالوں کا سلسلہ جیسے دالان در دالان ہوں۔ کہیں پیچھے سے چلے آ رہے ہوں اور آگے جانے کہاں تک ان کا سلسلہ جائے۔ پندرہ۔۔۔۔۔ مگر نہ کوئی شکل نہ صورت، نہ تن پہ بوٹی، اور قد بھی تو نہیں بڑھا۔ اس لمبے آئینے میں پچھلے سال قد ناپ کر جو نشان بنایا تھا اب بھی بس اتنا ہی ہے۔۔۔۔۔

آئینے میں روشنی جھلملائی، کھٹ سے دروازہ کھلا۔ میں شپٹا کر زہرا کی طرف مڑی۔ خیر اس نے دیکھا نہیں تھا کہ میں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ اپنی ہی کوئی بےقراری لے کر آئی تھی جو اس کی آنکھوں سے چھلکی پڑ رہی تھی اور جس سے اس کی چال ڈھال میں تیزی آ گئی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی، اک ذرا ترچھی ترچھی، تھوڑی ابلی ابلی۔ کاجل نے انہیں اور چمکا دیا تھا۔ ان کی وجہ سے اس کی ناک پر تو نظر ہی جنہیں جاتی تھی جو بس یونہی سی تھی۔ اور نہ اس کے ندیدے دہانے پر۔ آنکھوں نے سب کچھ چھپا لیا تھا۔ انہی سے وہ اپنی طرف متوجہ کرنے اور اپنے لیے ایک نرم گوشہ پیدا کرنے کا کام لیتی تھی۔ میرے خیال میں وہ تھوڑی بھینگی

بھی تھی۔ ہونا بھی چاہیے تھا کہ وہ ہر چیز کو اپنے حوالے سے دیکھتی تھی۔

''امی نے صبح بابامیاں کو بلوایا تھا۔ وہ آئے ہوئے ہیں۔ محسن ماموں بھی ہیں۔'' گرمجوشی سے کہنے لگی اور اپنے اس مخصوص لہجے میں جس میں تاک کا بھی کچھ عمل دخل تھا۔

''اس میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ محسن چچا تو ہمیشہ ہی یہاں وہاں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور اگر بابامیاں کو بلوایا گیا تو اس میں بھی کون سی عجیب بات ہے بلوانے ہی سے آسکتے تھے۔ ویسے تو وہ اپنے چکر میں ایسے جتار ہتے ہیں کہ شاید انہیں یہ بھی یاد نہ رہتا ہو کہ ان کا بھائی آخری دموں پہ ہے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' زہرا نے بے ساختہ کہا اور پھر اپنے لہجے میں بولی ''اصل میں تو وہ میرے لیے بات کرنے آئے ہیں اور وہ جلد ہی ہمارے لیے بلاوا بھیجیں گے۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''میں امی سے کچھ پوچھنے کے لیے جارہی تھی'' اس نے بن کر ایسے کہا جیسے اسے کسی خوشگوار راز میں اپنا شریک بنارہی ہو۔ ''بس میں نے چلتے چلتے سن لیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر مجھے سنائی دیا کہ امی حکیمن بوا سے ہمیں بلانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ حکیمن بوا بھی اللہ توبہ بہت ہی سست ہیں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

زہرا! حکیمن بوا کے کالے کلوٹے تن و توش کو دیکھ کر محظوظ ہوتی تھی، مگر مجھے تو وہ تن محبت و شفقت کا پیکر نظر آتا تھا۔

''لیلیٰ بٹیا! زہرا بٹیا'' حکیمن بوا دالان سے اونچی آواز میں ایسے پکار رہی تھیں جیسے بہت ضروری کام ہے۔

''لو وہ آگئیں۔'' زہرا اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے بولی ''تمہیں جتانا یہ ہے کہ میں بہت دیر سے یہاں بیٹھی ہوں۔'' پھر اس نے پکار کر کہا ''حکیمن بوا کیا بات ہے؟ ہم یہاں ہیں۔''

حکیمن بوا بڑبڑاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی تھل تھل کرتی آئیں ''اے توبہ! اس گھر میں تو کوسوں کے حساب سے چلنا پڑتا ہے۔ میری ٹانگوں میں جیسے کسی نے سیسہ بھر دیا ہو۔ اور جیسے جوڑ جوڑ میں سوئیاں کبھی ہوئی ہوں'' اور اسی ایک سانس میں لہجہ بدل کر پیار بھرے انداز میں سرزنش پر اتر آئیں ''بی بی، اس کتاب کو دفع کرو۔ یہ جو کاغذ پہ کیڑے مکوڑے بکھرے ہوئے ہیں یہ تمہاری آنکھوں کو چاٹ لیں گے۔ اٹھو، جلدی کرو۔ عابدہ بٹیا تم دونوں کو بلا رہی ہیں۔''

''اے بوا!'' میں حکیمن بوا کے گلے لگ کر کہنے لگی ''یہ کتابیں تو میرے گلے میں سونے کا ہار بن کے لٹکیں گی۔''

میں کمرے سے زہرا کے ساتھ نکلی تھی لیکن آہستہ چلتے ہوئے پیچھے ہوگئی۔ آخر میں حکیمن بوا کو پیچھے چھوڑ کر تو نہیں جاسکتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے گھیردار غرارے کے پائنچے تھام کر سٹ پٹ چپل رہی

تھیں۔ میں نے اپنے سکول والے کالے موزے جو اتار پھینکے تھے وہ انہوں نے پہن رکھے تھے۔ ان موزوں پر چاندی کے چھانجھن بہت بے تکے لگ رہے تھے۔

ہم چل کر اس ڈرائنگ روم میں پہنچے جو مکان کے دو حصوں کو ملاتا تھا۔ اب میں زہرا کے قریب آ گئی۔ اس وسیع و کشادہ کمرے میں محرابی دروازوں کے رنگ برنگ شیشوں سے روشنی تو چھن کر نہیں آ رہی تھی، البتہ سائے چھن کر آ رہے تھے کہ دیواروں اور مینٹل پیس میں جڑے آئینوں میں اپنا عکس ڈالتے، میزوں کرسیوں دیوانوں پر حرکت کرتے نظر آتے، مرمریں مجسموں کے پیچھے گم ہو جاتے۔ پھر چینی کے بڑے بڑے گلدانوں پر تھرکتے دکھائی دیتے، اور پھر قالینوں میں چھپ جاتے۔ سنگِ مرمر کے فرش پر قدموں کی آہٹ بلند سنائی دیتی اور اس طرح گونجتی کہ بلند و بالا سنہری چھت کو چھو کر سرگوشی کی شکل اختیار کر لیتی۔ اس ایوان میں جو اس حویلی کا سب سے پرانا گوشہ تھا، میں نے ایک عجب طرح کی موسیقی کی تانیں سنی تھیں۔ کچھ مبہم سی تانیں جیسے کسی پرسکون رات کے سکوت میں گھلی ہوئی ہوں، کچھ اس رنگ سے جیسے ہوا میں مہک بسی ہوئی ہے۔ میں نے تو یہاں چھانجھنوں گھنگھروؤں کی جھنکاریں بھی سن رکھی تھیں۔

لیکن کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

باہر دالان میں دھوپ تھی، اور یہ دھوپ مجر نقشوں والی اس دیوار تک پھیلی ہوئی تھی، جو زنان خانے کی آخری حد تھی۔ یہ زنان خانہ اپنی چار دیواری کے اندر اپنی جگہ ایک دنیا تھا۔ اس کے اپنے صحن، اپنے لان، اپنے برآمدوں والے کمرے تھے تو مجر نقشوں والی دیوار اس کی آخری حد تھی۔ اس سے آگے مردانہ تھا۔

مہمان خانے کے دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردے کے ادھر سے آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی بحث چھڑی ہوئی ہو۔ میرے چچا دادا موسی کی بوڑھی پھونس کانپتی ہوئی آواز۔ مگر وہ آواز تو جیسے محسن چچا کی اکڑفوں آواز سے دبی جا رہی ہو۔ محسن چچا سے ہمارا کیا رشتہ تھا، یہ یاد رکھنا میرے لیے تو بہت مشکل تھا۔ وہ ہمارے دادا ابا کے ابا جان کی بہن کی بیٹی کے بیٹے تھے۔ اس رشتے کو یاد رکھنا کتنا مشکل تھا۔ اسی پہ تو وہ مجھ سے بہت تپتے تھے۔ طعنہ دیا کرتے تھے کہ بی بی اگر اتنا قریبی رشتہ بھی تمہیں یاد نہیں رہتا تو پھر تو ضرور تم نروان حاصل کر لو گی اور اتنی انگریز بن جاؤ گی کہ خالہ پھپھیاں اور چچیرے ممیرے بھی تمہیں غیر نظر آئیں گے۔

جیسے ہی ہم داخل ہوئے خاموشی چھا گئی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر آداب کیا تو محسن چچا نے بازو پھیلا دیئے۔ مگر میں ان سے کترا کر بابا میاں کے پاس چلی گئی۔ انہوں نے آہستہ سے میری پیشانی کو چوما اور دعا دی کہ ”اللہ اپنی حفظ و امان میں رکھے! لمبی عمر پاؤ!“ پھر انہوں نے بڑے سے سفید گاؤ تکیے پر کمر لگا کر آنکھیں موند لیں اور تسبیح پھیرنے لگے۔ پھر جب کوئی بات بھی کی تو آنکھیں زیادہ تر اسی طرح بند رہیں۔ بات کرتے ہوئے تھوڑا جھوم جاتے تھے اور بھنویں سکڑ جاتی تھیں۔ کبھی کبھی تو خاموشی کے عالم میں بھی ان کے ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آتے۔ وہ ہلتے ہوئے لب، وہ جھریوں بھرا چہرہ، اس کے گرد کانوں کے آس پاس سفید بال اور اک

ذرا ا بھی بکھری داڑھی جو لٹک کر پتلی ہوتے ہوئے سینے سے جا لگی تھی۔ بھورے رنگ کے کرتے پر روئی بھری موٹی سی کالی صدری پہن رکھی تھی۔ پائجامہ چست، فلالین والا، گھٹنوں پر سلوٹیں پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ نماز میں دیر تک دوزانو بیٹھنے کی وجہ سے سلوٹیں تو پڑنی ہی تھیں۔

میں عابدہ پھپھی کے برابر ان کے بستر پہ جا بیٹھی۔ وہ ایسے بیٹھی تھیں کہ ایک گھٹنا اٹھا ہوا تھا اور اس پہ ٹھوڑی ٹکی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ اس طرح ایک دوسرے سے پیوست تھے کہ انگلیوں کے جوڑ سفید سفید نظر آ رہے تھے۔ ہلکا زرد دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے اثر سے وہ ہونق پیلا ہلدی چہرہ کچھ زیادہ ہی پیلا نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں پریشان اور جیسے پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں۔

محسن چچا کے کھلے بازوؤں کو زہرا نے البتہ پذیرائی بخشی۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا کر اس کے رخساروں کو بوسہ دیا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی" ہائے اللہ آپ نے تو پوری طرح شیو بھی نہیں کیا ہے۔"

انہوں نے قہقہہ لگایا۔ لگتا تھا کہ قہقہہ ان کی چربی چڑھی گول گول توند کے کہیں بہت اندر سے بل کھاتا ہوا نکلا ہے۔ اور آنکھیں کیسی بڑی بڑی تھیں۔ ان میں سرخی جھلک رہی تھی۔ ان کی کرسی اس زاویے سے تھی کہ سب ان کے روبرو تھے۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھی ہوئی اور پھیلی ہوئی۔ نفیس قسم کے سفید لٹھے کا چست پائجامہ پنڈلیوں پر کسا کسا، ٹخنوں ٹخنوں کے پاس جا کر تھوڑا ڈھیلا ہو گیا تھا اور بہت سی چنٹیں پڑ گئیں تھیں۔ سیون بتا رہی تھی کہ بڑی نفاست سے سلائی ہوئی ہے۔ بات کرتے ہوئے ایک ٹانگ ہلاتے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی اور اس تیزی سے ہلاتے تھے کہ سنہری کام والی کالی مخملی جوتی سے پاؤں نکل نکل جاتا تھا۔

ماجدہ پھپھی ایسے بیٹھی تھیں جیسے بھوری شال میں لپٹی بڑی سی ڈھیلی ڈھالی پوٹلی رکھی ہو۔ بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں اور گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھیں۔ ناک کچھ لال لال لگ رہی تھی اور آنکھیں ایسی جیسے ابھی آنسو پونچھے ہیں۔ چوڑی پیشانی تو پرسکون ہی دکھائی دے رہی تھی لیکن ہونٹ کپکپا رہے تھے اور جیسے سہمے ہوئے ہوں۔ گال بھی ڈھلکے ڈھلکے نظر آ رہے تھے۔

زہرا اپنی اماں کے پاس جا کر تخت پہ بیٹھ گئی۔ تخت پہ چاندنی بچھی تھی اور چاروں کونوں پر لکڑی کے بنے ہوئے منقش گجر ڈول رکھے تھے۔ زہرا نے ایک گجر ڈول سے کھیلنا شروع کر دیا۔

"تو اب تمہاری یہ فضول خواہش پوری ہو گئی" محسن چچا کہنے لگے "خیر لڑکیاں بھی اب یہاں موجود ہیں۔ تو اب تمہاری اجازت ہو تو گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کیا جائے؟" ان کی آواز میں کچھ اس قسم کی کیفیت تھی جیسے کوئی حلیم الطبع شخص آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر اپنے آپ پہ ہنس رہا ہو۔"

اس پر عابدہ پھپھی روکھے پن سے بولیں کہ "بڑوں کے ہوتے ہوئے میری کیا حیثیت ہے کہ مجھ سے اجازت لی جائے۔ لیکن ہاں یہ ضرور ہے محسن بھائی کہ فضول کا مطلب آپ جو سمجھتے ہیں اس طرح شاید میں نہ سمجھتی ہوں۔"

''بیشک! بیشک! جو بی بی اپنے وقت کی علامہ ہو، جس نے فارسی شاعری اور عربی دینیات گھول کے پی رکھی ہو اور جو ماشاء اللہ جدید خیالات سے واقف ہو، اس کے سوچنے کے انداز کو یہ حقیر فقیر کیسے سمجھ سکتا ہے۔'' محسن چچا کے لہجے میں طنز کے تیز نشتر چھپے ہوئے تھے۔ اور عابدہ پھپھی جیسے تڑپ کر رہ گئی ہوں۔

خاندان کے مردوں میں ایک محسن چچا تھے جو زنان خانے میں اس بے تکلفی سے آتے تھے اور آئے دن دھرے رہتے تھے۔ اور میرے دل میں یہ دیکھ کر بہت گدگدی پیدا ہوتی تھی کہ عابدہ پھپھی کو یوں ان سے کوئی کد نہیں تھی لیکن وہ انہیں کچھ زیادہ خاطر میں بھی نہیں لاتی تھیں۔ زہرا یہاں بھی اپنی فطرت سے باز نہیں آئی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح یہ کھوج لگا لیا کہ محسن چچا نے جوانی کے بھلے دنوں میں بہت چاہا تھا کہ عابدہ پھپھی سے ان کی شادی ہو جائے۔

''محسن بھائی!'' ماجدہ پھپھی بولیں ''میں پوچھوں ہوں کہ آخر آپ اتنے برہم کیوں ہو رہے ہیں۔ میرا تو بخت مارا سر دکھنے لگا۔ سوچ سوچ کے اور پکنے لگے گا۔''

ماجدہ پھپھی کا سر تو ہمیشہ دکھتا رہتا تھا۔ ویسے بھی سوچنا تو ہے ہی دکھ دینے والا کام ہے۔

''یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم!'' بابا میاں نے لمبا سانس بھرا، اور پھر اسی عالم میں کہ آنکھیں موندی ہوئی تھیں نرمی سے بولے ''میں نے اپنی لمبی عمر میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ اس قادر مطلق کے سوا کسی کو پتہ نہیں ہے کہ کس چیز کی کیا حقیقت ہے۔ وہ ہم سے غلطیاں کراتا ہے۔ کیوں؟ تاکہ ہمارے غرور کا سر نیچا ہو۔ انہی غلطیوں سے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہی بخشش دینے والا بھی ہے۔ صرف ایک موت ہے جو اٹل ہے۔''

گھڑی بھر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ بابا میاں کتنے بوڑھے ہو گئے تھے۔ بالکل پھونس۔ شاید موت بھی ان کا تعاقب کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ اس نے انہیں ان کے حال پہ چھوڑا اور بابا جان کے سر پہ منڈلانے لگی۔ زور شور سے بھرا ان کا بڑھاپا موت کے لیے واقعی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔

میں سخت سٹپٹائی ہوئی تھی۔ میں نے زہرا کی طرف دیکھا، یہ سوچ کر کہ اپنی گھبراہٹ میں اسے بھی اپنا شریک بنالوں۔ مگر اس نے تو مجھ سے نظریں ہی نہیں ملائیں۔ بڑے سکون سے بیٹھی تھی۔ نظریں جھکی ہوئی۔ لگتا تھا کہ دل میں کوئی راز چھپائے بیٹھی ہے۔

محسن چچا اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے۔ ان کی چاندی کی موٹھ والی چھڑی قالین سے کھیل رہی تھی۔

''جن باتوں کا کوئی مقصد نہ ہو میں انہیں فضول سمجھتا ہوں۔'' کچھ اس انداز سے انہوں نے بات شروع کی جیسے بابا میاں نے تو کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ ''آخر کیا لڑکی اپنے بڑوں پر اپنا فیصلہ صادر کرے گی یا ان کے انتخاب میں مین میخ نکالے گی، یا ان کی اہلیت کے بارے میں اپنے شک کا اظہار کرے گی؟ اچھا تو پھر کیا اپنا بر آپ انتخاب کرے گی؟''

عابدہ پھپھی نے جواب دینے کے لیے زبان کھولی تو ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ کہنے لگیں ''نہیں محسن بھائی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اور مجھ میں تو نہ ہمت ہے نہ ایسا کوئی خیال میرے دل میں ہے۔ میں آج کل کے زمانے کی تو نہیں ہوں، لیکن میں آخر اسی نئی نسل کے ساتھ رہتی ہوں۔ اس گھر کی دیواریں خیر سے بہت اونچی ہیں، مگر اس چار دیواری کے اندر کوئی قبرستان نہیں ہے۔ لڑکی اپنا بر آپ پسند کرے، ایسا کاہے کو ہونے لگا ہے۔ اس بیچاری کو یہ موقع کہاں میسر ہے۔ اور نہ اس کی تربیت اس طرح کی ہے۔۔۔۔''

محسن چچا بات کاٹتے ہوئے بولے ''تو تم کیا چاہتی تھیں کہ ایسا ہوتا؟''

''لیکن۔۔۔۔'' عابدہ پھپھی نے محسن چچا کی بات سنی اَن سنی کر دی ''لیکن ہماری پسند ناپسند کے موقع پر اسے موجود تو ہونا چاہیے۔ اسے سننا چاہیے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ رشتے کو پسند کیا ہے تو کیوں کیا ہے تاکہ بعد میں اسے یہ خیال نہ ہو کہ ہم نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ میں ہاتھ تھما دیا ہے۔ کم از کم اتنا تو ہم کر ہی سکتے ہیں۔''

یہ آخری فقرہ انہوں نے کچھ تلخ سے لہجے میں کہا۔

''موجود نہ بھی ہو تو کیا حرج ہے۔ آخر ہم اس کے پیچھے اس کے خلاف کوئی سازش تو نہیں کریں گے۔ ہمارے بڑوں نے تو ہمارے بارے میں فیصلہ کرتے وقت ہماری موجودگی کو ضروری نہیں سمجھا تھا، اور ہم نے ان کی سمجھ بوجھ پر اعتبار کیا تھا۔ وہی طریقہ مناسب تھا، ان کے حساب سے بھی اور ہمارے حساب سے بھی۔'' محسن چچا کے لہجے میں غصہ جھلک رہا تھا۔

''کیا واقعی وہ طریقہ مناسب تھا؟'' عابدہ پھپھی نے اسی غصے سے جواب دیا۔

محسن چچا کی آنکھوں میں غصے کی چنگاری چمک کر فوراً ہی ماند پڑ گئی۔ اس ایک ساعت میں ان کی زندگی کی ساری ناکامی سمٹ آئی تھی۔ ہم چھوٹے تھے مگر ان کے اور شہر کے ناچنے گانے والیوں کے قصوں کا تو ہمیں بھی پتہ تھا۔ ان کے چار بچوں میں جو سب سے بڑی لڑکی تھی وہ تو ہماری ہی عمر کی تھی۔ جس باپ کی صورت بھی اسے کم کم ہی نظر آتی تھی اس کی تابعدار وہ بہر حال تھی، خوشی سے یا ناخوشی سے، لیکن ماں کی وجہ سے اس سے نفرت بھی کرتی تھی۔ ماں بیچاری کا تو بیماری نے حال پتلا کر رکھا تھا۔ اس کی ملی دلی خوبصورتی جیسے محبت کی بھیک مانگ رہی ہو۔ شوہر سے تو بس اتنا ہی تعلق تھا کہ کبھی بھولے بھٹکے گھر میں رات گزاری تو اس خوشی میں پیٹ میں بچہ رہ گیا۔ زندگی کا طور یہ تھا کہ ہر وقت دوستوں کے جمگھٹے۔ اور ماشاءاللہ دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ بہت بنے ٹھنے رہتے تھے۔ شعر گوئی کا چسکا تھا اور کلاسیکی موسیقی اور رقص کے علم میں تو پیرے ہوئے تھے۔ کام کاج کے قائل ہی نہیں تھے۔ مجھے تو وہ زہروں برے لگتے تھے۔

دو ایک ایک کے چہرے کو دیکھ رہے تھے کہ ان کی باتوں کا کس پہ کیا اثر ہوا۔ مگر بابا میاں تو خاموشی

سے تسبیح پھیر رہے تھے۔ ماجدہ پھپھی چھالیا کتر رہی تھیں اور سوں سوں کرتی جاتی تھیں۔

''دیکھو عابدہ!'' تحکم سے بولے، اگرچہ ان کے لہجے میں اب وہ کڑک نہیں تھی'' میں یہاں تم سے بحث کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ میں تو پیغام لے کر آیا ہوں۔ اب تمہاری مرضی ہے، قبول کرلو یا انکار کردو۔ لیکن چاہتا میں یہ ہوں کہ اقرار ہو یا انکار ہو مجھے جواب مل جانا چاہیے اور جلدی ملنا چاہیے۔ باباجان کی جو حالت ہے وہ تو ظاہر ہے۔ ہمیں ان لڑکیوں کے مستقبل کی فکر کرنی چاہیے۔ خدانخواستہ آج اگر باباجان کی آنکھ بند ہو جائے تو ان کا کیا بنے گا۔''

''ان کا کیا بنے گا۔ اور ہم؟ ہمارا کیا بنے گا؟'' ماجدہ پھپھی نے ٹسر ٹسر رونا شروع کر دیا'' میں رانڈ دُکھیا۔ اور یہ میری بٹیا۔ بے باپ کی بچی۔ ہم کس در پہ جائیں گے۔ اور غریب عابدہ کو دیکھو۔ یہ عمر ہو گئی اور ہاتھ ہی پیلے نہ ہوئے۔ ابا کو کوئی لڑکا ہی اس کے لائق نظر نہ آیا۔ جو رشتہ آتا انکار کر دیتے۔ وہ تو سدھار جائیں گے، یہ غریب اکیلی رہ جائے گی۔ ان کا کیا بنے گا۔ اور ہمارا کیا بنے گا۔'' وہ سسکیوں سے رونے لگیں۔ زہرا نے بھی ان سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔

عابدہ پھپھی نے کانپتے ہاتھوں سے دوپٹے کا آنچل سر پہ لیا اور بہن سے تھکے تھکے لہجے میں بولیں

''آپا بی، ذرا آہستہ، باباجان سو رہے ہیں۔''

میں اندر سے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

ماجدہ پھپھی نے شال کے آنچل سے آنسو پونچھے، پھر ناک پونچھی، پھر رقت بھرے لہجے میں کہنے لگیں۔'' میں مصیبت ماری تو پھوٹے نصیب لے کے پیدا ہوئی تھی۔''

''یا رحمن، یا رحیم'' بابامیاں بڑبڑائے۔

محسن چچا ایک بے کلی کے ساتھ کھنکھارے، اپنی چاندی کی موٹھ والی چھڑی کو گھمایا پھرایا، پھر بولے'' اب آئندہ کے بارے میں سوچو۔ زہرا ماشاءاللہ اب سترہ کے سن میں ہے۔ شادی کی یہی عمر ہوتی ہے۔ میں پیغام لے کے آیا ہوں۔ تمہیں اب کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔ آخر تم اور کس سے مشورہ کرو گی۔ باپ تمہارے بستر مرگ پر ہیں۔ بھائی تمہارے یہاں ہیں نہیں۔ لے دے کے بابامیاں اور میں ہی۔۔۔۔۔''

ماجدہ پھپھی نے بات کاٹتے ہوئے کہا'' حامد میاں بس آنے ہی والے ہیں۔''

''ان کے آنے سے کیا فرق پڑے گا۔ وہ میاں تو انگریزوں سے بڑھ کر انگریز ہیں۔ وہ اپنے سر کوئی ذمہ داری نہیں لیں گے۔''

ماجدہ پھپھی بھی اپنی بات پہ اڑی رہیں'' لیکن ان کی رائے تو لینی ہی ہے۔ ان کے مشورے کے بغیر ہاں کر دی جائے، یہ تو کوئی مناسب بات نہیں ہے۔''

''ہاں ان سے رائے تو لی ہی جائے گی۔ ان کی نخوت کو ٹھیس تو نہیں لگنی چاہیے۔ لیکن بات پہلے طے

ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ یہ موقع گنوا دیا تو ذرا سوچو کہ زہرا کو تم کب تک گھٹنے سے لگائے بیٹھی رہو گی۔ پھر یہ بھی پتہ نہیں کہ آئندہ تمہارے حالات کیسے رہیں گے۔''

ماجدہ پھپھی سسک سسک کر رونے لگیں۔ مگر عابدہ پھپھی نے ان سسکیوں کو نظر انداز کیا اور جلے بھنے لہجے میں بولیں ''آپ تو ایسے بات کر رہے ہیں جیسے بگھی کے لیے کوئی نیا گھوڑا خریدنا ہے۔''

''میری اچھی عابدہ بی بی یہ تو وہ زمانہ ہے کہ لوگ بَر کے مقابلے میں گھوڑا خریدتے وقت زیادہ دیکھ بھال کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک فیشن ہو گیا ہے کہ آدمی کے حسب نسب کی بات کرو تو بات مذاق میں اڑا دی جاتی ہے مگر گھوڑوں اور کتوں کے معاملے میں اچھی نسل کے لیے دولت لٹا دیتے ہیں۔ بی بی! وہ وقت دور نہیں ہے جب لوگ اپنے اعلیٰ حسب نسب پر فخر کے بجائے شرمندہ ہوا کریں گے۔ خیر تو مجھے جواب چاہیے۔ 'ہاں' میں ہو یا 'نہیں' میں۔ ویسے تو بی بی تم نے رشتے کی بات کو اچھا خاصا ناٹک بنا دیا۔ خوب سٹیج سجایا اور لڑکیوں کو ناظرین با تمکین بنا کر بٹھا دیا۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ بڑے جو فیصلہ کریں گے زہرا کو وہ منظور ہو گا۔ شکر ہے کہ میم صاحبوں والی تعلیم سے وہ فیض یاب نہیں ہوئی۔ ویسے یہ دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی کہ اس تعلیم کی کچھ بھدی علامات رخصت ہو گئی ہیں اور تمہاری میم صاحب نے کرسٹانوں والے لباس میں بن سج کر چہل قدمی کرنے کی روش ترک کر دی ہے۔''

کہاں غم ٹھنڈی ہوئی جا رہی تھی اور کہاں اب اندر ہی اندر چھنک رہی تھی۔ عابدہ پھپھی نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جلے کٹے لہجے میں بولیں ''لیلیٰ کیا پہنتی اوڑھتی ہے، یہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے۔''

ماجدہ پھپھی کچھ جھجک کے سے لہجے میں بولیں ''محسن بھائی! لیلیٰ کے ابا بیٹی کو جس طرح کی تعلیم دلانا چاہتے تھے ویسی ہی تعلیم اسے دلوائی گئی ہے۔ اچھے بھائی کی جیسی تمنا تھی ویسے ہی عابدہ نے اسے پالا ہے۔ اگر اس کی ماں کو جینے کی مہلت ملی ہوتی تو وہ بھی شاید اتنا نہ کرتی۔ بلکہ اس معاملے میں تو ابا نے بھی اپنے سارے خیالات ایک طرف رکھ کر مرحوم بیٹے کے خیالات کا پاس لحاظ رکھا۔ خدا اس کا گواہ ہے۔ تو محسن بھائی! آپ کو اس نکتہ چینی کا حق نہیں پہنچتا۔''

محسن چچا تو پھٹ پڑے ''جس بات کو میں حق سمجھتا ہوں اس کے کہنے کا مجھے پورا حق حاصل ہے۔ میں پیٹھ پیچھے بات نہیں کرتا۔ یہی تو مجھ میں خرابی ہے کہ میں لگی لپٹی نہیں رکھتا، صاف بات کرتا ہوں۔ میں تو خاندان کی بھلائی چاہتا ہوں اس لیے جو کہتا ہوں اس کے بھلے کے لیے کہتا ہوں۔ میں یہ تو نہیں چاہوں گا کہ میری بھتیجیوں کو ایسے رستے پر ڈال دیا جائے کہ وہ بے راہ ہو جائیں۔ آخر زہرا بھی تو ہے۔ اس کی پرورش مختلف انداز سے ہوئی ہے اور بالکل صحیح ہوئی ہے۔ سمجھداری کے ساتھ ہوئی ہے۔''

عابدہ پھپھی کی آواز غصے سے کپکپانے لگی ''محسن بھائی! میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ میں اس

معاملے میں آپ سے کوئی بات کرنے کے لیے تیار نہیں۔''

اور ماجدہ پھپھی نے زہرا کو کہ سعادت مندی سے ان کے پہلو میں بیٹھی تھی، فخر بھری نظروں سے دیکھا۔ کہنے لگیں ''محسن بھائی! یہ کوئی لڑنے کا موقع ہے؟ ہاں خیر یہ تو صحیح بات ہے کہ جیسی بھی میری عقل تھی اس کے حساب سے میں زہرا کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی وہ میں نے کیا۔ قرآن پڑھا ہے، سارے مذہبی فریضوں کو جانتی سمجھتی ہے۔ سینا پرونا بھی جانتی ہے۔ مسلم سکول میں تھوڑی انگریزی بھی پڑھی ہے۔ آج کل کے نوجوان آخر یہ بھی تو چاہتے ہیں۔ تو میں جو کر سکتی تھی وہ میں نے کیا۔ اور میرے جو حالات ہیں وہ تو آپ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ان حالات میں مَیں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی تھی۔''

اس مقام پر ایک مرتبہ پھر ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ ذرا ذرا سی بات پر تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ اس سے ان آنسوؤں کی اہمیت ہی جاتی رہی تھی۔ اصل میں تو ان آنسوؤں کا رشتہ اس داستان غم سے جا کر ملتا تھا جو اتنی مرتبہ دہرائی گئی تھی کہ اس کے کوئی معنی ہی نہیں رہے تھے۔

اب تو بات کو پندرہ برس ہونے کو آ رہے تھے۔ ماجدہ پھپھی کے میاں پیروں فقیروں کے چکر میں انہیں چھوڑ چھاڑ گھر سے نکل گئے تھے۔ مزاروں کے چکر لگاتے رہتے تھے۔ خیر خیرات میں ساری دولت لٹا ڈالی۔ اسی دولت پر ریجھ کر تو بابا جان نے انہیں اپنی فرزندی میں لیا تھا۔ چھ برس پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ بالکل دیوانے ہو گئے تھے۔ عشق الٰہی میں مست رہتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد ان چھ برسوں میں زہرا نے اپنے تصور کے زور پر انہیں ایک درویش کا مرتبہ دے دیا تھا۔ اور ماں کی اجڑی زندگی کی توجیہ یوں کی گئی کہ جیسے انہوں نے اللہ کی راہ میں یہ قربانی دی تھی۔

''شیطان پہ لعنت!'' محسن چچا چلاتے ہوئے بولے۔ ساتھ ہی آخ تھو کر کے پان کی بہت سی پیک چینل کے اس اونچے اگال دان میں اگل دی جو ان کی کرسی کے برابر رکھا تھا۔ ''مجھے بحث میں مت الجھاؤ۔ معاملے کی بات کرو۔''

''لڑکے کی عمر آپ نے کیا بتائی تھی؟'' عابدہ پھپھی نے اپنے غصے کو پی کر بڑے خشک لہجے میں سوال کیا۔

''تیس برس۔ لیکن بالکل نوجوان لگتا ہے، خوبصورت جوان ہے۔ مطلب یہ کہ مرد کو جیسا خوبصورت ہونا چاہیے۔ رنگ گندمی ہے، بلکہ گورا ہی کہنا چاہیے۔''

''آپ کے جاننے والوں کے یہاں شادی ہوئی تھی؟''

''ہاں انگلستان ٹریننگ کے لیے جانے سے پہلے یہ شادی ہوئی تھی۔ اچھا شوہر تھا۔ چار سال پہلے بیوی کا انتقال ہوا ہے۔ خوش قسمتی سے ساتھ میں بچہ بھی مر گیا۔ گویا ہماری زہرا سوتیلی ماں بننے سے بچ گئی۔ اس کی اپنی اولاد ہو گی۔'' محسن چچا نے چہکنا شروع کر دیا۔

''اللہ نے چاہا تو دودھوں نہائے گی، پوتوں پھلے گی۔'' ماجدہ پھپھی دعائیں دینے لگیں۔

''اوراس کے ماں باپ؟'' عابدہ پھپھی کے خشک لہجے میں ذرا جو فرق آیا ہو۔

''اپنی خاندانی زمینوں پہ رہتے ہیں۔ مگر ان کی ایسی کوئی بڑی زمینداری نہیں ہے۔ لیکن خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ خود تو سرکاری ملازم ہے۔ مستقبل روشن ہے۔''

''ہاں چونکہ مستقبل روشن ہے اس لیے یہ کریدنے کی کیا ضرورت ہے کہ پیچھے سے یہ لوگ کیا ہیں۔ اور نہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ لڑکے کی تربیت کیسی ہوئی ہے۔ ہمارے برابر کے لوگ ہیں بھی یا نہیں۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ سو باتوں کی ایک بات کہ لڑکا سرکاری ملازم ہے۔۔۔۔۔''

محسن چچا نے چھڑی کو تخت کے کنارے پر زور سے پٹخا اور عابدہ پھپھی کے طنزیہ بیان کو کاٹتے ہوئے تڑخ کر بولے ''میں نے بڑے بڑے راجاؤں مہاراجاؤں کو دیکھا ہے، انہیں جن سے جناب کے والد ماجد کی گاڑھی دوستیاں تھیں۔ ان راجاؤں مہاراجاؤں کو افسروں کے قدموں میں اپنی ٹوپیاں پگڑیاں رکھتے دیکھا ہے۔ اور محض اس وجہ سے کہ یہ افسر سفید چمڑی والے تھے۔ بابا جان کی گردن ویسے تو ہمیشہ اونچی ہی رہی، مگر لاٹ صاحب گورنر بہادر کے سامنے تو ان کا بھی سر جھک جاتا تھا۔ اور ان کی صاحبزادی صاحبہ کنواری بیٹھی رہ گئیں، اس لیے کہ ایسا بر دستیاب نہ ہو سکا جو ان کے برابر کا ہوتا۔''

''محسن بھائی!'' ماجدہ پھپھی تڑپ کر بولیں ''ایسی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔ یہ میری بچی کے مستقبل کا سوال ہے۔ آپ اس میں زہر کیوں گھول رہے ہیں۔ بھائی جان کو آ جانے دیجیے۔ پھر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچیں گے اور طے کریں گے۔''

اب بابا میاں نے زیادہ گرمجوشی سے اللہ میاں کے ناموں کا ورد شروع کر دیا تھا۔ زہرا گم متھان بیٹھی تھی۔ میری نظریں عابدہ پھپھی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کے مجھے کتنی تکلیف ہو رہی تھی۔ چہرہ اس وقت بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ ماجدہ پھپھی کی بات کا محسن چچا کو ابھی جواب دینا تھا مگر ہوا یہ کہ اسی اثنا میں دالان سے کچھ تند و تیز آوازیں سنائی دیں۔ حکیمن بواسٹ پٹ کرتی نمودار ہوئیں۔ دروازے پہ کھڑے کھڑے گھبرائی آوز میں پکاریں ''عابدہ بٹیا! جلدی آؤ۔''

عابدہ پھپھی چونک پڑیں۔ ان کی نظریں بے ساختہ بابا جان کے کمرے کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر مڑ کر غصے سے بولیں۔ ''یہ شور بند کرو۔ ابا سو رہے ہیں۔''

بابا جان اپنے کمرے میں پڑے سو رہے تھے، لیکن ہمیشہ کی طرح آج بھی پورے گھر پہ ان کا وجود چھایا ہوا تھا۔ اور ان کی موت کے اندیشے نے تو ان کے اثر میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

عابدہ پھپھی کے پیچھے پیچھے میں بھی باہر نکل گئی۔ کمرے میں تو محسن چچا کی ذاتِ شریف اور خیالاتِ عالیہ کی وجہ سے ایسی گھٹن پیدا ہو گئی تھی کہ سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔ زہرا دالان میں پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اس

کے تجسس نے اس میں پھرتی پیدا کر دی تھی۔ بس یہی ٹوہ لینے کی عادت گھر کی نوکرانیوں اور خادماؤں میں بھی تھی۔ سو وہ بھی دم کے دم دالان میں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ ٹوہ لینے ہی کے چکر میں وہ یتیم لڑکا بھی آن پہنچا جس کا اس گھر میں کام بس اتنا تھا کہ کبھی باورچی کے ساتھ لگا ہوا ہے اور کبھی مالیوں اور پہرے داروں کی بیویوں کے کاموں میں ہاتھ بٹا رہا ہے۔

بیچ میں کھڑے چند لوگوں پر ان سب کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ جُمن دھوبی کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس کی بیٹی ننذی اس کے قدموں میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سر پہ دونوں ہاتھ رکھے ہوئے تھے جیسے ڈر رہی ہو کہ باپ غصے میں اس کے سر پہ مکانہ جما دے۔ ادھر جُمن کی عورت کرب کی کیفیت میں تھی۔ ساڑھی کا پلو سر پہ ڈالے اور منہ اس میں چھپائے دیوار کے سہارے لگی کھڑی تھی۔

''بٹیا جی سرکار میں دُہائی ہے!'' جُمن کے منہ سے بڑی مشکل سے یہ لفظ نکلے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

''خاموش!'' عابدہ پھپھی غصے سے بولیں ''تم لوگوں کی عقلوں پہ کیا پتھر پڑ گئے ہیں کہ یہاں آ کر اتنا شور مچا رہے ہو۔'' اور وہ ان کے بیچ میں سے ایسے گزریں جیسے کوئی تلوار کی دھار ہو۔ ''آؤ میرے ساتھ باہر۔''

سب چپ چاپ ان کے پیچھے ہو لیے اور کمروں کے پاس سے گزرتے ہوئے صحن میں آ گئے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور بڑے بڑے لال گملوں میں لگے ہوئے پودوں کے پتوں میں نرم سی سرسراہٹ تھی۔ لان میں جو میز حسیاں بنی تھیں ان پر چاندی کا ایک پنجرہ رکھا تھا۔ اصل میں طوطا دھوپ سینک رہا تھا۔ کیسا پٹر پٹر بول رہا تھا'' پیارے مٹھو! مٹھو بیٹے! اللہ الا اللہ۔'' وہ حکیمن بوا کی آواز کی نقل اتار رہا تھا۔

''جُمن! آخر تمہیں ہوا کیا کہ گھر میں آ کر عین بابا جان کے کمرے کے دروازے کے پاس شور مچانا شروع کر دیا۔ آسمان سر پہ اٹھا لیا۔''

عابدہ پھپھی کا انداز بیان مبالغہ آمیز ضرور تھا، لیکن اس سے ان کے تحکمانہ لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس گھر کی چار دیواری میں جذبات بس ابلتے رہتے تھے۔

''بٹیا جی!'' جُمن بولا ''میں تو اسے کاٹ کے بوٹی بوٹی کر دیتا۔ پر یہ جو میری عورت ہے، اس کی میّا، وہ بولی کہ بٹیا جی سے چل کر پھیسلہ کرائے لو۔ تو حجور! ہمیں معافی دے دو۔ اس نے تو ہماری اجت مٹی میں ملا دی۔ مجھ پہ تو بھوت سوار ہے۔ تو میں اسے تمہاری سرکار میں چھوڑن لگا ہوں۔ جو چاہو اسے سجا دو۔'' اور اس نے ننذی کو عابدہ پھپھی کے آگے دھکیل دیا۔

غصے میں جُمن تو جُمن ہی نہیں رہا تھا، کچھ اور ہی لگ رہا تھا۔ ویسے تو یوں وہ کالا کلوٹا تھا۔ منڈھی ہوئی چندیا اور گھنی مونچھیں، لیکن اس کی آنکھوں میں بہت بھولپن تھا۔ بس اسی سے اس کی ذات میں شرافت آ گئی

تھی۔ دونوں کلائیوں میں سلور کی دو موٹی موٹی چوڑیاں، کان میں سونے کی بالی، لنگی سفید بے داغ دھبے والی گھٹنوں سے اونچی بندھی ہوئی۔ خیر اس کی وجہ تو یہ تھی کہ اسے گھٹنوں کے حساب سے تکیا میں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ بھیگے کپڑے پتھر پر پٹخ رہا ہے اور ایک تواتر اور آہنگ کے ساتھ چھیو چھیو کی آواز نکال رہا ہے۔

لیکن اس وقت اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور آواز میں درشتی تھی۔ نندی کو ٹھوکریں مار رہا تھا اور وہ غریب چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانکے زمین میں گڑ مڑی مارے پڑی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر حکیمن بوا کہا کرتی تھیں کہ اس کم بخت کی صورت تو ماں باپ کے لیے کلنک کا ٹیکا ہے۔ چھوٹی ذات والوں میں ایسی صورت شکل کہاں ہوتی ہے۔

جب میری چھوٹی عمر تھی تو نندی کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ بڑی آزاد طبیعت کی لڑکی تھی۔ نہ کسی کا ڈر نہ کسی کی پروا، اپنے حال میں مگن۔ اور پیاری ایسی جیسے ہرنی ہو۔ میں جب کبھی کوئی بدتمیزی کرتی تو حکیمن بوا کہتیں کہ یہ سب نوکرانیوں کی صحبت کا اثر ہے۔ میں چپکے سے سٹک جاتی اور نندی کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی اس کے سرونٹ کوارٹر والی گھٹنس کوٹھری میں آ پہنچ جاتی جہاں میلے کچیلے کپڑوں کا ایک انبار لگا ہوتا تھا۔ اوپرے کوئلوں کا ڈھیر، یہ کوئلے استریوں میں کام آنے کے لیے تھے۔

نندی دلہن دلہن والا کھیل بہت شوق سے کھیلتی تھی۔ فوارے کے برابر جو جھاڑی ہے اس میں چھپ کر یہ کھیل کھیلا جاتا تاکہ اس بے شرمی کے کھیل کو کوئی دیکھ نہ پائے۔ نندی دلہن بنتی تھی اور میں منہ دکھائی کی رسم ادا کرتی۔ جمع ہونے والے مہمانوں کے سامنے اس کا گھونگھٹ اٹھاتی، مندی ہوئی آنکھوں سے اس کے ہاتھ ہٹاتی اور ٹھوڑی اوپر اٹھا کر کہتی "ماشاءاللہ، چشم بددور، دلہن تو بہت خوبصورت ہے۔" اور پھر جھوٹ موٹ اس کے ہاتھوں میں تحفے تحائف پکڑا دیتی۔

لیکن اس وقت اگر اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا تو یہ کھیل نہیں تھا اور وہ جو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور جن سے اس کی انگلیاں تربتر تھیں تو یہ کسی دلہن کے رسمی آنسو نہیں تھے۔

"اب اس نے کون سا گل کھلایا ہے؟" عابدہ پھپھی نے تیز لہجے میں پوچھا۔

ابھی تھوڑے دن پہلے نندی نے برابر والے گھر میں جہاں ایک انگریز خاندان رہتا تھا سالیس کو ایسا تاک کے روڑا مارا تھا کہ وہ بلبلا اٹھا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ جب زنانے غسل خانے میں نلکے کے نیچے بیٹھی نہا رہی تھی تو سالیس اسے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چند دن بعد کی بات ہے کہ اس نے ایک ڈاکیے کو پیٹ ڈالا۔ کہتی تھی کہ اس نے اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی۔

اب شمن نے عابدہ پھپھی کو بتایا "بٹیا جی! یہ چھنال گیراج میں کلینر کے ساتھ تھی۔ ڈرائیور نے اس کی چوری پکڑ لی۔" شمن کی آواز غصے سے اور شرم سے رندھ گئی تھی۔

نندی نے فریادی لہجے میں کہا "میں تو واں پہ اسے کرتا دینے گئی تھی۔ وہ یاں پہ اسے بھول گیا تھا۔"

''چپ رہ، ڈھڈو، بے شرم۔'' شمن نے اسے ڈانٹ پلائی۔ پھر عابدہ پھپھی سے مخاطب ہوا'' بٹیا جی، میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اب تو مردانے کوارٹروں میں اکیلی گئی تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ میں تو جی شرم سے ڈوب مرا۔ اس بے شرم کو ڈرائیور جی گھسیٹتے ہوئے لائے۔ پھر جو انہوں نے باتیں کہیں، بس جی کیا کہوں۔ اب میں واں پہ کیسے رہوں۔''

نور خاں ڈرائیور کو یہاں آئے ہوئے ابھی تین سال ہی تو ہوئے تھے۔ دونوں ہی پھپھیاں اس سے پردہ کرتی تھیں۔ شمن کی بات اور تھی۔ وہ اور اس سے پہلے اس کا باپ بچپن سے اس گھر میں ملازم تھے۔ ہماری زمینوں سے آئے تھے۔

عابدہ پھپھی نے بیزاری سے محسن چچا کو دیکھا اور کہا'' آپ نور خاں سے پوچھیں کہ یہ قصہ کیا ہے۔ یہ تو مردوں ہی کے بھگتانے کا قصہ ہے۔''

محسن چچا نے حقارت سے نندی کو دیکھا اور ایک چھڑی رسید کی'' بڑی قطامہ ہے یہ لڑکی۔ چھنال ہے چھنال۔''

نندی نے سہمی نظریں اٹھائیں۔ پھر چاروں طرف کھڑے لوگوں پر نظر ڈالی جو اسے خاموش خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ پھر ایک دم سے چیخ پڑی۔

''میں قطامہ ہوں۔ چھنال ہوں میں۔ اور جی آپ کون ہیں؟ آپ تو خود مجھ پر ڈورے ڈال رہے تھے۔ وہ تو میں ہی طرح دے گئی۔''

محسن چچا کی حالت دیکھنے والی تھی۔ غصے سے چہرہ آگ بھبوکا ہو گیا۔ چھڑی اٹھا کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ ایسی چھڑی ماری کہ وہ بیچاری تیورا کر گر پڑی۔ پھر چھڑی اٹھانے لگے تھے کہ میں لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ دوسری چھڑی میرے کندھے پر آ کر لگی۔ میں چیخ پڑی'' نفرت ہے مجھے آپ سے۔ آپ برے لگتے ہیں مجھے۔'' اور میں روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

تیسرا باب

جب زہرا نے مجھ سے آ کر کہا کہ عابدہ خالہ تمہیں بلا رہی ہیں، بابا جان کے کمرے میں ہیں، تو میں نے آنسو پونچھے اور چلی ان کے پاس۔

اس وقت تو مجھے حکیمن بوا سے بھی بات کرنا ناگوار لگ رہا تھا۔ وہ اسی وقت پریشان اور ملول میرے پیچھے پیچھے آئی تھیں "ہائے میری بچی، میرے جگر کا ٹکڑا! چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں نہیں۔ بس آپ مجھے چھوڑ دیں۔"

عابدہ پھپھی نے اس وقت کوئی بات نہیں کی۔ نہ اچھی نہ بری۔ زہرا اس وقت بہت سی خبریں لے کر آئی تھی "کلیمز کو تو برخاست کر دیا جائے گا اور نندی کی تو خُمن مار مار کر چمڑی ادھیڑ دے گا۔ ابھی سے اس عمر میں ایسی بے حیائی! ایسے بے شرم لوگوں کو گھر میں کون گھسنے دے گا۔"

"بعض اور لوگوں کے لیے بھی یہ شرم کا مقام ہے۔"

زہرا نے میرے اس فقرے کو تو گول کر دیا، اپنے طور پر کہنے لگی "ان کمینوں کی بدزبانی دیکھو۔ اسے ہمارے چچا میاں سے ایسی بات کرنے کی مجال کیسے ہوئی۔ اور پھر سب کے سامنے، سارے نوکروں کے ہوتے ہوئے! لیلیٰ، آخر تم کیوں بیچ میں کود پڑیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"ہاں، مجھے شرم تو آ رہی ہے۔ شرم اس بات پہ آ رہی ہے کہ میں انہیں چچا کہتی ہوں۔ تمہیں دیکھ کے بھی شرم آ رہی ہے کہ چونکہ وہ نوکروں کی چھوکری ہے اس لیے تمہیں اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ باقی مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ کوئی میرے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ میری جوتی سے۔"

"لیلیٰ! پتہ ہے تمہارے ساتھ گڑبڑ کیا ہے۔ تم نے کتابیں بہت پڑھ لی ہیں، یہ گڑبڑ ہے۔ حقیقت کا تو تمہیں کوئی احساس ہی نہیں ہے، کتابی باتیں کرتی ہو۔ اور نندی کا تو بس ایک ہی علاج ہے کہ جلدی سے اس کا بیاہ کر دیا جائے۔"

"اچھی لڑکی کا علاج یہ ہے کہ جلدی سے اس کا بیاہ کر دیا جائے۔ بری لڑکی کا علاج یہ ہے کہ جلدی سے اس کا بیاہ کر دیا جائے۔ بیاہ، بیاہ، بیاہ۔ بس جلدی سے بیاہ کر دیا جائے۔ ارے تمہیں اس کے سوا بھی کوئی بات سوجھتی ہے۔"

''میں جانوں تمہارا گمان یہ ہے کہ تمہارا کبھی بیاہ نہیں ہوگا۔''

''میں جانوروں کی طرح تو کسی کے ساتھ نہیں جوتی جاؤں گی۔ وہ لوگ بیٹھے ایسے باتیں کررہے تھے جیسے تم کوئی میز کرسی ہو جس کی نیلامی ہو رہی ہے۔ جو سب سے بڑھ کر بولی دے گا اُس کے ہاتھ بیچ دی جائے گی۔ اور تم اطمینان سے بیٹھی سن رہی تھیں۔ تمہیں یہ بات برداشت کیسے ہے کہ کسی بھی مرد کے ساتھ تمہیں باندھ دیا جائے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم اپنا بر آپ ہی ڈھونڈ کے لاؤ گی۔ اور ہوسکتا ہے کہ تم محبت کی شادی کرو جیسے میمیں کرتی ہیں۔ وہ کم بختیں تو ایک کو چھوڑ کے دوسرے سے اور دوسرے کو چھوڑ کر تیسرے سے ایسے کرتی ہیں جیسے آدمی ایک سلیپر اتار کر دوسرا سلیپر پہن لیتا ہے۔ ہشتو، تمہارے دماغ میں تو خناس بھر گیا ہے۔ خیر مگر تم مجھ سے کیوں لڑنے پر تلی ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔''

اس کے ساتھ فوراً ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آنسو تو اس کی آنکھوں میں بھر آنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی میں نے یہی سوچا کہ یہ بڑی کمینی لڑاکا لڑکی ہے۔ لیکن ابھی غصے میں میرے منہ سے کوئی لفظ نکل نہیں پایا تھا کہ وہ تیزی سے اٹھ کر چلی گئی۔

باباجان کے کمرے میں اندھیرے اجالے کی ملی جلی فضا تھی اوپر سے خاموشی چھائی ہوئی تھی عابدہ پھپھی ان کے لمبے چوڑے پلنگ کی پائنتی بیٹھی ہوئی ان کے پاؤں دبا رہی تھیں۔ ویسے زیادہ دیر تک اس طرح بیٹھے رہنے سے ان کے پیٹ میں اکڑن پیدا ہو جاتی تھی ماجدہ پھپھی سرہانے اس طرح کھڑی تھیں کہ ایک ہاتھ میں پنکھا تھا دوسرے ہاتھ سے انھوں نے اپنے بھاری بھر کم غرارے کا پائچا سنبھال رکھا تھا کھیاں اڑانے کی ڈیوٹی پر تو نوجوان چھمن مامور تھا اور یہ فریضہ وہ بڑی چوکسی سے انجام دیتا تھا لیکن جب ہماری پھپھیاں یہاں آتی تھیں تو وہ باہر چلا جاتا تھا۔ ہاں کرم علی کو رکے رہنے کی اجازت تھی کیونکہ وہ تو باباجان کی عمر کا آدمی تھا اور ہماری پھپھیوں کو وہ ان کے بچپن سے دیکھتا چلا آیا تھا۔

میں اور زہرا پلنگ کے ایک طرف جا کھڑے ہوئے اور جھک کر آداب کیا ''باباجان! آداب۔''

باباجان نے آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا۔ یہ ہمارے آداب کا جواب تھا۔ ایک موٹے سے تکیے پر ان کا سر ٹکا ہوا تھا۔ ان کی داڑھی اب کچھ اور زیادہ سفید ہوگئی تھی اور چہرہ سنولا گیا تھا۔ ہم دونوں سر ڈھانپے چپ چاپ کھڑے رہے۔ کمرے میں چھائی ہوئی خاموشی کا شاید اثر تھا کہ ہم بالکل بے حس بے حرکت کھڑے تھے۔ میرے اندیشے بھی اس وقت جامد ہو گئے تھے۔

کونے میں اونچی الماری کھڑی تھی جس کے پاس ہی میز تھی۔ دوائیں الماری کے خانوں میں بھری تھیں اور اس کے متصل اس میز پر اس طرح بکھری ہوئی تھیں جیسے الماری کے خانوں سے یہاں انڈیل دی گئی ہوں۔ کرم علی اپنے گھٹنے سمیٹے بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی چھدری چھدری تھی کہ اس کا پوپلا منہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔

اس وقت وہ اونگھ رہا تھا اور منہ کھلا ہوا تھا۔ دوسرے نوکر تو باقاعدہ نوکروں والی وردی ڈالے رہتے تھے لیکن کرم علی اس ضابطے سے آزاد تھا۔ لمبی لمبی کنگھی کی ہوئی زلفوں پر ٹوپی منڈھی رہتی تھی۔ بر میں دھاری دار کرتا، گریبان میں زنجیر دار چاندی کے بٹن۔ کاندھے پر سیاہ سرخ چارخانے والا بڑا سا رومال پڑا ہوا۔ پائجامہ کالی رنگت والا کہ گٹوں کے قریب پنڈلیوں پر چست مگر گھٹنوں پر آ کر ڈھیلے سے بن جاتے۔ مگر یہ ان سب ہی کے ساتھ تھا جو پنج وقتہ نماز پڑھتے تھے۔

کرم علی کے طفیل ہمارا بچپن گیتوں اور الف لیلہ کی کہانیوں سے مالا مال تھا لیکن اب جب وہ حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہانی سناتا تو نیند سے اس کی آواز ڈوبتی چلی جاتی۔ ٹھوڑی لٹک جاتی اور پوپلا منہ کھلا رہ جاتا۔ یہ دیکھ کر بچے کھنکھارتے، کھنکھار سن کر وہ بڑبڑا کے آنکھیں کھولتا، حقے کی نے منہ میں لے کر گڑ گڑ کرتا اور بچوں کو جھڑکتا "اگر تم سونے لگو گے اور کہانی سنتے ہوئے ہنکارا نہیں بھرو گے تو میں اپنا اور تمہارا وقت برباد نہیں کروں گا اور کہانی ختم کر دوں گا۔"

عابدہ پھپھی کو چھینک آ گئی۔ بابا جان نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ کرم علی نے جھرجھری لی۔ کہا "بسم اللہ" اور پھر اونگھنے لگا۔

میں دل ہی دل میں حیران ہو رہی تھی کہ عابدہ پھپھی نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ کیا وہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہیں۔ لیکن ان کے چہرے پر تو ناراضگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس سے میرا ڈر تھوڑا کم ہو گیا۔ بلکہ اب تو مجھے یہ خوش فہمی ہونے لگی کہ میں نے جو فل مچایا تھا اس پر عابدہ پھپھی خوش ہیں۔

ہم خاموش کھڑے انتظار کرتے رہے کہ کب ہمیں واپس جانے کا اشارہ کیا جاتا ہے۔ ایک ایک پل بھاری ہو رہا تھا۔ ہر ساعت تانت کی طرح کھنچتی چلی جاتی ہے۔

بابا جان کہاں مرنے والے ہیں۔ یہ طاقتور شخص جس نے جانے کتنے لوگوں کو اس نوبت تک پہنچ دیا کہ وہ خوف کی پوٹ بن کر رہ گئے اور جن کی زندگیوں کو ان سے چھین کر اس نے خود بسر کیا۔ مگر مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ یہ شخص مرنے سے بہت ڈرتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے وہ موت سے کتنا لڑا ہے۔ دواؤں کی یہ اتنی بہت سی شیشیاں جو کمرے میں ڈھیروں کے حساب سے رکھی تھیں، انہیں موت سے لڑنے کے ہتھیار جانئے اور قطار اندر قطار ڈاکٹر، بالفاظ دیگر ڈاکٹروں کی ایک پوری فوج، جس کی سالاری ایک سول سرجن کے سپرد تھی۔ موت کے خلاف جنگ میں یہ فوج روز کوئی نئی جنگی چال اختیار کرتی۔ روز فوج کے سپاہیوں میں ردوبدل ہوتا۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر طاقتور وہ شخص خود تھا۔

میں دل ہی دل میں حیران ہوئی کہ اچھا میں موت کے خلاف اس طرح سوچتی ہوں! کیا زہرا نے ٹھیک کہا تھا کہ میں بہت سنگدل اور خود غرض ہوں۔ لیکن جب میں کوئی کہانی پڑھتی ہوں یا کوئی نظم پڑھتی ہوں تو پڑھتے ہوئے مجھ پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ ضرور میرے اندر کوئی خرابی ہے۔ آخر وہ کیا خرابی ہے۔ مگر

جسے خرابی کہتے ہیں وہ خود کیا چیز ہے۔ خرابی کیا ہے، اچھائی کیا ہے۔ غلط کیا ہے، صحیح کیا ہے، یہ مجھے کون بتائے۔

بابا جان نے کروٹ لی۔ پوچھا "عابدہ کیا وقت ہوا ہے؟" ان کی بھاری آواز میں اب وہ توانائی نہیں رہی تھی۔ لیکن تحکمانہ لہجہ جوں کا توں تھا۔

"ابا چھ بجے ہیں۔" عابدہ پھپھی نے آہستہ سے کہا۔

"تو میری دوا کا وقت ہوگیا؟"

"جی، ابا جان!"

"پھر مجھے دیتیں کیوں نہیں۔ میں خود یاد دلایا کروں کہ میری دوا کا وقت ہوگیا؟"

"ابا جان آپ آرام فرما رہے تھے۔ میں آرام میں خلل ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔"

"میں سو نہیں رہا تھا۔ تمہاری یہ غفلت آرام میں خلل ڈالنے سے زیادہ میرے لیے تکلیف دہ ہے۔"

"ابا جان معاف کر دیجیے۔"

"وہ حرام خور کرم علی کہاں ہے؟"

"حضور! بندہ حاضر ہے۔"

"میری دوا کہاں ہے؟"

"حضور یہ رہی۔ حضور ابھی چھ بجنے میں ایک منٹ رہتا تھا۔ گھڑی نے ابھی چھ نہیں بجائے تھے۔"

"تجھ پہ شیطان کی مار۔"

"جی حضور!"

سامنے والی دیوار پر شیشہ جڑی بھاری بھرکم الماری کے دونوں طرف لکڑی کے فریموں میں آراستہ تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک گروپ فوٹو بابا جان، ان کے سگے اور رشتے کے بھائیوں کا تھا۔ سب کی کالی کالی داڑھیاں تھیں۔ اس شان سے اونچی منقش کرسیوں پر رونق افروز تھے کہ بر میں کار چوبی کے کام والی اچکنیں، سروں پہ ٹوپیاں، ہاتھوں میں جڑاؤ تلواریں، عقب میں باوردی محافظ فولادی نوکروں والے بھالے ہاتھوں میں لیے کھڑے ہوئے۔ ایک تصویر میں بابا جان اکیلے نظر آ رہے تھے۔ داڑھی صاف، تاؤ دی ہوئی گھنی مونچھیں، بر میں سوٹ، اس کے ساتھ چم چم کرتے پتلی نوکیلی نوواولے بوٹ۔ ایک اور تصویر میں بابا جان انگریزوں کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔ اس گروپ فوٹو میں انگریز جنٹلمین اپنی میموں کے عقب میں بڑی شان کے ساتھ تنے کھڑے تھے۔ میموں کی اپنی شان تھی۔ نیچے نیچے کناری دار چنٹوں والے لباس، ان کے گوٹا لگے کالر، سروں پہ بالوں کے گچھے بنے ہوئے، ان پر چوڑے ہیٹ سجے ہوئے۔

بابا جان کسی بھلے وقت میں جوان بھی تو تھے۔ جوانی کے ان دنوں میں انہوں نے ان خواتین سے

مسکرا مسکرا کر باتیں بھی کی ہوں گی۔ کیا کبھی ان کے یہاں نرم و نازک احساسات نے بھی راہ پائی ہوگی؟ کبھی زندہ دل بھی رہے ہوں گے؟ کبھی حیرت و استعجاب کی کیفیتوں سے بھی گزرے ہوں گے؟ کیا کبھی ایسا زمانہ تھا جب ان کے ہوتے ہوئے کوئی بے تکلفی سے ہنسا بولا ہو؟

جب بابا جان دوا پینے کے بعد کلی کر چکے تو کرم علی نے ان کے سامنے سے سلور کی سلفچی اور پانی کا جگ ہٹا لیا۔ عابدہ پھپھی نے جس بازو سے ان کے سر کو سہارا دے رکھا تھا اسے سر کے نیچے سے ہٹا کر ان کے تکیے کو سیدھا کیا اور کرم علی نے جو تولیہ ان کے ہاتھ میں تھمائی تھی اس سے ان کا منہ پونچھا۔

چند لمحے وہ خاموش لیٹے رہے۔ پھر انہوں نے اسی طرح آنکھیں موندے آہستہ سے کہا "اب تم لوگ جاؤ۔"

ہم نے جھک کر آداب کیا۔ حاضری کی رسم پوری ہو گئی تھی۔

کرم علی نے آرام سے کرسیاں قرینے سے لگانی شروع کر دیں۔ یہ اُن دوستوں کے لیے اہتمام ہو رہا تھا جو روز شام کو ڈاکٹر کے آخری پھیرے کے بعد یہاں آیا کرتے تھے۔ ان میں ایک تو ٹھاکر بلبیر سنگھ تھے۔ ذات کے راجپوت تھے۔ جتنے تند خو تھے اتنے ہی سخی بھی تھے۔ ان کے کارچوبی کے کام والے سوتی انگرکھوں کی کیا پوچھتے ہو۔ ایک ایک انگرکھے کی تیاری میں جانے کتنے کاریگروں کی بینائی گئی ہوگی۔ قیمتی اتنے کے دلہنوں کا پورا جہیز بھی ان کے مقابلے میں سستا نظر آتا تھا۔ ان کے مرغوں نے کبھی پیٹھ نہیں دکھائی اور ان کے کبوتر شہر کے سب کبوتروں کو اڑنے میں مات دے چکے تھے۔ سخاوت اور بہادری میں مشہور تھے۔ شیر اور ڈاکو دونوں کو یکساں بے تکلفی سے گولی کا نشانہ بناتے تھے۔ ہم نے انہیں بھنوڑ دادا کا خطاب دے رکھا تھا۔

اور امیر پور کے راجہ حسن احمد، بڑے دبدبے والے راجہ تھے۔ شاعر تھے، محلات تعمیر کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے زنان خانے پر حبشی خواجہ سرا پہرہ دیتے تھے۔ ان کے والد گرامی تو بہت جزرس آدمی تھے۔ ان کی آنکھ بند ہونے کے بعد جب انہوں نے گدی سنبھالی تو دولت اس شان سے لٹائی کہ پرانے زمانے کے بادشاہوں کے عیش و عشرت کے افسانوں کی یاد تازہ کر دی۔ یہ مشہور تھا کہ انہوں نے اپنے راج سنگھاسن والے ایوان میں ننگی عورتوں کی ریس کرائی تھی۔ مقابلے کی صورت یہ تھی کہ جو عورت لڑھکتی بل کھاتی سب سے آگے نکل جائے گی اسے اشرفیوں کی تھیلی بخش دی جائے گی۔ بادشاہوں کی ریس میں شطرنج اس طرح کھیلتے تھے کہ ننگی عورتوں اور نوجوانوں سے گوٹوں کا کام لیتے تھے۔ لیکن پہلی رانی کے انتقال کے بعد ان کا طور بدل گیا۔ بارہ برس کی عمر میں اس سے شادی ہوگئی تھی۔ اس کے انتقال کے بعد انہوں نے ایک اور شادی کی جو اب ان کی رانی تھی۔ اس شادی کے بعد انہوں نے اپنی عیاشیوں کو خیر باد کہہ دیا۔ یا یوں کہیے کہ نئی رانی صاحبہ نے انہیں لگام دے دی۔

ہم انہیں موٹے دادا کہتے تھے۔ اب ان کی شہرت ان سکولوں، ہسپتالوں اور یتیم خانوں کے حوالے سے تھی جن کے لیے انہوں نے دل کھول کر چندہ دیا تھا۔ یا محلات اور ہاتھیوں کے حوالے سے تھی۔ اور

نیز اس حوالے سے کہ وہ شاعروں اور گویوں کی بہت قدر افزائی کرتے تھے۔ سیاسی طور پر بہت بااثر تھے۔ مگر پردے میں رہ کر کام کرتے تھے۔ کونسلروں کا الیکشن ہو یا وزیر بنائے جانے کے معاملات ہوں، در پردہ ان کا اثر کام کرتا تھا۔

اور ہاں ایک مسٹر فری مینٹل تھے۔ دبلے پتلے، داڑھی چوکور، وکالت کرتے تھے۔ سنسکرت، عربی اور فارسی میں پیرے ہوئے تھے۔ عالم فاضل تھے۔ جب ناچنے والیوں کے کوٹھے پہ جاتے تو ہندوستانی لباس زیب تن کرتے۔ باقی اوقات میں پُرتکلف وکٹوریائی سوٹ بوٹ ڈالے رہتے۔ مشاعروں کا اکثر اہتمام کرتے جہاں شاعر اپنا اردو اور فارسی کلام سناتے۔ موٹر کار سے نفور تھا۔ ان کی سواری لینڈو تھی جس میں دو مجورے رنگ کے گھوڑے جتے رہتے۔ اور کیا مجال ہے کہ دونوں گھوڑوں میں کسی اعتبار سے بال برابر کا بھی فرق ہو۔ یوں وہ انگریزوں کی نظروں میں مشتبہ آدمی تھے لیکن ان کی دولت، ان کا اثر و رسوخ، ان کا علم و فضل، ان باتوں کی وجہ سے ان لوگوں کو ان کی حیثیت تسلیم کرنی پڑتی تھی۔ وہ ہمارے گورے دادا تھے۔

ہماری پھپھیاں گورے دادا سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ویسے وہ پردے کے معاملے میں اتنی سخت تھیں کہ مجال ہے کوئی ان کی آواز بھی سن لے۔ آواز تو دور کی بات ہے وہ تو ایسی احتیاط برتتی تھیں کہ ان کے لباس کی سرسراہٹ بھی کسی باہر والے کو سنائی نہ دے۔

بظاہر تو بابا جان اور ان تین دوستوں کے درمیان کوئی قدر مشترک تھی نہیں۔ بابا جان تو بہت سخت گیر اور خشک قسم کے آدمی تھے۔ ہاں ان کے بیچ ایک بات مشترک تھی۔ ایک عجب قسم کی نخوت اور ایک جذبہ تحکم۔ یہ لوگ ہمیشہ ایک اونچے مقام سے بات کرتے تھے۔ اس قسم کا رویہ رکھتے تھے کہ دوسرے انہیں بڑا آدمی جان کر ان سے رجوع کریں۔ اگر کبھی اپنے بلند مقام سے نیچے آتے تھے تو یہ گویا ان کی عنایت ہوتی تھی۔ ان کا حسب نسب، انہیں ملی ہوئی مراعات، ان کی دولت، ان سب باتوں نے مل کر ان میں یہ احساس برتری پیدا کیا تھا۔ لیکن پھر ان کا اپنا بھی کوئی جوہر، کوئی وصف تھا۔ اس کے بغیر وہ اپنی اس شان برتری کو برقرار کیسے رکھ سکتے تھے۔

ٹھاکر صاحب میں ایک تو حسِ مزاح تھی اور پھر وہ زندگی سے حظ اٹھانا جانتے تھے۔ لوگوں سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ ان باتوں کی وجہ سے ان میں ایک انسانیت آ گئی تھی۔ وہ لوگوں میں مقبول تھے۔ راجہ صاحب بلند خیال آدمی تھے۔ ان کی بلندی خیال ہی کا یہ اثر تھا کہ ان میں برائیاں تھیں مگر ان برائیوں میں چھچھورپن نہیں تھا، اور جو خوبیاں تھیں ان میں تکبر کا رنگ شامل نہیں تھا۔ اس سبب سے ان کی ذات میں عظمت کی ایک شان پیدا ہو گئی تھی۔ رہے مسٹر فری مینٹل تو ان کا مقام و مرتبہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ باقی لوگوں سے نرالے تھے۔ اس بنا پر تو انہیں خبطی ہی گردانا جاتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ ایک لائق وکیل تھے اور ان کے علم و فضل کا بہت شہرہ تھا۔

اور اگر بابا جان، جانے مانے جاتے تھے تو اس کی وجہ ان کی بلندی کردار تھی۔ اسی واسطے سے تو ان کی حکم چلانے کی روش نبھ رہی تھی۔ اور حکم ایسا کہ اس کے خلاف کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ گھر کے افراد سے لے کر دور پرے کے رشتہ داروں تک پورے قبیلے پر، بلکہ اس قبیلے سے نکلتی ہوئی شاخوں پر بھی، ان کا حکم چلتا تھا اور اسی بلندی کردار کا فیض تھا کہ جس شخص کا بھی ان سے واسطہ پڑتا تھا وہ دل سے ان کا احترام کرنے لگتا تھا۔ یوں سمجھو کہ شہر میں عام آدمی سے لے کر اعلیٰ سرکاری افسروں تک سب ان کی عزت کرتے تھے۔ یوں اور تعلقہ دار بھی تھے جن کی ریاستیں ان کی ریاست سے کہیں بڑی تھیں۔ ان سے بڑے دولت مند بھی موجود تھے، مگر شہر میں سب سے بڑھ کر ان کی بات چلتی تھی۔

بہرحال یہ چاروں شخصیتیں اپنے شہر کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔ وہ اس رنگ سے یہاں رچے بسے ہوئے تھے اور ایسا طور اپنایا ہوا تھا جیسے شہر انہی کا ہے۔

چوتھا باب

جب سے عابدہ پھپھی زنانے سے منتقل ہوئی تھیں ہم ان کے کمرے ہی میں کھانا کھاتے تھے۔ ہماری اپنی خادمائیں رضانو اور سلیمن خوان سجا کر خوش رنگ خوان پوشوں سے ڈھانک کر بڑے باورچی خانے سے لا کر مہمان خانے کے برابر والی پینٹری میں رکھ دیتیں۔ وہاں ہاٹ کیس میں کھانا گرم رہتا۔ اتنے میں ہم تخت پر دستر خوان بچھا کر اس کے گرد مستعد ہو کر بیٹھ جاتے۔

آج جو کچھ ہوا اس کا ہمارے دل و دماغ پر اتنا بوجھ تھا کہ ہمیں چپ لگ گئی تھی۔ ویسے یہ بات بھی بہت عجب اور نقلی نقلی سی لگ رہی تھی کہ ہم آج اکیلے کھانا کھا رہے تھے، یعنی صرف گھر والے دستر خوان پر بیٹھے تھے۔ اور چونکہ مردوں میں سے اس وقت کوئی نہیں تھا اس لیے استانی جی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئی تھیں۔ استانی جی نے میری دونوں پھپھیوں کو اردو فارسی اور عربی پڑھائی تھی۔ ہمیں بھی وہ اس وقت تک پڑھاتی رہیں جب تک بڑھاپے نے ان کے کانوں اور آنکھوں کو بالکل پٹ نہیں کر دیا۔

استانی جی شہر کے اس علاقے میں پیدا ہوئی تھیں جسے اصلی لکھنؤ کہنا چاہیے۔ یہ ان کا پشتینی گھر تھا۔ کتنی ہی نسلیں اس گھر میں پلی بڑھی تھیں۔ اس خاندان کے بزرگوں نے اپنے وقتوں میں دربار عالیہ کی خدمت کا فریضہ انجام دیا تھا اور دربار کے متوسلین کے گھروں میں بچوں کو پڑھایا تھا۔ استانی جی خالص لکھنؤ کا محاورہ بولتی تھی۔ اس زبان میں کتنی شیرینی تھی۔ کیا شستگی تھی، کیا نزاکت بیان تھی۔ محاکات کا رنگ بھی تھا، ظرافت کی چاشنی بھی تھی اور پھر لکھنوی آداب میں کیسی رچی بسی تھی۔ ہمارا غیر شستہ انداز بیان انہیں بہت اکھرتا تھا۔ لیکن اب ان میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ ہماری زبان کی اصلاح کرتیں۔

تمن بی بی بھی آج موجود تھیں۔ ان کے میاں بابا جان کے حلقۂ احباب میں شامل رہے تھے۔ جنگ کے آخری دنوں میں انہوں نے اپنی ساری دولت سٹے میں اڑا دی۔ آخر میں بالکل قلاش ہو گئے تھے۔ آخری ایام انہوں نے ہمارے ہی یہاں گزارے تھے۔ اٹھارہ سالہ اسد اور سولہ سالہ زاہد بھی ہمارے ہی گھر میں رہتے تھے۔ یہ دونوں ہمارے دور پرے کے رشتہ داروں کی اولاد تھے۔ ان یتیم لڑکوں کے ابا جان کو مذہب سے بہت لگاؤ تھا۔ جان و مال دونوں کو تحریک خلافت کی راہ میں قربان کر دیا۔ ان لڑکوں کو بچپن ہی سے یہ تعلیم ملی تھی کہ بدیشی مال پہ لعنت بھیجو اور کھدر پہنو۔ دونوں بہت خاموش قسم کے لڑکے تھے۔ چہروں پر زردی

ہوئی، آنکھیں اداس اداس۔ اسد تڑ میلا بہت تھا، زاہد کی طبیعت میں افسردگی رچ گئی تھی۔ باہر کی دنیا سے اگر ہمارا کوئی رشتہ تھا تو وہ اسد ہی کی معرفت تھا۔ باہر کے ہمارے کام وہی کرتا تھا۔ جن چیزوں کی خریداری کے سلسلے میں ہم نوکروں پر اعتبار نہیں کر سکتے تھے وہ چیزیں ہم اس سے منگواتے تھے۔ اسد شعر بھی کہتا تھا۔ یہ شعر ہمیشہ ایک اداسی اور تشکیک کے رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔ زہرا اسے دیکھ کر کبھی مسکرا پڑتی تو اس کے پتلے ہونٹ بھنچ جاتے اور آنکھوں میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی جیسے وہ آنکھیں نہ ہوں، اس کے شعر ہوں۔

بابا میاں نے اپنا کھانا اپنی کوٹھری ہی میں کھایا تا کہ ان کی شام کی عبادت میں کھنڈت نہ پڑے۔

ہم نے بہت خاموشی سے کھانا کھایا۔ استانی جی کھاتے ہوئے زور زور سے سانس لے رہی تھیں۔ اور کبھی کبھی تو بالکل ایسے لگتا کہ سانس کی تکلیف سے ان کا دم گھٹ جائے گا۔ ان کی عمر کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ لیکن زندگی کے معاملات پر ان کی گرفت اب بھی اسی طرح مضبوط تھی۔ تجن بی بی کا حال یہ تھا کہ سر ہلتا تھا اور ہاتھوں میں ارتعاش تھا کہ ہڈی انگلیوں سے نوالہ پکڑ تو لیتی تھیں مگر پوپلے منہ تک اسے لے جانے میں سخت مصیبت پڑتی تھی۔ لیکن ماشاءاللہ بھوک خوب لگتی تھی اور مرغن غذا مرغوب تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں بدہضمی سے انہیں ڈکاریں آتی رہتی تھیں۔ پھر طرح طرح کے چورن استعمال کرتیں۔ چورن کے یہ نسخے انہیں اپنے ابا جان سے ورثے میں ملے تھے۔ ان کے ابا جان حکیم تھے۔ دربار سے جو حکیم وابستہ تھے ان میں وہ بھی تھے۔

کھانا حکیمن بوا نے پکوایا تھا۔ انہی نے لگوایا بھی تھا۔ لیکن آج رات تو انہوں نے بھی سب خانساماں کی ہٹ دھرمی کی شکایت کی، نہ نوکرانیوں کی سستی پر حرف گیری کی، نہ ہمیں نظر بد سے محفوظ رہنے کے لیے دعا پڑھی۔ یہ دعا تو ان کا معمول تھی۔ انہیں یقین تھا کہ تجن بی بی کی نظر بہت خراب ہے۔ اس کا توڑ انہیں کرنا ہوتا تھا۔ اور ہاں آج انہوں نے ہماری بھوک پر بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا ورنہ یہ فقرہ تو ان کی زبان پر دھرا رہتا تھا کہ "اے لڑکیوں! تم کھانا کھاتی ہو کہ چڑیوں کا چوگا چگتی ہو۔ ایسے کھاؤ گی تو میری بات یاد رکھنا مریل مرغیاں بن جاؤ گی۔"

آج تو ایسا لگ رہا تھا کہ ہمارا آپس میں کوئی تعلق کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ عابدہ پھپھی کی طرف دیکھنے کی میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ لیکن جب ہم کانسی کی اس چلمچی میں، جسے رمضانو نے تھام رکھا تھا، سلور کے اس لوٹے کی ٹونٹی سے گرتے گرم پانی سے، جسے سلیمن نے سنبھالا ہوا تھا، ہاتھ دھو چکے اور کلی کر چکے اور حکیمن بوا نوکروں کو کھانا دینے کے لیے چلی گئیں اور وہ دونوں بوڑھیاں ہمیں اللہ کے حفظ و امان میں دیکر کرسٹ پٹ کرتی کمرے سے نکل گئیں اور زہرا بھی اپنی اماں کے ساتھ رخصت ہوگئی، یعنی ماجدہ پھپھی کے ساتھ جو یہ کہہ کر اٹھ گئیں کہ آج وہ بہت تھکی ہوئی ہیں اس لیے جلدی نماز پڑھ کر سو جائیں گی، تو جب سب

ایک ایک کر کے چلے گئے تو بال آخر عابدہ پھپھی نے زبان کھولی "لیلیٰ، ادھر آؤ۔"

میں ان کے بستر کے قریب جا کھڑی ہوئی "جی پھپھی جان!" میں نے اتنا ہی کہا اور بس ایک چھچھلتی سی نظر ان کے چہرے پر ڈالی جو ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھلکتی ہوئی پریشانی کی وجہ سے پیلا پیلا دکھائی پڑ رہا تھا۔

"لیلیٰ" "تمہیں وہ دن یاد ہے جب مہترانی نے تمہیں سلام کیا تھا اور تم نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا؟"

اس ناخوشگوار یاد نے جیسے میری زبان سی دی ہو۔

"میں نے تم سے اس بات پہ معافی منگوائی تھی۔ اُس وقت تم دس برس کی تھیں۔ اب خیر سے تمہاری کیا عمر ہے؟"

"آج میں پندرہ برس کی ہو گئی۔"

"آج!" انہوں نے لمبا سانس لیا "اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ جُگ جُگ جیو! اب تم بچی تو نہیں ہو۔ ماشاء اللہ سیانی ہو گئی ہو۔ یاد رکھو کہ اچھے آداب ہی سے پتہ چلتا ہے کہ تربیت اچھی ہوئی ہے۔ کل تم اپنے چچا میاں سے جب وہ یہاں آئیں گے معافی مانگو گی۔"

"لیکن میں نے کون سی غلط بات کہی تھی؟" میں پھٹ پڑی۔

"بڑوں کا ادب کرنا تمہارا فرض ہے۔ کچھ ادب آداب ہوتے ہیں۔ اب میں ان کی الف، ب، ت تو تمہیں نہیں پڑھاؤں گی۔"

"انہوں نے بہت زیادتی کی تھی۔" میں تڑپ کر بولی۔ اور پھر یہ سوچ کر کہ ادھر اس کا احساس ہی نہیں ہے، میں افسردہ ہو گئی۔

"بیٹی! اس دنیا کے کچھ آداب ہیں جنہیں چون و چرا کیے بغیر بجالانا پڑتا ہے۔ تم پر بہت ذمہ داری ہے۔ باہر کے اثرات اپنی جگہ مگر خاندانی روایات کو کبھی فراموش مت کرنا۔ اللہ کی مرضی میں کسی کا کیا دخل ہے۔ تمہارے سر سے تمہارے ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ پھر تمہاری ذمہ داری مجھ پر آ گئی۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ تم پر انگلیاں اٹھائیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے تمہیں اچھا نہیں اٹھایا۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم پیدا کس خاندان میں ہوئی ہو۔ مجھے تم سے بس اتنا ہی کہنا تھا۔ اب تم جاؤ۔ جا کے اپنی نماز پڑھو، دعا مانگو۔"

محسن چچا سے جو اس وقت یہاں موجود نہیں تھے مجھے سخت نفرت کا احساس ہو رہا تھا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ پھپھی جان میرے واسطے سے ان سے ہم کلام ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جو ان کے اندر اندوہ میں لپٹا ہوا ایک نرم گوشہ چھپا رکھا ہے اسے میں کسی طرح دیکھ پاؤں، اور اس تمکنت کو بھی جس کا عکس صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسی چیز نے تو میری زبان بند کر دی تھی۔ آنسو نکلنے کے بجائے

میری تیوری چڑھ گئی۔ جی چاہا کہ کہوں جس طرح زہرا اٹھی ہے اس طرح آپ نے مجھے کیوں نہیں اٹھایا۔ کیوں مجھے ان لڑکیوں کے بیچ بھیج دیا جو اور ہی طرح کی ہیں۔''

بجائے اس کے کہ کمرے میں جا کر نماز پڑھوں میں حکیمن بوا کی طرف نکل گئی۔ اس وقت مجھے کسی ایسے کی تلاش تھی جو مجھے سمجھے اور پہچانے۔ باہر ہوا پاک صاف تھی۔ اندھیرے میں لان سے گزرتے ہوئے مجھے اپنے قدموں تلے کسی نرم نرم چیز کا احساس ہو رہا تھا۔

''یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم پیدا کس خاندان میں ہوئی ہو۔'' جب ہم چھوٹے چھوٹے تھے تو استانی جی ہمیں ہمارے پرکھوں کے نام رٹایا کرتی تھیں۔ زہرا کو میرے مقابلے میں زیادہ نام یاد تھے۔ مجھے تو اپنے پرداد اتک کا نام دوہرانا دوبھر لگتا تھا۔ لیکن اسی زمانے سے یعنی جب پانچ سو برس پہلے ہمارے مورث اعلیٰ نے شمال کے پہاڑوں کی طرف سے درۂ خیبر کے راستے ورود کیا تھا۔ جب قافلہ سرسبز وادیوں کو روندتا مارامار کرتا ادھر جنوب کی سمت میں آ کر خیمہ زن ہوا تھا تو بس اسی وقت سے ان پرکھوں کی روحیں ہم پر تعینات تھیں۔ ہمارے قول و فعل اور فکر و خیال سب پر ان کا پہرہ تھا۔

حکیمن بوا اپنے بان سے کسے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ اس پلنگ نے تو کوٹھری میں کوئی جگہ ہی نہیں چھوڑی تھی۔ چھوٹی سی تو کوٹھری تھی۔ حکیمن بوا کے پاس جو تھوڑا بہت سامان تھا وہ سب بھی اسی کوٹھری میں ٹھنسا ہوا تھا۔ سلاخوں والی چھوٹی سی کھڑکی کی نگر پر لالٹین رکھی ٹمٹما رہی تھی۔ اس کی روشنی میں باہر کی پرچھائیاں اندر پڑ رہی تھیں۔ کونے میں رکھے ٹین کے ٹرنک پر، طاق میں رکھے برتنوں پر، کڑھائی، توے، کفگیر پر، دیوار کے برابر برابر کھنچی ہوئی ڈوری پہ لٹکے ہوئے کپڑوں پر، غرض سب چیزوں پر یہ پرچھائیاں حرکت کرتی نظر آ رہی تھیں۔ کوٹھری میں محبت و شفقت کی گرمائی تھی۔

''بیٹی! تمہیں پریشانی کیا ہے؟ آؤ بیٹھو۔'' انہوں نے تانبے کی رکابی اور پیالے کو جس سے ابھی ابھی انہوں نے کھانا کھایا تھا ایک طرف سرکایا۔ کھرے پلنگ پر ایک پتلی سی دھاری دار دری بچھائی۔ پھر بولیں ''آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔''

میں پٹی پہ بیٹھ گئی۔ اس زاویے سے بیٹھی تھی کہ میری پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور صحن والی دیوار میں لگے بجلی کے قمقمے کی روشنی ایک لکیر کی صورت کوٹھری میں آ رہی تھی۔ نل سے پانی کے بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ نوکرانیاں اپنے نہانے دھونے کے اس نلکے پر اس وقت برتن بھانڈے دھو مانجھ رہی تھیں۔ پانی کی آواز کے ساتھ ہی رمضانو اور سلیمن کے بڑبڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شفاف خنک رات نے ان آوازوں کو کتنا نکھار دیا تھا۔

''بوا! میری امی اور میرے ابا جان، کس طرح کے تھے وہ۔''

مجھے ایسی کوئی کرید تو نہیں تھی، بس اس وقت میں ذرا ڈھارس چاہتی تھی۔ یہ ڈھارس مجھے حکیمن بوا

سے ملتی تھی۔ جتنی دفعہ بھی میں ان کے پاس جاتی اور جتنی دفعہ بھی کرید کرید کے سوال کرتی وہ ایسی سادگی سے جواب دیتیں کہ آگے سوال کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ بس ان کے جوابوں سے میری ڈھارس بندھ جاتی تھی۔

''تمہاری امی؟ اے بٹیا میں کیسے بتاؤں کہ کیسی تھیں۔ بس اپنے آپ کو دیکھ لو۔ ایسی ہی تھیں وہ۔ جیسے ٹلیا کے نتھرے پانی میں چاند دکھائی دیتا ہے۔ وہ خود چاند تو نہیں ہوتا، اس کا عکس ہوتا ہے۔ بس ایسے ہی بٹیا! تم ان کا بالکل عکس ہو۔''

''اور میرے ابا جان؟''

''بٹی! ان کی کیا پوچھو ہو، وہ تو بالکل شہزادے تھے۔ ارے اگر وہ پرانے دھرانے کپڑے بھی پہن لیتے تو ان پر ایسے سجتے تھے کہ جیسے شاہی پوشاک ہو اور دل تو ان کا اتنا بڑا تھا کہ پوری دنیا اس میں سما جائے۔''

''اور کیا وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے؟''

''محبت سی محبت۔ میں تو جانوں کہ نگوڑے فرشتے اس محبت کو دیکھ کر جل مرے۔ اسی جلاپے میں انہوں نے انہیں تم سے چھین لیا۔''

بار بار ٹھنڈا سانس بھرتیں۔

''بوا! ان کے ہوتے ہوئے تو اس گھر کا نقشہ اور ہی طرح کا ہوگا۔ ہیں نا؟''

''ہاں اُس زمانے میں تو اس گھر پہ نور برستا تھا، نوتیں ہو رہی ہیں۔ گانا بجانا ہو رہا ہے۔ لوگ ہنس رہے ہیں، خوش ہو رہے ہیں۔ گھر میں ہر چیز کی افراط ہے۔''

تھرکتی پرچھائیوں والی اس کوٹھری سے میں بوا کے لفظوں کی سبک لہروں میں بہتی ہوئی اس زمانے میں جا نکلی جب نور ہی نور تھا اور فضا محبت سے لبریز تھی اور ہر ساعت ایک جشن کا سماں دکھاتی تھی۔

شب برات: آتش بازی سے بھری ٹوکری۔ ہوائیاں جن کے چھوٹنے کے ساتھ فضا میں رنگ برنگے ستارے سے بکھر جاتے۔ لوٹا جو دیا سلائی دکھائے جانے پر ایسی آواز پیدا کرتا جیسے سانپ پھنکار رہا ہے۔ تیزی سے چکراتا سرسراتا بچوں کے قدموں کے بیچ گھس جاتا اور بچے اچھلتے چیخیں مارتے۔ پٹاخے جن کی دھوں دھاں سے آنکھیں بند ہو ہو جاتیں۔ پھلجھڑیاں، سفید سفید تار، کس شوق سے اسے ہاتھ میں تھام کر دیا سلائی دکھائی جاتی اور پھر اس میں سے ننھے منے ستارے پھوٹ نکلتے۔

دِوالی: دیوں میں روئی کی بنی ہوئی بتیاں تیل سے شرابور، ان کی ٹمٹماتی نرم نرم لو۔ طاقوں میں، محرابوں کی گگروں میں، چھتوں پر، منڈیروں پر، اس کنارے سے اس کنارے تک ٹمٹماتے دیوے ہی دیوے۔ قندیلیں، قمقمے، روشنی اور روشنی، روشنی ہی روشنی۔ اور لوگ آنگنوں میں، چھتوں پر، سبزہ زاروں میں لوگ لپک جھپک آ جا رہے ہیں۔ بھاگم دوڑ، کھوے سے کھوا اچھل رہا ہے۔

عید: ارے وہ دیکھو۔ وہ جو درخت ہے اس کی پھننگ پہ چاند نظر آ رہا ہے۔ عید کا چاند نظر آ گیا۔

ابا جان آپ ہمیں اونچا اٹھائیں، اور اونچا۔ ہاں دکھائی دے گیا۔ گرجا گھر کی لاٹھ پر ٹکا ہوا لگتا ہے۔ ارے وہ تو شاخوں کی بیچ میں سے دکھائی دے رہا ہے۔

عید: برس کے برس والا عیدی غسل۔ نئے نئے جوڑے، ریشمیں، چمکتی دمکتی مہکتی سنہری روپہلی کام والی سرسراتی پوشاکیں۔ ہر فرد خوشی سے پھولا ہوا ہے، کھلا پڑ رہا ہے، معطر معطر ہے۔ عید کی نماز، میلے ٹھیلے، گلے مل رہے ہیں، پیار کیا جا رہا ہے۔ عید مبارک کا غل ہے۔ یار احباب، عزیز رشتہ دار ملنے کے لیے آ رہے ہیں۔ عیدی، چاندی کے روپے مٹھی میں کس شوق سے دبائے ہوئے ہیں، کس احتیاط سے انہیں سنگھوا کر رکھا جاتا ہے۔ سویوں سے لبریز پیالے۔ لمبے لمبے سنہری دھاگوں جیسی سویاں، شہد ایسی میٹھی، چاندی کے ورق سے سجی ہوئی، لذیذ ایسی کہ کھانے والا ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔ گرم دودھ سے بھرے جگ۔ پرتوں میں جمی ہوئی ربڑی۔ کیا دسترخوان ہے کہ مہمانوں کا منتظر ہے۔ مہمان آ کر گلے ملتے ہیں۔ روپیوں کی صورت میں عیدی بانٹتے ہیں۔

اور دوسری عید جسے بقر عید کہتے ہیں۔ خیر اس عید میں وہ چمک دمک نہیں۔ یہ تو خون میں لت پت ہے۔ بکرے دنبے بندھے کھڑے ہیں اور ممیا رہے ہیں۔ قریب ہی گڑھا کھدا ہے۔ یہاں ان کو ذبح کر کے قربانی کی جائے گی۔ ''ابا جان! یہ چھوٹا سا میمنا، اس کی گردن پہ بھی چھری پھر جائے گی!'' ''بیٹی بہادر بننا سیکھو۔ جو شے تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہو اس کی قربانی کی ہمت پیدا کرو۔ حضرت ابراہیم نے اپنے پیارے بیٹے کی قربانی دینے کا عہد کیا تھا۔ اللہ کی راہ میں قربانی دیتے ہوئے رونا نہیں چاہیے۔''

قصائی ذبح کیے ہوئے جھولتے بکروں دنبوں کے گھونسے مار مار کر گوشت سے کھال جدا کر رہا ہے۔ نئے کپڑوں اور دعوتوں کی خوشی اتنی ہے کہ کسی کو اور کوئی بات یاد ہی نہیں ہے۔ بکروں کی رانوں کو کئی کئی دن تک بھون بھون کر کھایا جائے گا۔ چٹ پٹے کباب تیار کیے جا رہے ہیں۔ نوکرانیوں کی آنکھوں میں حیرت ہے اور تجسس ہے۔ خوان پوشوں سے ڈھکی گوشت کی بوٹیوں سے بھری سینیاں لے لے کر گزر رہی ہیں اور امی اور بوا آنگن میں ستولوں پر بیٹھی حساب لگا رہی ہیں کہ کس کس گھر سے گوشت آیا ہے۔ پھر ان کی گنتی ہوتی ہے کہ کن کے گھر گوشت کے حصے بھجوانے ہیں۔ گوشت عزیزوں، رشتہ داروں اور ملنے والوں کے گھروں میں بھجوایا جا رہا ہے۔ مسجدوں اور یتیم خانوں میں بھجوایا جا رہا ہے۔ غریبوں مسکینوں اور نوکروں میں بانٹا جا رہا ہے۔

جس دنبے کی قربانی ہوئی ہے وہ اب کسے یاد ہے۔ دعوتوں کی ملاقاتوں کی گہما گہمی ہے۔ اس گہما گہمی سے ہٹ کر اور کس طرف دھیان جاتا ہے۔

ہولی: نوکروں کے مردانہ کوارٹروں سے اور آس پاس کی گلیوں سے آوازیں آ رہی ہیں۔ ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ نشے میں دھت ٹولیاں گا بجا رہی ہیں۔ بوا ہمیں ڈانٹ ڈپٹ کر رہی ہیں کہ گیٹ پر مت جائیو۔ کلمو ہے کیچڑ مٹی میں لت پت، رنگ میں شرابور شور مچاتے پھر رہے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کون ہندو ہے،

کون مسلمان ہے۔ دن ڈھلے دوست احباب لان میں اکٹھے ہو کر ہولی کھیلتے ہیں۔ رنگ کے پانی سے بھری ناندیں جب تک خالی نہ ہو جائیں اور ہاتھ پچکاری چلاتے چلاتے شل نہ ہو جائیں اُس وقت تک یہ تھمیں گے نہیں۔

''اچھی بی بی! تمہاری تو نیند سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔'' بوا نے میرا چہرہ لالٹین کی طرف موڑ دیا۔ ''چلو میں تمہیں کمرے تک پہنچا آؤں۔ اپنے بستر میں لیٹ کر آرام سے سوؤ۔''

''نہیں بوا! آپ کیوں زحمت کرتی ہیں۔ آپ تو خود تھکی ہوئی ہوں گی۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔'' اور جب میں نے ان کے گلے میں باہیں ڈالیں تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ بار بار ٹھنڈا سانس لے رہی ہیں۔

میں جانے کے لیے مڑی تو انہوں نے میرے پاس آ کر دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام لیا۔ پھر انہوں نے چٹ چٹ میری بلائیں لیں۔ بولیں ''اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے۔''

میں ایسے چلی جیسے کوئی کیفیت ہے کہ مجھے کھینچے لیے جا رہی ہے۔ اسی عالم میں صحن سے گزری جہاں روشنی نہیں تھی۔ پھر اس بڑے کمرے میں سے ہوتی ہوئی چلی جو خالی پڑا تھا۔ اور جہاں صرف بان کی دو چار پائیاں پڑی تھیں۔ ان چار پائیوں پر استانی جی اور رحمن بی بی لپٹی لپٹائی ایسی پڑی تھیں جیسے وہ میاں ہوں۔ پڑی سنا رہی تھیں اور خرانٹے لے رہی تھیں۔ یہاں سے نکل کر میں دالان میں ہولی جہاں پتھر کا فرش میرے قدموں کی چاپ سے گونجنے لگا۔ کتابوں کی خاموش الماریوں اور تصویروں کے برابر سے گزرتی ہوئی چوں چوں کرتے دروازے سے نکل کر خاموشی اور سکون سے انتظار کرتے ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔

میں نے بجلی جلائی اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ جو اندھیرے میں میرا دم بند ہوا جا رہا تھا اس سے مجھے رہائی مل گئی ہے۔

صاف ستھرا خالی پڑا بستر، لمبی چوڑی آرام کرسیاں، ڈریسنگ ٹیبل کے حیران آئینے، جیسے سب ہی انتظار کے عالم میں ہوں۔ اگر میں نے بے حرکت پردے اٹھا کر دوسرے کمروں میں جھانکا ہوتا تو وہاں کی خاموش فضا میں یہی عالم نظر آتا۔ اب یہاں ان چند روزہ مہمانوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا جنہیں ان کمروں میں تھوڑا قیام کرنے کا موقع میسر آیا تھا۔ یہ بھرے پرے کمرے اچانک ہی خالی ہو گئے تھے۔ لیکن گزرتے ماہ و سال نے رفتہ رفتہ اس حادثے کے اثرات کو بہت حد تک کم کر دیا تھا۔

میرے دل میں بے تحاشا ایک آرزو پیدا ہوئی کہ کسی طرح ان کمروں کو پھر سے آباد کرنے کا سامان کیا جائے اور یہاں پھیلی ہوئی خاموشی سانس لینے لگے۔ بس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ آدمی کے جذبۂ ایمانی میں شدت اور آرزو میں یکسوئی ہو۔ اگر دل و دماغ کو باقی اور سارے خیالات سے پاک صاف کر لیا جائے تو پھر انہیں معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک رات کی بات ہے کہ آسمان پر ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ میری امی نے مجھے گود میں بٹھایا اور سنانے لگیں کہ ایک شخص نے دنیا کی ساری

باتوں کو اپنے دل ودماغ سے خارج کر دیا یہاں تک کہ اللہ کی یاد کے سوا اس کے دل اور دماغ میں اور کوئی بات اور کوئی خیال رہا ہی نہیں۔ تب اللہ میاں نے اس کی سنی اور ایک شب اس کے خواب میں حضور پاک آئے اور اس سے ہم کلام ہوئے۔

اور اگر اس وقت میری آرزو آلائشوں سے پاک ہو اور اس میں پوری شدت ہو تو جس ندی نے انہیں مجھ سے چھین کر نگل لیا ہے اس کی تھاہ سے میں انہیں نکال کر لا سکتی ہوں۔

لیکن جب پردوں میں لرزش پیدا ہوئی تو مجھے اپنے دل کے کسی گوشے میں چھپے ہوئے ڈر کا احساس ہوا اور اسی کے ساتھ میرے اندر یہ خواہش بھڑک اٹھی کہ میں ان دروازوں کی قید سے نکل کر چاندنی میں نہائے ہوئے برآمدے اور صحن میں جا کر سانس لوں۔ پھر اپنے کمرے میں چلی جاؤں اور ان لوگوں سے جا ملوں جنہیں ابھی موت نے نہیں چھوا ہے۔

لیکن اس سے بڑھ کر ایک اور خوف بھی تو مجھے ستا رہا تھا۔۔۔۔۔ کل جو مجھ سے واہیات سوال جواب ہوں گے ان کا خوف۔ بس اسی خوف میں میں نے بٹن دبا دبا کر روشنیاں گل کیں اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

پانچواں باب

جب ڈاکٹر نے صبح کے معائنے کے بعد عابدہ پھپھی کو بتایا کہ بابا جان کی حالت ماشاءاللہ اب بہت سنبھل گئی ہے تو وہ جو دن کا ایک ایک پل بھاری گزر رہا تھا اس سے نجات مل گئی۔ ہم سب ہی کو ایسا لگا کہ سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ بلکہ زہرا اور میری تو یہ کیفیت تھی کہ ہم نے باتیں کرتے کرتے کئی مرتبہ ٹھٹھے بھی لگائے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد عابدہ پھپھی کہنے لگیں کہ نگوڑے پچھلے دن تو ایسی پریشانی سے گزرے کہ کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ گھر میں کھانے پینے کی چیزیں ختم پر ہیں۔ حلیمن بوا سے بولیں کہ "اے بوا! کچھ حلوا بناؤ۔ کچھ میٹھے میں تو ہو۔ اور کچھ بسکٹ بنالو۔ میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں گی۔" پھر انہوں نے گودام والے کمرے کے پاس ہی نوکرانیوں والے آنگن میں ایک چلتاؤ قسم کا اینٹوں کا چولہا بنوایا اور اس کے اردگرد پیڑیاں رکھوالیں۔

انڈوں کو پھوڑنے میں مجھے بہت مزہ آتا تھا۔ ہلکے ہلکے چھلکوں کو چھلکوں کی چمکتی چمکتی ڈھیری میں پھینکا، زردی کو چینی کے بڑے سے پیالے میں ڈالا، اوپر سے اس میں مکئی سے دودھ انڈیلا سفید دودھ میں گھلتی ہوئی زردی کتنی اچھی لگتی تھی۔

ایک کونے میں بیٹھی رمضانو اور مالی کی بیوی گیہوں پیس رہی تھیں۔ کل ہی تو زمینوں سے یہ گیہوں آیا تھا۔ اور وہ جو مہینے کے مہینے ایندھن، باقی دوسرے اناج اور گھی آیا کرتا تھا وہ بھی گیہوں کے ساتھ آیا تھا۔ دونوں چکی کے گرد اس طرح بیٹھی تھیں کہ ایک ٹانگ پھیلا رکھی تھی اور دوسری کو سمیٹا ہوا تھا۔ چکی کے بیچ سیدھے کھڑے موٹے سے ہتھے کو انہوں نے مٹھیوں میں جکڑ رکھا تھا اور اس طرح گھما رہی تھیں کہ ساتھ میں چکی کے اوپر کا پاٹ بھی گھوم رہا تھا اور اس کے تال میں ان کے بدن بھی جیسے جھول رہے ہوں۔ رمضانو مٹھی میں بھر بھر کر سنہری گیہوں اوپر والے پاٹ کے سوراخ میں ڈال رہی تھی۔

استانی جی اور جمن بی بی نے اپنی کوٹھری کے آگے بانوں والی ایک کھٹیا بچھا رکھی تھی۔ یہ کھٹیا اتنی ہلکی تھی کہ اندر سے باہر آسانی سے گھسیٹی جا سکتی تھی۔ اس وقت یہاں وہ دونوں اپنے دوپٹوں میں سمٹی بیٹھی تھیں۔ اپنی بوڑھی ہڈیوں کو دھوپ میں سینک رہی تھیں۔ منہ ہی منہ میں کوئی دعا پڑھ رہی تھیں۔ ساتھ میں تسبیح کے

دانے گنتی جاتی تھیں۔آنکھیں آنگن کی چہل پہل کو تک رہی تھیں۔لگتا تھا کہ اپنے بیتے برسوں کے فاصلے سے اس رونق کو دیکھ رہی ہیں۔

ماجدہ پھپھی کہنے لگیں کہ زہرا اور لیلیٰ کام میں ہاتھ تو کیا بٹائیں گی، الٹی کھنڈت ڈالتی ہیں۔بس ہم نے سوچا کہ وہ جو ہمارے دوپٹے بہت دنوں سے رکھے ہیں کہ سفید ہونے کی وجہ سے انہیں اوڑھا ہی نہیں تھا، انہیں آج رنگتے ہیں۔سو ہم جڑاؤ کام والے تسلے کو اور ساتھ میں پانی اور رنگوں کی پڑیاں لے کر آنگن کے پرلی طرف والے کونے میں جا بیٹھے، یہ سوچ کر کہ دوسرے پریشان نہ ہوں۔

کچھ دوپٹے تو ہم نے یہ سوچ کر ہرے رنگ لیے کہ محرم میں اوڑھنے کے کام آئیں گے۔محرم میں تو ہرا رنگ ہی چلتا ہے۔باقی دوپٹے نارنجی رنگ ڈالے۔اور یہ رنگ تو ہم نے ہار سنگھار کے پھولوں سے کشید کیا تھا۔ویسے ہمارا مرغوب رنگ تو دھنک کے لہریوں والا رنگ تھا۔دھنک کے لہریے کے لیے کیا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔الگ الگ رنگ والے پانی سے بھرے ساتھ تسلوں میں دوپٹے کو بہت احتیاط سے ڈبو کر نکالا جاتا تھا۔

زہرا اور میں دوپٹے رنگ کر لان میں لے گئے اور انہیں احتیاط سے گھاس پر پھیلا دیا۔

''اگر نندی ہوتی تو وہ تھوڑا ہمارا ہاتھ بٹا دیتی۔''

''وہ گاؤں ہی میں رہے تو اچھا ہے۔''

''بیچاری نندی۔''

''ارے تم کیا فضول باتیں کرتی ہو۔اسی پر ترس کھانے کو رہ گئی ہو۔''

ہم نے اس نفیس ململ کے دوپٹے کو اس طرح پھیلایا کہ ایک طرف سے دو کونے میں نے پکڑے، دوسری طرف سے دو کونے زہرا نے پکڑے اور ہم نے اسے آہستہ آہستہ دھوپ میں جھلانا شروع کیا۔لگ رہا تھا کہ ہری ہری گھاس پہ دھنک لہرا رہی ہے۔

آنگن کے دوسرے کنارے پر مہترانی جھاڑو دے رہی تھی اور جھنڈ مرنڈ پتوں کو سمیٹ رہی تھی۔ اس کے ساتھ دم کی طرح دو بچے لگے ہوئے تھے، ننگ دھڑنگ، سوکھے دبلے ہاتھ پیر، بڑے بڑے پھولے پیٹ، ناک بہتی ہوئی اور بڑی بڑی کالی آنکھیں۔جھاڑو دیتے دیتے وہ ہمارے قریب آ گئی۔

''تو اندھی ہے؟'' زہرا نے چیخ کر کہا ''گدھی کہیں کی۔ہم پہ دھول اڑا رہی ہے۔دیکھ نہیں رہی کہ ادھر دوپٹے پھیلے ہوئے ہیں اور ابھی گیلے ہیں۔جھاڑو دینے کے لیے یہی وقت رہ گیا تھا۔''

''بٹیا، ہمن کو ماف کر دو۔گھر کے بھیتر کام بہوت ہے۔یاں پہ جھاڑو دینے کے لیے یہی وخت ملے ہے۔''

مجھے بہت برا لگا کہ جیسے میں ہی مجرم ہوں۔تھوڑا تعجب بھی ہوا کہ مہترانی غریب کیسی بجھ گئی۔غصے کی تو وہاں رمق بھی نہیں تھی۔

''زہرا تمہیں اس بری طرح ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔''

زہرا نے کندھے اچکائے''بری طرح؟وہ تو اس ڈانٹ پھٹکار کی عادی ہے۔''

میں بس طرح دے گئی۔ ذرا موقع دے دیتی تو وہ پھر میری کتابوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیتی، ان کتابوں کا جنہوں نے مجھے انسانی وقار کا پاس کرنا سکھایا تھا۔

زہرا نے مجھے خبردار کیا'' یہ لوگ زمین ہی میں رُلتے رہیں تو ٹھیک رہتے ہیں۔ زمین سے اک ذرا سا اٹھانے کی کوشش کرو تو وہ پھر تمہارے سر پہ ناچنے لگتے ہیں۔''

''یہ تم سے کس نے کہا؟ تمہارے عالی قدر محسن چچا نے؟''

''نہیں بی بی۔'' زہرا نے تضحیک کے لہجے میں کہا'' یہ آپ کے دادا حضرت نے، یعنی کہ بابا جان نے ارشاد فرمایا تھا۔ اُس وقت کہا تھا جب کسان یہ کہہ رہے تھے کہ ہم لگان نہیں دیں گے۔''

''ان میں بہت سے ایسے تھے کہ ادا کر ہی نہیں سکتے تھے۔''

''وہ موٹی توند والے بنئے کا بیٹا تو ادا کر سکتا تھا جس کے باپ نے پورے گاؤں سے پیسہ اس طرح کھینچا تھا جیسے گنے سے رس نچوڑتے ہیں۔ بھنو، اگر ان سے لگان وصول نہ کیا جائے تو یہ تمہارے خیالاتِ عالیہ، یہ ٹھاٹ باٹ کہاں سے ہوں گے۔'' زہرا باتیں بھی کرتی جا رہی تھی اور دھنک رنگ ململ کے دوپٹے کے سروں کو جھلاتی بھی جا رہی تھی۔ جھلاتے ہوئے اس سمت میں لے جاتی جس سمت میں سنگِ مرمر کا فوارہ تھا، سبزہ زار تھا اور وہ محرابی، منقش، جھلملیوں سے آراستہ، اونچے ستونوں والی وسیع عمارت۔ دوپٹے کو جھلاتے جھلاتے وہ مسز مارٹن کو دیکھ کر ٹھٹک گئی جو سامنے سیڑھیوں پر کھڑی تھیں۔

مسز مارٹن نے پھول دار لباس پہن رکھا تھا۔ پروں سے آراستہ ہیٹ سر پر تھا۔ وہ لپک کر ہماری طرف آئیں۔ کیا کہہ رہی تھیں، یہ تو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ ان کی آواز جیسے ان کے نفیس سوتی اونی لباس میں دب گئی ہو۔ ہم تو انہیں دیکھ کر خوشی سے کھلکھلا اٹھے۔ پھر بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔

''بیبئے میری بچیو! کیسی پیاری پیاری صورتیں ہیں۔ ہائے تم کتنی بڑی ہو گئی ہو۔ وقت تو یوں گزرتا ہے، پتہ ہی نہیں چلتا کیسے گزر گیا۔'' پھر وہ پیاری سی ہنسی ہنسیں۔

ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ بس کھی کھی ہنسنا شروع کر دیا۔

مسز مارٹن کے بلند و بالا فراخ سینے پر عنبریں دانوں کی ایک جھالر لہرا رہی تھی۔ وہ خراماں خراماں ایسے چلی آ رہی تھیں جیسے کوئی چھوٹا موٹا جنگی جہاز پھریرا اڑاتا چلا آ رہا ہو۔ نیلی نیلی آنکھیں، بھوؤں کے بال غائب، سر کے بال مکھن نکلے دودھ کی طرح نرم نرم، ہونٹ پتلے پتلے اور نیلاہٹ لیے ہوئے۔ مشرق میں چونکہ بہت وقت گزارا تھا اس وجہ سے ان کی جلد کسی قدر خشک اور بھدی ہو گئی تھی اور چھوٹی چھوٹی رگوں نسوں کے جالے سے بن گئے تھے۔

''اور ہماری بیگمیں کہاں ہیں؟ ڈیئر عابدہ اور ڈیئر ماجدہ۔'' انہوں نے یہ دونوں نام اس طرح لیے کہ شروع کے حرف علت کو دبا دیا اور آخر کے حرف علت کو بے ہنگم طور پر کھینچتی چلی گئیں۔

''نوکرانیوں والے صحن میں کچھ پکا رہی ہیں۔'' میں نے کہا

زہرا نے اس دو پٹے کو جو سوکھ چکا تھا تہہ کرتے ہوئے بڑے اشتیاق سے کہا'' میم صاحب! میں آپ کو وہاں لیے چلتی ہوں۔''

''ڈیئر چائلڈ، تھینک یو۔ اور للی ڈیئر! تم بھی چل رہی ہو نا؟''

اپنا بدیشی نام سن کر میرے گال تمتمانے لگے۔''مسز مارٹن! میں ابھی آئی۔ ذرا ان دو پٹوں کو سکھوا لوں، نہیں تو دھوپ سے ان کی آب اتر جائے گی۔''

ہاں ہاں، ایسے پیارے پیارے رنگ ہیں۔ انہیں بھدا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے خوبصورت کپڑے ہیں اور انڈین لڑکیوں پر تو بہت ہی سجتے ہیں۔ للی ڈیئر تمہیں اس لباس میں دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔ ویسے میں نے جو تمہیں فراک بنا کر دیا تھا اسے میں بھولی نہیں ہوں۔ لیکن تم اس لباس میں زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ زہرا! آؤ چلو۔ مجھے اپنی آنٹ کے پاس لے چلو۔''

بعد میں جب میں صحن میں پہنچی تو دیکھا کہ مسز مارٹن آرام کرسی پر دراز ہیں اور متجسس نظروں کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ گیہوں پیستی ہوئی عورتیں، نوکرانیاں جو گیہوں لا رہی تھیں اور آ تا لے جا رہی تھیں، مہترانی، دور کونے میں بیٹھے ہوئے اس کے بچے، سب کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ استانی جی اور حجن بی بی ہولے ہولے دعا پڑھ رہی تھیں۔ ساتھ میں انہیں تکے بھی جا رہی تھیں۔ ادھر مسز مارٹن اس طرح بیٹھی تھیں کہ ان کے ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر ٹکے ہوئے تھے۔ فراک کا دامن گھٹنوں تک کھینچا ہوا تھا مگر بھری بھری پنڈلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ موٹے موٹے لکڑی کے پایوں والی آرام کرسیوں پر چڑھنے کے بعد یہ غلاف بھی جو دھلنے سے سکڑ گئے تھے ایسے ہی نظر آ رہے تھے جیسی اس وقت مسز مارٹن نظر آ رہی تھیں۔

میرے پہنچنے پر مسز مارٹن نے بہت شفقت دکھائی۔''ڈیئر للی! ارے یہ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی سوچ سکتا ہے کہ یہ ننھی سی بچی تھی جسے میں نے اے، بی، سی، ڈی پڑھائی تھی۔ عابدہ! تمہارے کو یاد ہے جب اس نے اپنی پہلی نظم اپنے پیارے والدین کو سنائی تھی۔ سفید فراک پہن رکھا تھا۔ اس پہ نیلی لیس، بالوں پر بھی نیلی ربن تھی۔ میں نے انہیں بالکل نہیں بتایا تھا۔ جب سامنے آ کر نظم سنایا تو وہ دونوں کتنا حیران ہوا تھا اور کتنا خوش تھا۔ اس کی ڈیئر امی نے اپنا سونے کا بروچ اتار کر مجھے دے دیا۔ میں ہمیشہ اسے پہنے رہتی ہوں۔ دیکھو یہ رہا۔''

ان کی ٹھوڑی تلے اور گردن کے گرد لپٹی ہوئی لیس میں چھپی ہوئی چھوٹی سی ایک سونے کی چڑیا تھی جس کی چونچ میں ایک ہیرا دبا ہوا تھا۔ اس روشن دن پر یادوں کا سایہ پڑا تو اس پر ایک گھٹا سی چھا گئی۔

"میں اسے ہمیشہ پہنے رہوں گی۔ انہیں میں بھول نہیں سکتی۔ لائف بھی بڑی ظالم چیز ہے۔ خداوند ان کی روحوں کو آسودگی عطا کرے۔" مسز مارٹن نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ماجدہ پھپھی نے بھی ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ عابدہ پھپھی کے ہونٹ بھنچ گئے۔ لیکن مسز مارٹن نے ذرا جو اس پر توجہ دی ہو۔ بے تکلفانہ انہوں نے دوسری بات شروع کر دی "لیکن ڈیئر عابدہ! بچی ویسی ہی اچھی ہے کہ میں اگر یہاں رہتی تو بھی ایسی ہی اٹھتی۔ میں نے سنا ہے کہ سکول میں وہ بہت اچھی جا رہی ہے۔"

"جی میم صاحب!"

"مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہے۔ بنیاد اچھی رکھی جائے تو پھر عمارت بھی مضبوط کھڑا ہوتا ہے۔ میں تو ہمیشہ یہی بات کہتی ہوں۔ جس طرح میں نے للی کی پرورش کی تھی اسی طرح کشن پور کے بچوں کی بھی پرورش کی۔ راجہ صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہی رہو۔ جب بچے سکول میں داخل ہو جائیں تو آپ رانی صاحبہ کو کمپنی دیں۔ لیکن ڈیئر عابدہ! تمہیں تو پتہ ہے کہ کشن پور بالکل الگ تھلگ جگہ ہے اور ابھی تک وہ جگہ قدیم زمانے میں سانس لے رہی ہے۔ کوئی یورپین نہیں کہ آدمی اس سے بات کر لے۔ اور راجہ اور رانی دونوں ہی بہت دقیانوسی ہیں۔ یہاں کا بات اور تھا۔ کلب میں اپنی طرف کا لوگ بہت مل جاتا تھا۔ پھر للی کے پاپا جو تھے وہ بھی ایسے تھے کہ ہمی میں سے ہوں۔"

میں اندر سے جل رہی تھی۔ بہت شدت سے چاہ رہی تھی کہ ان کی تردید کروں۔ مگر وہ تو چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

"ڈیئر! تمہیں پتہ ہے کہ مجھے خوش کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ میں مشکل شے ہوں ہی نہیں۔ ہم انڈین فیملیز کے ساتھ بہت رہا ہے اور نہایت شریف انڈین فیملیز کے ساتھ۔ ڈیئر شوہر کے انتقال کے بعد ملازمت میری مجبوری بن گئی۔ تب سے ہم انڈین فیملیز ہی کے ساتھ رہتا آیا ہے۔ پوئر ڈیئر، وہ کتنا ناخوش ہوتا۔ وہ تو ہمارے کو انگلی بھی اٹھانے نہیں دیتا تھا۔"

ہمارے بابا جان کے دوست فری مینٹل ایک دفعہ کہنے لگے۔ ہاں، مسز مارٹن کو ان کے غیر یورپی طور طریقے بالکل پسند نہیں تھے۔ ہاں تو وہ ایک دفعہ کہنے لگے کہ "مسز مارٹن تو خیر ہوئیں۔ یہ بات کتنی ہی عجب لگے مگر بہر حال مسز مارٹن تو ہیں۔ مگر مسٹر مارٹن کون صاحب تھے؟ مجھے تو وہ فرضی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آدمی نام کی مخلوق تو اس عورت سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔"

مسز مارٹن مسکرائیں "ارے بھئی ڈیئر لوگو، آدمی کی عمر بڑھتی ہے، کم نہیں ہوتی۔ ہم نے اپنی بوڑھی ہڈیاں اپنے ہوم کو لے کے جانا ہے۔" مسز مارٹن انگلستان کو ہمیشہ "ہوم" کہہ کر یاد کرتی تھیں حالانکہ یہ بی بی زندگی میں بس ایک مرتبہ اپنے شوہر کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ وہاں صرف چند مہینے قیام کیا۔ ان کے والدین نے تو کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ان کا انتقال ہوا لیکن مسز مارٹن کی یادوں سے بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ

وہ کون لوگ تھے۔ بس اتنا اشارہ ملتا تھا کہ ان کے بڑے لوگوں سے تعلقات تھے۔ دولت تھی مگر غارت ہو گئی۔

ماجدہ پھپھی اردو میں بولیں "لیکن میم صاحب! آپ وہاں کس کے پاس جائیں گی؟ آپ ہی نے بتایا تھا کہ آپ کے عزیزوں میں سے اب کوئی زندہ نہیں ہے۔ اور جب آپ گئی تھیں تو اس وقت آپ اپنی بھاوج کے پاس جا کے ٹھہری تھیں۔ اللہ معاف کرے، بھاوج ایسی نکلی کہ اس نے آپ سے قیام و طعام کا خرچ بھی وصول کر لیا۔"

"ماجدہ ڈیر! ہمارے یہاں کے رواج آپ لوگوں کی سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ بہر حال مجھے واپس اپنے لوگوں میں جانا ہے۔ ویسے ہم آپ سب سے محبت کرتا ہے، آپ کے ملک سے بھی محبت کرتا ہے۔ مگر ہماری ہڈیوں کو ہماری اپنی زمین ہی میں آسودہ ہونا ہے۔ او ہ ڈیر! ہم اپنے بارے میں بہت باتیں کرتا ہے۔ ہم بھول ہی گیا کہ ہم یہاں کس لیے آیا تھا۔ ارے ڈیر لوگو! ہم تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ اور آپ کے ڈیر پاپا کو سلام کرنے آیا تھا۔ پوئر ڈیر! ہم امید کرتا ہے کہ وہ جلدی اچھا ہو جائے گا۔ لیکن عابدہ، ہم خاص طور سے تم سے ایک فیور مانگنے آیا تھا۔"

عابدہ پھپھی مسکرائیں "اس اپنی چھوٹی سی دنیا میں جو میرے بس میں ہے اس کے لیے میں حاضر ہوں۔"

"ویل عابدہ ڈیر! تم جانتا ہے کہ محرم قریب ہیں۔ میری دوست پادری صاحب کی بہن۔۔۔۔۔ تمہیں یاد ہے نا عابدہ! ہم انہیں یہاں ایک دفعہ لے کے آیا تھا۔"

"ہاں، میرا خیال ہے مجھے یاد ہے۔ مگر یہ بہت دنوں کی بات ہے۔ وہ بی بی بالکل مردوں کی طرح لمبی تڑنگی تھیں۔ اور ناک کتنی لمبی تھی۔"

اس بی بی کی ناک سے ایسا لگتا تھا کہ چہرہ بناتے وقت اسے نہیں ڈھالا گیا تھا۔ بعد میں خیال آیا تو اسے اوپر سے چپکا دیا گیا جیسے بچے چہرہ بنا کر اوپر سے ناک بناتے ہیں۔ اور بالکل ہو تو ا۔ لگتا تھا کہ تبدیلی مذہب کے جنون نے جیسے انہیں چوس لیا ہے۔

پادری صاحب کی ان ہمشیرہ صاحبہ کا نام ایسا تھا کہ اسے یاد رکھنا بہت مشکل تھا۔ لیکن انہیں نام کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ان کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ پادری صاحب کی بہن ہیں۔ ایک تو پادری صاحب جو کام کرتے تھے اس کا تقدس، اور پھر ان کے گرجا گھر کو یہ شرف حاصل تھا کہ گورنر صاحب بہادر وہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ تو ان باتوں کی وجہ سے اس بی بی کی طرف سے منعقد ہونے والی پردہ پارٹیوں کو یہ مقام حاصل تھا کہ اعلیٰ حسب نسب والی سات پردوں میں بیٹھی ہوئی ہندوستانی خواتین بھی ان میں شرکت کرتی تھیں۔ ان پردہ پارٹیوں کے وسیلے سے اس بی بی نے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان خوشگوار تعلقات

قائم کرنے کے لیے بڑے جوش و جذبے سے کام کیا تھا۔ تو ان پارٹیوں میں ضلع افسروں کی بیگمات، کمشنر صاحب کی لیڈی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتی تھیں۔ اور ڈرتے جھجکتے مہرِ سکوت کو توڑ کر اکا دکا بات بھی کر لیتی تھیں۔ جب وہ بات کرنے کے لیے زبان کھولتیں تو اگر زبان ان کا ساتھ نہ دیتی تو مسکراہٹ سے اس کمی کو پورا کرتی تھیں۔ اور ان کی مسکراہٹ درست اور آداب کے مطابق ہوتی تھی۔ اس مسکراہٹ کے جواب میں رانی صاحب اور بیگمات بھی اپنی حیثیت کے احساس کو فراموش کر کے مسکرا دیتیں۔

''للی ڈیئر! تمہارے کو بھی وہ یاد ہوں گی۔ اب سے ایک برس پہلے جب ہم یہاں ہوا کرتا تھا تو ایک مرتبہ تمہارے کو ان کی ایک پارٹی میں لے گیا تھا۔''

''جی مسز مارٹن، مجھے یاد ہے۔''

مجھے یاد آیا کہ اس پارٹی میں میں کتنی اکھڑی اکھڑی بیٹھی تھی۔ بات یہ تھی کہ اتنی بہت سی خواتین کے بیچ میں اکیلی لڑکی تھی۔ اور مسز مارٹن میرے بارے میں ایسے فخر سے اظہار کر رہی تھیں جیسے کوئی جانوروں کا سدھانے والا اپنے کام پر فخریہ اظہار کرے۔ لہک لہک کر کہہ رہی تھی ''ہاں دیکھو، اچھی لڑکیوں کی طرح کام میں ہاتھ بٹاؤ، سینڈوچ اور کیک بنانے میں ان کی مدد کرو۔'' اور پادری صاحب کی ہمشیرہ بھی اپنی شرافت میں میری تعریف کر رہی تھیں ''بہت اچھی، بہت تمیز دار لڑکی ہے۔'' اور مسز مارٹن اترا اترا کر کہہ رہی تھیں ''جو میرے اصول ہیں اور جو میرے تصورات ہیں ان کے حساب سے میں نے اس بچی کو تربیت کیا ہے۔'' اور پادری صاحب کی ہمشیرہ اثبات میں سر ہلا ہلا کر کہہ رہی تھیں ''روشنی ہر گھر میں پہنچنی چاہیے۔ ملک کے تاریک سے تاریک گوشے میں بھی روشنی پہنچنی چاہیے۔''

مجھے خوب یاد تھا کہ دونوں ہاتھوں میں کس طرح سینڈوچ اور کیک کی پلیٹ لیے کھڑی تھی اور مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر نظریں میری باغیچے کی طرف تھیں جہاں ریشمیں کپڑوں میں ملبوس، زیوروں سے لدی پھندی خواتین بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ زردی مائل لان میں دھنک رنگ ساڑھیاں پہنے وہ ایسے پھدک رہی تھیں جیسے تتلیاں پھڑ پھڑ اڑتی پھر رہی ہوں یا پروانے پھڑ پھڑا رہے ہوں۔ ان کے ارد گرد پھولوں کے تختے تھے جن کے رنگ دھوپ میں خوب چمک رہے تھے۔ اور یہ خواتین ایسے بول رہی تھیں جیسے چڑیاں چیں چیں کر رہی ہوں۔ اور مسز مارٹن ایسے بول رہی تھیں جیسے مکھی بھنبھنا رہی ہو۔ وہ سوال کیے جا رہی تھیں۔ اس سے بے نیاز کہ ان سوالوں کا کوئی جواب دیتا ہے یا نہیں دیتا۔

''ہمارا فرینڈ محرم کا جلوس دیکھنے کے لیے بہت بیتاب ہے۔ اسے اس ملک کی ریت رسموں سے بہت دلچسپی ہے۔ خیر ہمارے کو تو اتنا کچھ معلوم ہے کہ بہت سے انگریزوں کو تو ان باتوں کی ہوا بھی نہیں لگی ہو گی۔ آخر ہم اچھے اچھے انڈین گھروں میں رہا ہے۔ عابدہ ڈیئر! ہم پہ عنایت کرو۔ ایک مرتبہ ہم تمہارے ایک عزیز کے گھر للی اور زارا کو لے کر گیا تھا۔ اس گھر میں ہمارا بندوبست کر دو کہ ہم وہاں سے جلوس دیکھ لے۔''

''میم صاحب! انتظام ہو جائے گا۔''

''ڈیئر! تھینک یو بلیس یو۔ ہم اپنی فرینڈ کو لے جا کے امام باڑوں کی روشنیاں بھی دکھائے گا۔ اوہ، کتنی پیاری پیاری روشنیاں ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پرستان میں پہنچ گئے۔ وہ جو تیل والا چراغ ہوتا ہے ان کی ہلکی ہلکی روشنی کتنا سویٹ ہوتا ہے۔ مائی ڈیئر! اب تو بجلی کے بلبوں نے ہر چیز کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ان بلبوں کی روشنی بہت تیز ہوتا ہے۔ آنکھوں کو اچھا نہیں لگتا۔ اور پرانے زمانے میں تو آدمی کے لیے یہ ممکن تھا کہ بھیڑ بھڑکے سے بچنے کے خیال سے کسی خاص دن وہاں چلا جائے۔''

میں نے جارحانہ انداز میں کہا''اُس زمانے میں یہ حالت تھی کہ ہم یورپین لباس پہنے نہ ہوتے تو پھر ہمیں پاسوں کی ضرورت پڑتی تھی۔''

''واقعی لٹل'' مسز مارٹن کو بہت حیرت ہوئی۔ پھر انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا'' بچہ لوگ انقلابی بنتا جا رہا ہے۔''

''اسے کیا کہا'' عابدہ پھپھی نے پوچھا۔

''عابدہ ڈیئر! تمہیں تو پتہ ہے نا یہ کانگریس والا لوگ جو فتنہ وفساد پیدا کرتا رہتا ہے۔ مجھے شاید صحیح یاد ہے کہ وہ جو ایک لڑکی سیتا اگروال تھی جس کا فیملی ہمیشہ کبھی جیل سے آ رہا ہے، کبھی جیل جا رہا ہے، اس لڑکی سے اپنے بچہ لوگ کی بہت دوستی تھا۔''

''سیتا کے انکل کو جیل ہو گئی تھی۔'' زہرا نے اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا۔

میں چپ بیٹھی رہی۔ مجھے وہ جلتا بلتا دن یاد آ گیا جب سڑک گرمی سے جل بھن رہی تھی اور سڑک کا تارکول پگھل کر ایسا بن گیا تھا کہ سڑک کے کنارے کھڑے املی کے درختوں کے عکس اس میں جھلملا رہے تھے۔ ایسے وقت میں بائیکاٹ کرنے والوں کا جلوس نکلا ہوا تھا جسے کونسل چیمبر کے پاس روک لیا گیا تھا۔ پولیس نے ان پر لاٹھیاں برسائی تھیں۔ یہ موٹی موٹی لاٹھیاں تھیں۔ زخمی ہو جانے والوں کو اس طرح لے جایا جا رہا تھا جیسے لاشیں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ سیتا اور میں گھر کی بالکنی سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ دل ہی دل میں ہم ڈر بھی رہے تھے اور سخت غصہ بھی آ رہا تھا۔ ہم نے اس وقت قسم کھائی تھی کہ جب ہم بڑے ہو جائیں گے تو ہم بھی ان ستیہ گرہیوں کی طرح دیس کی آزادی کے لیے لڑیں گے۔ بدیشی کپڑے کے عندار دکانداروں کی دکانوں کے سامنے گندے میلے فٹ پاتھوں پر لیٹ جائیں گے، پرامن جلوس نکالیں گے، متکبر انگریزوں کی طاقت کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ بس اُس روز سے ہم نے اپنے سکول کے کنسرٹوں میں نیشنل اینتھم گانا چھوڑ دیا۔ اور سینما گھر میں جب آخر میں ترانہ شروع ہونے لگتا تھا تو ہم ہال سے باہر نکل آتے تھے۔ ہمیں ان دنوں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی بڑی تحریک کا حصہ ہیں۔ اب سکول میں اینگلو انڈین لڑکیوں کے طعنے مہنے ہم پر اثر نہیں کرتے تھے۔

''مائی ڈیئر'' مسز مارٹن نے اسی اپنی بات پر اڑے رہنے والے لہجے میں کہا'' جو لوگ اس تحریک میں شامل ہیں ان سب کا اپنا اپنا مفاد ہے۔ اب جیسے یہ لڑکی ہے۔ ایک گز بدیسی کپڑا ابھی اگر جلتا ہے یا بکتا نہیں ہے تو اس کا فائدہ اس کے باپ کو ہوتا ہے اس لیے کہ اس ایک گز کپڑے کے جل جانے سے اس کے کارخانے کے بنے ایک گز کپڑے کے لیے مارکیٹ پیدا ہو گئی۔ بس اس تباہ کن عدم تشدد کی بیہودگی سے اسی قسم کے لوگوں کا بھلا ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں یہ آدمی پھیری والوں کی طرح اپنا کپڑا لے کر ایک ایک دروازے پر جاتا تھا اور امیر گھروں میں کپڑا سپلائی کیا کرتا تھا۔ کیا اس وقت کوئی یہ سوچ سکتا تھا کہ ایک دن اس کی پوتی اسی سکول میں پڑھے گی جس میں ہماری للی پڑھتی ہے۔''

زاہد نے آ کر کہا کہ مسز مارٹن کے لیے کار آ گئی کھڑی ہے۔ مگر لگتا تھا کہ کار کافی دیر پہلے سے آئی کھڑی تھی۔

مسز مارٹن نے زاہد سے کہا'' لڑکے کی ممی سے کہو کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے یہاں آ جائیں۔ باقی اور لوگ کار میں بیٹھے رہیں اور تھوڑا انتظار کریں۔''

سلویا تنکر کمرے میں داخل ہوئی۔ زاہد پیچھے پیچھے ایسے چل رہا تھا جیسے وہ کوئی بچی ہے۔

''ہیلو للی!'' سلویا مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کے ہونٹ کیسے رسیلے نظر آ رہے تھے۔ اور آنکھوں میں کتنی شوخی تھی۔

''ہلو سلویا۔''

''ارے ہے نا تمہارے لیے یہ خوشگوار سرپرائز!'' مسز مارٹن ایسے بولیں جیسے گنگ رہی ہوں۔ ''کچھ یاد آیا سکول کا زمانہ؟''

ہاں یاد تو آیا۔ سلویا کا میرے کپڑوں پر ہنسنا'' ملکہ وکٹوریہ زمانہ ہوا انتقال فرما گئیں۔ برقعہ پہنو برقعہ۔ پھر تمہارے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن بھی نظر نہیں آئے گا۔'' میرے ساتھ جو ملازم سکول بھیجا جاتا تھا وہ فیلڈ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ سلویا اس کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی ہے۔'' شہزادی کا محافظ اژدہا۔ ارے تم پہ اتنا بھی اعتبار نہیں ہے کہ تم اکیلی سکول آ جا سکو۔'' سلویا کو پتہ ہے کہ مجھے لڑکوں سے بات کرنے اور ناچنے سے منع کیا گیا ہے۔ پھر بھی وہ مجھ سے پوچھ رہی ہے'' سکول میں جو ڈانس ہو گا اس میں تمہارا پارٹنر کون بنے گا؟ تمہارا بوائے فرینڈ کون ہے؟'' پیچ والے دن سلویا مجھ سے کہتی ہے'' یاد رکھو کہ تمہیں صرف انعامات لینے کے لیے یہاں آنے کی اجازت ملی ہے۔ سنڈریلا بی بی! یہاں زیادہ مت رکنا نہیں تو پھر تمہیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملے گی'' سلویا گنگنا رہی ہے'' برطانیہ راج کرے'' اور بار بار ہماری طرف دیکھتی ہے۔ یہ سیتا کے انکل کی گرفتاری کے بعد کی بات ہے۔ سلویا اپنی بہن میرا کو ڈانٹ رہی ہے'' تم ان کالے لوگوں کو منہ کیوں لگاتی ہو۔''

چھٹا باب

مسز مارٹن کی آمد ایک واقعہ تھی۔ اب تو اس گھر میں بابا جان اکیلے ہی تھے، بیٹے ساتھ نہیں تھے۔ اس دوران میں کوئی انگریز خاتون اس گھر میں آتی نہیں دیکھی گئی، خاص طور سے زنانے میں۔ مسز مارٹن کی آمد نے اچھے دنوں کی یادوں کو تازہ کر دیا تھا۔ لیکن پھر اسی سے اس وقت کی پریشانی اور اداسی کا احساس اور بڑھ گیا۔

رات کو کھانے کے بعد جب میں واپس اپنے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ اسد بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں حیران رہ گئی۔

اس نے وضاحت کی کہ ''زہرا نے مجھ سے اون کے لیے کہا تھا، وہ میں خرید کے لے آیا ہوں۔''

''وہ آتی ہی ہوگی۔''

اس کا چہرہ تو ویسے ہی پیلا پیلا تھا، اُس وقت وہ کچھ زیادہ پیلا نظر آ رہا تھا۔ اور آنکھوں میں وہ کیفیت جو کھو جانے والے بچوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

''لیلیٰ!'' وہ ایک دم سے پھٹ پڑا'' کیا یہ صحیح ہے کہ زہرا کی شادی ہونے والی ہے؟''

''ہاں اس بارے میں کچھ باتیں ہو تو رہی تھیں۔''

''میرا خیال ہے وہ بہت امیر آدمی ہے۔'' اسد کے لہجے میں ایک تلخی تھی۔ یہ لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ اس کے اندر کیا ہنڈیا پک رہی ہے۔

''اس سے بھی بڑھ کر بات یہ ہے۔'' میں نے کہا'' کہ اس کا تعلق انڈین سول سروس سے ہے۔''

''فرق کیا ہے۔ ایک ہی بات ہے۔ پیسہ ہو یا اقتدار، بس لے دے کے انہی دو چیزوں کی اہمیت ہے۔'' پھر کہنے لگا'' لیلیٰ، باقی جو ہمیں پڑھایا لکھایا جاتا ہے وہ سب بکواس ہے۔ صرف پیسہ ہے سچائی۔ لیلیٰ، میں تمہارے سامنے ایک اعتراف کرتا ہوں۔ مجھے یہ احساس ستا رہا ہے کہ میری ساری زندگی رائگاں گئی۔ جس دینی مدرسے میں مَیں پڑھتا ہوں وہاں مجھے تمام نہاد نیکیوں کا سبق پڑھایا جاتا تھا۔ مگر یہ سبق تو مجھے اللہ تعالیٰ سے دور کرتا چلا جا رہا ہے۔ میں نے اس بات کو جزو ایمان بنانے کی کوشش کی کہ عجز ایک نیک صفت ہے، لیکن جو عجز آپ پر اوپر سے مسلط کیا جائے وہ تو بہت بڑی ذلت ہے۔ مجھے اپنے والد کا خیال آتا ہے اور بار بار اس دن کا خیال آتا ہے جب سیتا کے انکل کو مار پیٹ کر گرفتار کیا گیا تھا۔ بس بہت دنوں سے مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ

مجھے کسی ایسے عمل میں شامل ہونا چاہیے جو میری ذات سے بلند اور بڑا ہو۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا لیلیٰ!"

"سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"لیکن تم نہیں سمجھ سکتیں۔" اس کا لہجہ پھر تلخ ہو گیا" ہمارے بیچ میں چاندی کے کھنکھنے سکوں کی دیوار کھڑی ہے۔"

"نہیں، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یہ غلط بات ہے۔"

"صحیح بات کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ زہرا نے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ یہ کہ وہ نظریں جھوٹ تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھا تھا، لیکن اصل میں وہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ اصل میں زہرا۔۔۔"

"اسد بھائی! آپ کچھ میرے بارے میں کہہ رہے ہیں؟" زہرا مسکرا رہی تھی۔ اس کا سر ایک طرف جھک گیا تھا۔ اس ادا سے وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی" یا کوئی نظم سنا رہے تھے؟"

"گویا جو بھی نظم ہو گی وہ تمہارے بارے میں ہو گی۔" زاہد نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ بھی تو زہرا کے پیچھے پیچھے آن دھمکا تھا۔

"نہیں زاہد، اس طریقے سے تو تم مجھے اپنے بارے میں بات کرنے سے نہیں روک سکتے۔ اسد بھائی، آپ کو پتہ ہے، آپ کے بھائی میاں آج کل لیلیٰ کی ایک سہیلی پر ریشہ خطمی ہو رہے ہیں۔ وہ لڑکی جو آج یہاں آئی تھی۔ اب اس کے سوا اور کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔"

"وہ میری سہیلی نہیں ہے۔" میں پھٹ پڑی۔

"ہاں اسے آپ کی سہیلی ہونا بھی نہیں چاہیے۔" زاہد بولا۔" میں نے اسے نامیوں کے ساتھ مال پہ گھومتے پھرتے دیکھا ہے۔ ہر مرتبہ کوئی نیا نامی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"اس نے تمہیں گھاس نہیں ڈالی، اس لیے تم ایسی کڑوی کسیلی باتیں کر رہے ہو۔" زہرا نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

"وہ اسے کیوں گھاس ڈالے گی۔ یہ میاں اسے کیا دے سکتے ہیں۔" اسد نے تند و تیز لہجے میں کہا

"پھر یہ میاں ٹھہرے کالے آدمی، اس لیے ادھر قیمت دوگنی تگنی ہو گئی۔"

زہرا نے اسد کی بال کو گول کر دیا اور اسی طرح جاری رہی" زاہد میاں، وہ مسز مارٹن کے ساتھ محرم کا جلوس دیکھنے کے لیے آئے گی۔ اس موقع پر تم آنکھیں سینک لینا۔"

اسد نے ٹکڑا لگایا" غلام جتنے زیادہ ہوں اتنی ہی زیادہ خوشی کی بات ہے۔ انہیں غلاموں کو اپنی معیت میں رکھ کر خوش ہو لینے دو۔ تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ اگرچہ یہ موقع دوسرے قسم کا ہے۔ یہ مذہب کا معاملہ ہے اور مقدس تقریب ہے۔"

"نہیں، مقدس نہیں ہے۔" زاہد بولا" یہ تو شرک ہے اور گناہ ہے۔ ذرا سوچیے، ہمارا مذہب تو یہ کہتا ہے کہ آدمی کو مرنے کے بعد قبر میں اس طرح دفن کرنا چاہیے کہ قبر کا نشان بھی نہ ہوتا کہ لوگ بعد میں مقبرے

کھڑے کر کے اور انہیں ولی اللہ بنا کر پرستش شروع نہ کر دیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ غلط بات یہ ہے کہ یہ لوگ تعزیے بناتے ہیں اور یہ تصور دیتے ہیں کہ یہ آلِ نبی کے مقبروں کی مقدس شبیہیں ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ شیعہ لوگ کفر کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسے سارے جلوس گناہ کے ذیل میں آتے ہیں۔ جو لوگ جلوس نکالتے ہیں وہ تو بت پرستوں سے بھی بدتر ہیں۔''

زہرا نے فوراً ڈانٹ پلائی'' زاہد، ایسی بات کرنے کی تم نے جسارت کیسے کی۔ سنی ہوں یا شیعہ ہوں، ہم سب مسلمان ہیں۔''

''ہم سنیوں پر تو وہ لعنت بھیجتے ہیں۔'' زاہد نے پلٹ کر جواب دیا۔

میں نے کہا'' زاہد، آخر نفرت اور راست بازی کے دعووں کی ٹھیکیداری تم لوگوں ہی نے تو نہیں لی ہے۔''

اسد کہنے لگا'' اصل میں انگریزوں سے اس نے یہ سبق سیکھا ہے۔''

زاہد نے تعجب سے بھائی کی طرف دیکھا۔ پھر بدمزہ ہو کر بولا'' بہر حال محرم کے دنوں میں باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔ سکول میں لڑکے باتیں کر رہے تھے کہ اس دفعہ محرم میں فساد ہوگا۔''

''لڑکے تو گدھوں والی باتیں کرتے ہیں۔'' زہرا کہنے لگی'' بھلا کیوں ہوگا فساد۔''

اسد بولا'' شاید اس وجہ سے کہ بہت دنوں سے کوئی فساد نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ہندو مسلمانوں کا بھی کوئی فساد نہیں ہوا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیے کہ پتہ چلے کہ انگریز موجود ہیں جو قانون نافذ کر سکتے ہیں، ہمیں ایک دوسرے کا خون بہانے سے روک سکتے ہیں۔''

''اسد بھائی، آپ ہمیشہ بہت سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔'' زہرا کی آنکھوں میں شرارت تھی'' ارے میں تو بیچارے زاہد کے دکھے دل کی بات کر رہی تھی۔''

وہ ہنسنے لگی لیکن ہنستے ہنستے ایک دم سے رک گئی۔ اس کی نظر حکیمن بوا پہ جا پڑی جو دروازے میں کھڑی تھیں۔

''بس کرو زہرا بٹیا، لیلیٰ بٹیا! اب سونے کا وقت ہے۔ اسد میاں اور زاہد میاں! بہت رات ہو گئی ہے۔ تمہیں یہاں اتنی دیر تک نہیں رکنا چاہیے۔''

مگر کوئی بھی وقت ہو ہمارے کمرے میں ان کی موجودگی پسند نہیں کی جاتی تھی۔

اسد کہنے لگا'' بس ہم جا ہی رہے تھے۔ زہرا تم جو اون کے لیے کہہ رہی تھیں وہ میں لے آیا ہوں۔ کھانے کے وقت اسے دینا بھول گیا تھا۔

''بھائی شکریہ آپ کتنے اچھے کتنے پیارے بھائی ہیں۔''

حکیمن بوا انہیں جاتے دیکھتی رہیں۔ جب وہ چلے گئے تو انہوں نے زنانے سے باہر کی طرف والے دروازے میں تالا لگا دیا۔ اور پھر جاتے ہوئے سرزنش کے لہجے میں کہا'' اب سوؤ، باتیں ختم کرو۔''

لیکن میں بہت دیر تک نہ سو سکی۔ اسد کی تلخی اور مایوسی کا خیال مجھے رہ رہ کے آ رہا تھا۔

ساتواں باب

دن ایک ہی طور سے گزر رہے تھے۔ جیسا ایک دن ویسا دوسرا دن۔ پہلے تو اس پر تھوڑی حیرت ہوتی تھی کہ درمیان میں پریشان گھڑیاں آتی بھی ہیں تو کتنے آرام سے ان کی شدت آنے والی گھڑیوں میں تحلیل ہوتی چلی جاتی۔ مگر پھر حیرت کا احساس بھی جاتا رہا۔

اب باباجان کی حالت سے کوئی پریشانی کی لہر نہیں دوڑتی تھی۔ محسن چچا اپنے معمول کے مطابق چہچہاتے چمکتے وارد ہوتے۔ زہرا کے رشتے کے سلسلے میں اب وہ زیادہ زور نہیں دیتے تھے۔ نندی تو ایسی گئی کہ اب اس کی ماں کی زبان پر بھی اس کا نام نہیں آتا تھا۔ اس نے اب صبر کر لیا تھا۔ البتہ ایک دن ایسا ہوا کہ میں جو کمرے میں داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ زہرا اور اسد اکیلے میں کچھ کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ میرے اچانک آ جانے سے دونوں ایک دم چپ ہو گئے۔ زہرا کی خاموشی سے غصہ ٹپک رہا تھا جب کہ اسد کی خاموشی کا رنگ کچھ ایسا تھا جیسے درد منجمد ہو گیا ہو۔ اس نے اس رات ہمارے ساتھ کھانا بھی نہیں کھایا۔

اس گھر کی زندگی اب پھر اسی پرانے ڈھرے پر آ گئی تھی۔ جو عزیز و رشتے دار ملنے آتے تھے، وہ اب اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ مستقل فکر و پریشانی کا اظہار کیے جا رہے ہیں۔

اب پھر ان اونچی دیواروں کے پرے سے پھیری والوں کی بولیاں سنائی دینے لگی تھیں اور شعر گانے والوں کی ڈوبتی ابھرتی آوازیں۔ ان پھیری والوں میں نتھو بھی تھا جس کی ٹانگیں ٹیڑھی میڑھی اور آواز میں رعشہ تھا۔ سنہری رنگ والے بسکٹ اور قیمہ بھرے خستہ ورقی سموسے بیچتا تھا۔ ہم بچے سے بڑے ہو گئے مگر کبھی نہیں دیکھا کہ وہ سودا دینے کے بعد لبھاؤ دینا بھولا ہو۔ ایک شبراتی تھا جو سونے چاندی کے ورق لگا کر حلوہ اور دوسری مزے مزے کی مٹھائیاں بیچتا تھا۔ مٹھائیاں جن پر ترنجبین کی تہہ جمی ہوتی تھی۔ اور لال میاں جس کا مٹکا قلفیوں سے بھرا ہوتا تھا۔ قلفی مٹکے سے نکالتا، اس کے منہ کے گرد چپکے ہوئے آٹے کو چاقو سے کھرچ کر اس کا ڈھکن کھولتا، اندر سے آئس کریم برآمد ہوتی۔ ویسے تو مشینوں کا وہ بہت مذاق اڑاتا تھا مگر ان سے خوفزدہ بھی تھا۔ بات یہ تھی کہ اب مشینوں کے رواج کے بعد سے اس کے موٹے گاہک تو کبھی کبھار ہی اس کو نوازتے تھے۔ کلو پھل اور ہری گیلی چیزیں بیچتا تھا۔ اپنی ککڑیوں پر اسے بہت مان تھا۔ کیسی پتلی پتلی اور ہری ہری ککڑیاں ہوتی تھیں۔ اور پھر وہ کیا خوب آواز لگاتا تھا:

"لیلیٰ کی انگلیاں ہیں، مجنوں کی پسلیاں ہیں۔"

کریم منہارن کی اس گھر میں پھر آؤ بھگت ہونے لگی تھی۔ کتنی موٹی تھی اور مستقل ہنستی رہتی تھی۔ سر پر بڑا سا بھاری ٹوکرا اٹھائے لڑھکتی پھڑکتی آتی اور فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی۔ جب ٹوکرے پر سے لال کپڑا ہٹاتی تو رنگ رنگ کی نازک نفیس چوڑیاں جھلمل جھلمل کرتی نظر آتیں۔ ہر قسم کی، کوئی بھاری، کوئی ہلکی، کسی پہ سنہری پتیاں بنی ہوئی، کسی پہ سنہری پٹی چڑھی ہوئی، کوئی پتلی نازک کلائی کے لیے، کوئی بھری ہوئی کلائیوں کے لیے۔ اپنی موٹی موٹی انگلیوں سے وہ ان نازک چوڑیوں کو انتہائی بے لچک ہاتھوں پر بھی اتنی نرمی سے چڑھاتی اور اتنی مہارت سے کہ وہ کلائی پر بالکل درست آتیں۔ اس میں وقت تو لگتا تھا مگر وقت کا تو ہمارے لیے یہی مصرف تھا کہ ہنس بول رہے ہیں، گپیں لگا رہے ہیں، اپنے لیے اور اپنے بعد نوکروں کے لیے رنگ برنگی شیشے کی چوڑیاں چھانٹ رہے ہیں۔

منہارن کہتی: "الٰہی وہ دن جلدی آئے جب میں اپنی بنیا کے مہندی لگے ہاتھوں میں دلہنوں والی لال لال سنہری چوڑیاں پہناؤں۔"

اور جواب میں حکیمن بوا کہتیں: "اللہ نے چاہا تو وہ دن جلدی آئے گا۔ بس اللہ میری بچیوں کو نظرِ بد سے بچا کر رکھے۔"

کملی شاہ درویش نے پھر جمعرات کی جمعرات آنا شروع کر دیا تھا۔ تند و تیز لہجے میں صدا لگاتا۔ اگر تھوڑا انتظار کرنا پڑ جاتا تو دعائیہ لہجہ دھمکیوں میں بدل جاتا۔

"اے محمد میاں! اے محمد میاں کی بیٹیو! اور اے محمد میاں کے بیٹے کی بیٹیو! فقیر کملی شاہ آ گیا ہے۔ فقیر کو مت بھولو، اللہ تمھیں نہیں بھولے گا، بھگوان نہیں بھولے گا۔"

کملی شاہ پھاٹک کے اندر آ کر بیچ رستے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ سر اور داڑھی کے بال الجھے ہوئے، گھورتی ہوئی آنکھیں۔ سب کو گمان یہ تھا کہ اس کے پاس روحانی طاقت ہے اس لیے ڈرتے تھے کہ دیوانگی میں بددعا نہ دے دے۔ اس لیے اسے کبھی خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے تھے۔ اس وقت بھی دیوار کے اس پار سے اس کی صدا سنائی دے رہی تھی اور جس طرح بچپن میں یہ صدا سن کر ہم ڈر سے کانپنے لگتے تھے وہی ہماری کیفیت اس وقت بھی تھی۔

اس گھر میں زندگی کا ایک ایسا طور چلا آ رہا تھا جیسے وہ ہمارا مقدر ہو۔ چہار دیواری میں بند، باہر کی دنیا کے تاثرات سے دل و دماغ محفوظ، باہر کی دنیا کو تو ہم نے بالواسطہ طور پر ہی جانا اور محسوس کیا تھا۔ تو زندگی کا وہ طور تھوڑے دن معطل رہ کر اب پھر اپنی ڈگر پر آ گیا تھا۔

آٹھواں باب

ماجدہ پھپھی نے ایک مرتبہ پھر خاندان کے لگے ہوئے جوہری کو بلا بھیجا۔ زہرا کے بیاہ کی تیاری جو ہو رہی تھی۔ پردے کے ادھر وہ خود بیٹھی تھیں۔ دوسری طرف رام داس جی بیٹھے تھے۔ میں ان کے ہاتھ سے مخمل کی ڈبیاں اور پیکٹ، جن میں قیمتی نگ سجے تھے، لیتی اور پھپھی کے ہاتھ میں تھما دیتی۔ زہرا ایک کونے میں شرم کی پوٹ بنی بیٹھی تھی۔ ایسے بن رہی تھی جیسے اس کو اس قصے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ عابدہ پھپھی رنگ رنگ کے نگ نکال کر دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت تو وہ بھی اپنے غم اور افسردگی کو بھولی ہوئی تھیں۔

لالہ رام داس آلتی پالتی مارے سکڑے سکڑائے بیٹھے تھے اور خوشامد میں بچھے جا رہے تھے۔ لیکن کہنے والے کہتے تھے کہ جو تعلق دار ان سے خریداری کرتے ہیں ان میں بہت سوں سے زیادہ ان کے پاس دولت ہے۔ بے بہا زیور اور گراں قدر نگ ان کے پاس ہیں اور یہ سب انہوں نے آخری تاجدار اودھ کے درباریوں اور عزیزوں سے خفیہ طور پر بہت سستے داموں خریدے تھے۔ یہ لوگ یہ چیزیں علانیہ نہیں بیچ سکتے تھے۔ اپنی عزت کا جو پاس ہوتا تھا۔ پھر مول تول کرنا بھی ان کی شان کے خلاف تھا۔

جائیداد کے مینیجر نائب صاحب اور منیم لالہ جی معاملات طے کرنے سے پہلے مشورے کے لیے عابدہ پھپھی کے پاس آئے۔ وہ فیصلوں کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے۔ وہ آ کر پردے کے اس طرف بیٹھ گئے اور کھڑ کھڑ اور سر سر کرتے پیلے پیلے کاغذ اپنے سامنے پھیلا لیے۔ ان پر کیڑے مکوڑے سے بنے ہوئے تھے جیسے روشنائی میں بھیگی مکڑی ان کاغذوں پر پھر گئی ہو۔

عابدہ پھپھی کبھی کبھار جائیداد کے کام میں ابا جان کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھیں اس لیے کاشتکار جن منشیوں سے درخواستیں اور اپیلیں لکھوایا کرتے تھے ان کی لکھی ہوئی تحریر کو وہ خوب پڑھ لیتی تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ عابدہ پھپھی جس بے نیازی سے کرایہ ادا نہ کرنے والوں کو نکال باہر کرنے کے احکامات جاری کرتی تھیں یا بغیر اجازت بنی ہوئی کچی کٹیاؤں کو گرانے کی ہدایت دیتی تھیں، اُسی بے نیازی سے شادی بیاہ کے لیے قرضے اور چتاؤں کے کریا کرم کے لیے مفت لکڑیاں دیتی تھیں۔

میں جو پیلے پیلے کاغذ نائب صاحب سے لے کر پھپھی جان کو اور پھپھی جان سے لے کر نائب صاحب کو دیتی تھی، ان کاغذوں میں حرفوں، ہندسوں اور لفظوں کی شکل میں مسائل بھی بکھرے ہوتے تھے اور

ان کے حل بھی۔ جتنی سادگی سے دردمندانہ اپیلیں کی جاتی تھیں اُسی سادگی سے فیصلے بھی صادر کیے جاتے تھے۔

لیکن کبھی کبھی یہی پیلے کاغذ جب فریاد کرنے والوں کے ہاتھوں میں ہوتے تھے تو استرے کی دھار کا کام دکھا جاتے تھے۔ اُس دن جب جُمن اپنی جورو کے بھیا کی تائی کو لے کر آیا تھا تو یہی کچھ ہوا تھا۔ جمن کی جورو کے بھیا کی تائی تو بہت خوش نصیب تھی کہ جمن کے وسیلے سے حاکم تک رسائی حاصل ہوگئی اور بھاری فیس پر کوئی وکیل نہیں کرنا پڑا۔ جُمن ہی نے اس کی وکالت کی اور اس نے اپنے بیٹے کی وکالت کی لیکن اگر اس غریب کے آنسو اس کی وکالت نہیں کر سکے تو پھر اور کس کی وکالت کامیاب ہوسکتی تھی۔ اس کی صابر آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا بہہ رہی تھی۔ کتنی خاموشی سے بہہ رہے تھے لیکن تلوار کی دھار سے زیادہ ان میں دھار تھی۔ زندگی تو اس میں سے جیسے نچڑ گئی ہو۔ جس طرح ان کے سوکھے بازو میں سلور کی بھدی میلی گھسی گھسائی چوڑی نظر آ رہی تھی، بس اسی طرح کی گھسی پٹی وہ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ان بالیوں سے جو کبھی اپنے اچھے دنوں میں اس نے پہنی ہوں گی، اس کے کانوں کی لویں چر گئی تھیں۔ گردن، کلائیاں اور ٹخنے سب ننگے بچے تھے۔ نام کو کوئی گہنا نہ تھا۔ اس سے اس کی مفلسی کا پتہ چلتا تھا۔ ان جھریوں بھرے ہاتھوں سے جو بڑھاپے اور محنت سے کالے پڑ گئے تھے، اس نے چھپی جان کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کے گھسے گھسے ناخن ترے مڑے اور کھردرے نظر آ رہے تھے۔ اس نے زمین پر اپنا ماتھا ٹیکا تو بالکل ایسے لگا جیسے چیتھڑوں گودڑوں کی کوئی پوٹلی کسی نے بے پروائی سے پھینک دی ہو۔

''تم ہمری میا ہو، ہمری دیبی ہو، ہمن پہ کرپا کرو۔'' وہ گڑگڑا رہی تھی۔

لیکن کیسی کرپا؟ یہاں سارا زور انصاف پر تھا۔ وہ جُمن کی جورو کے بھیا کی تائی تھی؟ نہیں۔ ایک بوڑھی شکستہ حال عورت تھی؟ نہیں۔ ایک ماں تھی جو اپنے بیٹے کے لیے منت سماجت کر رہی تھی؟ نہیں۔ وہ یہ کچھ بھی نہیں تھی۔ اس کی حیثیت بس ایک تصفیہ طلب قضیے کی تھی۔ پیلے کاغذ پر لکھا ہوا ایک حرف تھی۔ نائب صاحب نے اونچی آواز میں واقعات بیان کیے اور مقدمے کا فیصلہ تجویز کیا:

اس عورت کا بیٹا لگان ادا نہیں کر سکتا۔ اچھے خاصے زمانے سے اس کی یہی حالت ہے کہ لگان ادا کرنے سے قاصر ہے۔ کتنی مرتبہ یہ سوچ کر اس کے ساتھ رعایت کی گئی، اسے مہلت دی گئی کہ تین پیڑھیوں سے زمین ان کے ہاتھ اٹھاتے چلے آئے ہیں۔ اس نے اپنی صفائی میں کبھی یہ کہا کہ وہ بیمار پڑ گیا تھا اس لیے زمین کی دیکھ بھال نہیں کر سکا، کبھی کہا کہ اس پر قرضہ بہت چڑھ گیا ہے، کبھی کہا کہ مہاجن نے اس سے رقم اینٹھ لی اور کبھی عذر کیا کہ فصل خراب ہوگئی۔ اگرچہ یہ افسوس ناک امر ہے، نائب صاحب نے بڑے خشک حقیقت پسندانہ لہجے میں یہ بات تسلیم کی لیکن فوراً ہی ٹکڑا لگایا'' تاہم ہمیں احتیاط ملحوظ رکھنی ہوگی۔ بات یہ ہے کہ نئے قوانین منظور ہونے والے ہیں جس کے بعد لگان داروں کا اخراج ناممکن نہیں تو محال ضرور ہوگا۔ اس قسم کی اور

بھی مثالیں ہیں۔ ایسے لگان داروں سے رعایت برتنا تباہ کن ہوگا، اور بالخصوص اس صورت میں کہ کتنے سائل موجود ہیں جو نہ صرف لگان ادا کریں گے بلکہ پیشگی معقول رقم دینے پر آمادہ ہیں۔ بے شک زیرِ نظر معاملہ افسوس ناک ہے لیکن کیا کیا جائے مشکل زمانہ ہے۔ لگان کی اُگاہی کچھ زیادہ ہی مشکل ہوتی جا رہی ہے اور مال گزاری بہر حال ادا کرنی ہے۔۔۔۔۔''

نائب صاحب کے دلائل پکے تھے۔ ان پکے دلائل کے سامنے بڑھیا کی سسکیوں کی کیا وقعت تھی۔

''پھپھی جان!'' میں نے دستخط کے لیے ان کے ہاتھ میں کاغذ تھماتے ہوئے کہا'' بیچاری کی حالت قابلِ رحم ہے۔ آپ اس کے ساتھ تھوڑی بہت رعایت نہیں کر سکتیں۔''

انہوں نے جواب دیا'' مجھے اس پر رحم تو آ رہا ہے لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔ بیٹی! یہ اصول کا معاملہ ہے۔ جب اپنی زندگی گزارو گی تب تم سیکھو گی کہ دل کو دبا کر سمجھداری سے کام لینا پڑتا ہے۔''

O اور جُمن بڑھیا کو دھکیل کر باہر لے گیا کیونکہ یہاں ابھی بہت سے تصفیہ طلب مسئلے تھے اور دیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

نواں باب

زہرا کی اور میری سہیلیاں تو کبھی کبھار ہی ملنے کے لیے آتی تھیں، البتہ عزیز رشتہ دار شہر میں وارد ہوتے تو ادھر بھی آنکلتے تھے مگر ان میں تو مشکل ہی سے ایسا کوئی ہوتا تھا جس سے بات چیت ہو سکتی۔ ان کے آنے پر تو میں بالکل ہی الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جاتی تھی۔ ہاں جو بڑی بوڑھیاں ہماری پھپھیوں سے ملنے آتیں، ان میں سے بعض بہت دلچسپ لگتی تھیں۔

مثلاً حکیم جی کی بیگم تھیں جن کا ہمیشہ ہی پاؤں بھاری رہتا تھا۔ رونا رویا کرتی تھیں کہ ہمارے میاں کی کیا پوچھو ہو۔ نگوڑے بوڑھے کھوسٹ راجوں، مہاراجوں، رئیسوں اور نوابوں کو شباب آور معجونیں چٹاتے چٹاتے خود بھی معجونیں چاٹ کر کم بخت جوانی کی مستی میں ڈوبے رہتے تھے۔" اور وکیل صاحب کی بیگم کا عجب طور تھا کہ جب جاڑے کی رات آتی تو ان پر جن آ جاتا۔ خوب جن تھا کہ عربی اور فارسی کے مستانہ شعر مزے لے لے کر پڑھتا اور اللہ میاں کا مذاق اڑاتا۔ تو اس چکر میں یہ بیگم صاحبہ سال کے سال اجمیر شریف جا کر خواجہ کے مزار پر حاضری دیتیں۔ بھیم نگر کی رانی صاحبہ کی سنو۔ منی پاؤڈر، عطر پھلیل لگا کر گجریا بنی رہتیں۔ ان کے رجہ صاحب کا وطیرہ یہ تھا کہ ہر سال یورپ کا پھیرا لگاتے۔ واپس آتے تو ایک نئی نویلی نوخیز میم بھی ساتھ ہوتی۔ بہانہ یہ بناتے کہ رانی کی مصاحبت کے لیے لایا ہوں۔ ہاں ایک لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ہندوستانی عیسائیوں کی برادری سے تھیں۔ انہیں یہ لت تھی کہ منکروں کے لیے نسخہ لکھتیں تو اس کے پیچھے انجیل کا کوئی حکیمانہ قول نقل کر دیتیں۔

ہاں بابا جان کے یار دوستوں کی بھی تو بیگمات تھیں۔ ٹھاکر بلبیر سنگھ کی دھرم پتنی بڑی کٹر ہندو تھیں۔ مجال ہے کہ ہمارے گھر کی کوئی چیز چکھیں یا گھونٹ پانی بھی پی لیں۔ لیکن تھیں بہت اچھی اور نیک دل۔ کھلے دل والی تھیں۔ تحفے تحائف بہت دیتی تھیں۔ امیر پور کی رانی صاحبہ بڑی کلّے ٹھلّے والی بی بی تھیں۔ ایک زمانہ اس ٹھسے سے گزارا تھا کہ ان کے سامنے کوئی چوں نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے ان کی شخصیت میں ایک وقار پیدا ہو گیا تھا۔ ویسے تو ان کے شوہر بھی بڑے کروفر کے مالک تھے لیکن ان کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے تھے۔ اصل میں ہوا یہ تھا کہ زنان خانے کی ایک خادمہ پر حضور مستی جھاڑنے لگے۔ وہ بھی پگھل گئی۔ رانی صاحبہ کے بھی کان میں کہیں بھنک پڑ گئی۔ بس پھر تو ہنٹر مار مار کے اس کی کھال ادھیڑ دی۔ بس راجہ صاحب رعب میں

آ گئے ۔ کہا کرتے تھے کہ مال دولت دنیا کی ہر عورت کو قابو میں لا سکتے ہیں سوائے اُس کے جو ہماری رانی بیگم کی مصاحبت میں ہو۔

مگر سب سے دلچسپ شے مشتری بائی تھی ۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ ہم دستر خوان پر بیٹھنے لگے تھے کہ مشتری بائی آن وارد ہوئی ۔ کھدر کی سلوٹیں پڑی ساڑھی باندھ رکھی تھی ۔ سفید مائل بالوں کی چٹیا کس کر باندھی ہوئی تھی ۔ دبلی پتلی، رنگ گہرا سانولا، رخساروں کی ہڈیاں نکلی ہوئی، ان کے اوپر کی کھال لٹک گئی تھی، دہانہ چوڑا، ہونٹ موٹے موٹے، دانتوں کی درزیں کھلی ہوئی، پان کا لاکھا ان پر جما ہوا، آنکھیں بڑی بڑی۔ اب ان آنکھوں میں حیرانی ٹھنڈی ہوئی تھی ۔ اب تو یہ آنکھیں حسن کی گدلی گدلی تلیاں لگتی تھیں۔

مشتری بائی نے اندر آ کر جب شائستگی سے جھک کر درباری ادب آداب کے ساتھ فرشی سلام کیا تو گھڑی بھر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی ۔ جواب میں ہم بھی آداب بجالائے ۔ میری دونوں پھپھیوں نے سرک کر اسے اپنے قریب بٹھایا اور کہا کہ کھانا کھائیے ۔ استانی جی اور جمن بی بی کھانے کے لیے ہاتھ دھونے ہی کو تھیں مگر مشتری بائی کو دیکھ کر وہ چپکے سے کمرے میں کھسک گئیں ۔ وہ ٹھہریں پرانے زمانے والیاں، انہیں یہ بات بھلا کہاں برداشت تھی ۔ وہ تو یہ جانتی تھیں کہ بھلے دنوں میں ایسی عورتوں سے پردہ کیا جاتا تھا۔

میں نے مشتری بائی کو پہلی مرتبہ آٹھ برس پہلے دیکھا تھا ۔ میرے ابا جان مجھے اس ممنوعہ کوچے میں لے کر گئے تھے جس کے بالا خانے محرم کے دس دنوں میں بہت ویران نظر آتے تھے کہ ان دنوں سرخی پاؤڈر سے لپے اور گہنے پاتے سے لدے مکھڑے یہاں دکھائی نہیں دیتے تھے ۔ یہاں آنے والے تنگ زینے سے چڑھ کر اوپر پہنچتے تو وہاں سوز خوانی ہو رہی ہوتی یا کوئی نوحہ پڑھا جا رہا ہوتا ۔ مجھے شیشے کا تعزیہ اچھی طرح یاد ہے ۔ نیچے فرش پر سفید براق چاندنی بچھی ہوئی، اردگرد بلوریں لیمپ روشن جن کی روشنی تعزیے پر پڑ رہی تھی ۔ اس سے وہ کیسا جھلمل جھلمل کر رہا تھا ۔ امیرانہ شان رکھنے والے معززین کار چوبی کام کی ٹوپیاں سر پر سجائے، بر میں اچکنیں پہنے بیٹھے تھے ۔ ایک باوقار شریف بی بی میٹھی سریلی آواز میں سوز پڑھ رہی تھی ۔ بعد میں اس بی بی نے مجھے تبرک دیا، سونے چاندی کے ورقوں میں لپٹی ہوئی مٹھائی ۔ یہ ورق ایسے باریک کوٹے ہوئے تھے کہ مٹھائی کھاتے ہوئے میرے ہونٹوں اور انگلیوں میں چپک گئے ۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ابا جان نے مجھ سے کہا کہ بیٹی جیسے میں نے جھک کر آداب کیا ہے ایسے ہی آداب کرو ۔ میں جھک کر بالکل دوہری ہو گئی اور بڑے ان گھڑ طریقے سے ہاتھ کو اوپر لائی ۔ ابا جان ہنس پڑے مگر اس شفقت سے کہ مجھے اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ۔ ابا جان اس سیاہ پوش باوقار سانولی بی بی سے کہنے لگے۔ ''آپ نے جس طرح ہمیں آداب بتائے اور تمیز سکھائی، اس طرح سے تو انگلش گورنس اس بچی کو نہیں سکھا سکتی۔''

مشتری بائی کو دوسری مرتبہ میں نے اس وقت دیکھا جب میں اچھی خاصی سیانی ہو گئی تھی اور سمجھ سکتی تھی کہ مشتری بائی اصل میں طوائف ہے ۔ مشتری بائی نے بڑے بڑے امیروں اور شائستہ و مہذب لوگوں کو

نوازا تھا۔ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس پر دولت پانی کی طرح بہائی۔ مشتری بائی کو خود ہی ایسے لوگوں کے گھر والوں کی حالت پر رحم آ جاتا اور وہ ان سے بگڑ بیٹھتی۔

تیسری مرتبہ میں نے اسے راجہ امیر پور کے پوتے کے بیاہ کے موقع پر مجرے میں دیکھا تھا۔ وہاں عورتیں چقوں کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں چقوں کی باریک درزوں میں سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے سونے کے کام والا بھاری جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کے گہنے میں جڑے ہوئے قیمتی نگ ایسے چمک رہے تھے کہ مجھے بے ساختہ وہ تعزیہ یاد آ گیا جو بلوریں جھاڑ کے عکس سے جھل جھل کر رہا تھا۔ اس سے پہلے دوگانے والیوں نے آ کر گایا تھا۔ دونوں ہی کی بھری جوانی تھی۔ خوب سرخی پاؤڈر لگا رکھا تھا اور شوخیاں دکھا رہی تھیں۔

فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی جہاں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں کھلی جگہ تھی جہاں مجرا ہو رہا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لال سنہری جھروکہ نظر آ رہا تھا جہاں نوشہ میاں سنہری روپہلی بادلے کے تاروں سے بنا ہوا سہرا باندھے بیٹھے تھے۔ حاضرین میں کیا بوڑھے، کیا جوان، کار چوبی کے کام والی تمامی کی اچکنیں زیب تن کیے، سروں پر میڑھی ٹوپی جمائے بیٹھے تھے اور مغنیہ کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ اس کا گانا تو کیا سن رہے تھے اس کے نسوانی حسن پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ جب مغنیہ سنگت کرنے والوں کے جلو میں نمودار ہوتی تو سیکڑوں گھورتی آنکھیں اس طرف اٹھ جاتیں اور فقرہ بازیاں ہونے لگتیں۔ خدمت گار لال لال وردیاں پہنے، ہاتھوں میں سونے چاندی کے ورقوں میں لپٹے پان کے بیڑوں سے بھری چاندی کی تھالیاں لیے آ جا رہے تھے۔ پردے کے پیچھے بی بیاں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، قہقہے لگا رہی تھیں اور کانا پھوسی کر رہی تھیں۔

آخر مشتری بائی کی باری آئی۔ اس کا سارنگی نواز دبلا پتلا آدمی تھا۔ سارنگی بجاتے ہوئے آنکھیں موند لیتا تو بالکل یوں لگتا جیسے عبادت میں محو ہے۔ طبلہ نواز کا یہ عالم تھا کہ اس کے سارے رگ پٹھے بل کھاتے نظر آتے جیسے طبلے کی گت سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش میں اذیت کھینچ رہے ہوں۔ مشتری بائی نے گانا شروع کیا۔ اپنی سریلی آواز میں پہلی ہی تان لی تو مجمع پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔ کمال ہنر نے دل و دماغ کو مسخر کر لیا۔ اس کا سچا سُر اور جذبے میں ڈوبی ہوئی آواز روح پر جادو بن کر چھاتے چلے گئے۔ خدمت گار کہاں تُرت پُھرت چل پھر رہے تھے اور کہاں دم بخود کھڑے رہ گئے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ لال لال استفہامیہ نشان نصب ہیں۔

جب گانا ختم ہوا تو واہ واہ سبحان اللہ کا وہ شور بلند ہوا کہ الامان۔ لوگ جوش میں کھڑے ہو گئے اور اس کے قدموں میں چاندی کے روپوں، سونے کی اشرفیوں اور نوٹوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ وہ جھک کر آداب بجا لائی اور بڑی انکساری سے داد دینے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ جب وہ محفل سے رخصت ہوئی تو ایسے لگا کہ اپنے فن کا وقار بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ بعد میں جو نوخیز گانے والیاں آئیں تو پھر وہی خرمستیاں شروع ہو گئیں۔

اور آج وہ ہمارے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے بولنے پر احساس ہوا کہ اس کی آواز اب ایک کرب ناک سرگوشی ہے۔ اصل میں بیماری نے اس سے اس کی آواز چھین لی تھی۔ زندگی میں جو گناہ کیے تھے اس کی تلافی اب اس طرح کر رہی تھی کہ اللہ سے لو لگا لی تھی۔ اپنی ساری دولت یہ سوچ کر کہ یہ گناہ کی کمائی ہے، غریبوں میں بانٹ دی اور خود فقیرنی بن کر ماری ماری پھرنے لگی۔ کبھی کبھار چلتی پھرتی ان گھروں پر جا کر دستک دیتی جن گھر والوں نے اس کی شان و شوکت کے دن دیکھے تھے۔ میری پھپھیاں اس کا بہت احترام کرتی تھیں۔ اب انہوں نے اس سے پردہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جب وہ آتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس کی ضرورت اسے یہاں کھینچ لائی ہے۔ لیکن اس عالم میں بھی اس کا بچا کھچا وقار کسی کو اس پر ترس کھانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

کہنے لگی کہ ''آج شام میں ادھر سے گزری تو سوچا کہ ذرا بابا جان کی خیریت معلوم کرتی چلوں۔'' عابدہ پھپھی کہنے لگیں کہ آپ کا آنا تو بہت اچھا ہوا۔ میں جو جمعرات کی جمعرات مسجد میں تقسیم کے لیے رقم بھیجا کرتی تھی وہ ابھی تک نہیں بھیج پائی۔ بڑی مہربانی ہوگی کہ آپ مجھ سے یہ رقم لے لیں اور مستحقین میں تقسیم کر دیں۔

کھانے کے بعد وہ زیادہ نہیں رکی۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اپنی ساڑھی کی سلوٹوں میں گھسا رکھا تھا۔ اور سب ایسے بن رہے تھے جیسے انہوں نے یہ بات دیکھی ہی نہیں ہے۔ میں نے اکیلی نے ہی تو یہ نہیں دیکھا تھا کہ وہ روٹی کے ٹکڑے چھپا کر اپنی ساڑھی میں رکھ رہی تھی۔

دسواں باب

وہ محرم کا پہلا ہفتہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے عابدہ پھپھی کو مشورہ دیا کہ حامد صاحب کو بلوا لیجیے۔ ایک مرتبہ پھر گھر کی فضا سخت بوجھل ہوگئی۔ گھر کی فضا میں منڈلاتا یہ غم، لگتا تھا کہ عالمگیر بنتا جا رہا ہے۔ رات ہونے پر محسوس ہوتا کہ اس نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اس کی گونج تاروں بھرے آسمان تک پہنچ رہی ہے۔ رات کی تاریکی میں، جس میں ابھی تک سردی کی لہر سرسرا رہی تھی، گریہ کی آوازیں ایک آہنگ کے ساتھ بلند ہوتیں اور پھر نالہ و ماتم میں ڈھل کر ایک واضح شکل اختیار کر لیتیں۔۔۔۔۔"یا حسن، یا حسین، حسن، حسین، سین سین۔"

باباجان اس سے بڑھ کر اور کیا اپنے زور واثر کا مظاہرہ کرتے کہ انہوں نے منزلِ مرگ کی جانب کوچ کرنے کے لیے ان ایام کا انتخاب کیا جب برہنہ بازوؤں والی سیاہ پوش بیبیاں اور برہنہ سر، برہنہ پا مرد خاندانِ رسالت کے شہدا کا سوگ کر رہے تھے۔

عابدہ پھپھی اور ماجدہ پھپھی اب باباجان کے کمرے سے باہر کم کم ہی نظر آتی تھیں۔ اور اب جب میں اور زہرا صبح و شام آداب بجالانے کے لیے اس کمرے میں حاضری دیتے تو وہ آنکھیں موندے چپ چاپ پڑے نظر آتے۔ ذرا جو کوئی ایسا اشارہ ملتا ہو کہ انہیں ہمارے آنے کا پتہ چل گیا ہے۔ بس ہم خاموش کھڑے رہتے اور پھر وہاں سے سرک آتے۔ ان کے احباب مقررہ وقت پر حاضری دیتے لیکن زبان صرف اس وقت کھولتے جب اس خاموش کمرے سے باہر نکلتے۔

نوکرانیوں کے احاطے میں روز رات کو کھانے کے بعد استانی جی اپنے لڑکھڑاتے حافظے پر زور ڈال کر جہاں تہاں سے مرثیے کے بند یاد کرتیں اور اپنی کانپتی اور جھرجھراتی آواز میں ہولے ہولے نوحہ خوانی کرنے لگتیں۔ ایک شب انہوں نے اسد سے کہا کہ بیٹا! آج تم مرثیہ خوانی کرو۔ شعر حزنیہ ہوں یا طربیہ اسد کچھ اس طرح ترنم سے پڑھتا تھا کہ ان میں جان ڈال دیتا تھا۔

وہ نویں کی شب تھی۔ افق پر کچھ اس قسم کی سرخی دمک رہی تھی جیسی چاند کے ڈوبنے سے ذرا پہلے سورج کے طلوع کے اثر سے نمودار ہوا کرتی ہے۔ یہ دمکتی سرخی ان سیکڑوں، ہزاروں چراغوں کی مرہونِ منت تھی جو تعزیوں اور علموں سے آراستہ امام باڑوں میں روشن تھے۔ اس دمکتی سرخی سے پورا آسمان منور نظر آ رہا تھا اور

شہر اس خلقت کے طفیل زندہ تابندہ دکھائی دے رہا تھا جو ماہ عزا کے تابندہ جمال میں کھوئی ہوئی تھی۔ ہر سمت سے نالہ و ماتم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان کے بیچ ہمارا گھر ایک جزیرے کی مثال نظر آتا تھا۔

اسد کی مرثیہ خوانی سننے کے لیے ہم بھی گئے۔ اسد ہی کے برابر بانوں والی چارپائی پر ہم بھی بیٹھ گئے۔ نوکرانیاں پھسکڑا مار کر فرش پر بیٹھ گئیں۔ استانی جی اور حجن بی بی دوسری چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے شالوں میں منہ دیا ہوا تھا۔

اسد نے جھجکتے اور شرماتے ہوئے مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ زہرا کی موجودگی کا احساس بھی تو اپنا کام دکھا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ شاعری نے سحر کرنا شروع کیا۔ پھر تو ایسا سماں بندھا کہ یا اس کی آواز سنائی دے رہی تھی یا بوڑھی عورتوں کی آہیں۔ جب اس نے نبی کے پیاروں کی تشنگی کا ذکر شروع کیا کہ کس طرح اعدا نے فرات پر پہرے بٹھا کر ان پر پانی بند کیا اور پیاس سے وہ کیسے تڑپ رہے تھے تو بیبیوں نے ہولے ہولے سسکیاں بھرنی شروع کر دیں۔ استانی جی چھاتی پیٹنے لگیں۔ ساتھ میں ایک دھیمے آہنگ کے ساتھ کہتی جاتی تھیں: حسن، حسین، حسن، حسین۔ رمضانو حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔ دوسری بیبیاں ابھی تک ہولے ہولے ہی رو رہی تھیں۔ اسد کی آواز میں بہت درد اور سوز تھا۔ ماتم کرنے والے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ حسن، حسین کی لے میں بھی تیزی آ گئی۔ حسن حسین، حسن حسین، ہسین ہسین ہسین ہسین۔ رمضانو کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ فضا میں ایک ارتعاش تھا اور ایک تناؤ کی کیفیت۔ حسن، حسین کی صدائیں اور زیادہ بلند ہو گئی تھیں۔ ماتم اور زیادہ تیز ہو گیا اور تیز ہوتا چلا گیا۔ رمضانو نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر گئی۔ اسد نے مرثیہ پڑھنا بند کر دیا۔

''خاموش! آواز نہ نکلے۔'' حکیمن بوا نے اچانک سرزنش کرنی شروع کر دی۔ یہ بھول ہی گئیں کہ خود ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''احمق لڑکی! باہر آواز چلی گئی تو کیا ہوگا۔ بس کرو اب، کہیں عابدہ بٹیا نہ سن لیں۔''

سلیمن لپک جھپک جا کر پانی لے آئی اور رمضانو کے تشنج زدہ چہرے پر چھینٹے مارنے شروع کر دیے۔ کس تیزی سے ہم معمولات کی دنیا میں واپس آ گئے۔ اور رمضانوں کا معاملہ تو یہ تھا کہ دونوں ہی کاموں کے لیے تیار بیٹھی رہتی تھی۔ قہقہے لگانے کے لیے بھی اور رونے پیٹنے کے لیے بھی۔

''رمضانو کو ہزار سے ضرب دے دو۔'' زاہد کہنے لگا۔ ''کل میزان وہ منافقت ہوگی جو محرم کی مجالسِ عزا کا خاصہ ہے۔''

''وہ منافقت نہیں ہوتی۔'' زہرا نے چیخ کر کہا۔ ''وہ سچا غم ہے۔''

''کیا سچا غم منصوبہ بندی کا محتاج ہوتا ہے؟ آواز سے آواز ملا کر نالہ کرتا ہے؟ آنسو مرثیہ خواں کی مرضی کے تابع ہوتا ہے؟ اس نے اشارہ کیا اور آنسو بہنے شروع ہو گئے، پھر چل سو چل۔ گریہ برائے گریہ کا

سماں ہوتا ہے۔ جب ہی تو اتنی جلدی رو کر فارغ بھی ہو جاتے ہیں۔ گھڑی بھر پہلے گریہ وزاری ہو رہی تھی اور سینہ پیٹا جا رہا تھا اور اب مزے سے گلوریاں منہ میں چل رہی ہیں۔ آمد و خرچ کی باتیں ہو رہی ہیں اور بدنظمی کی شکایتیں ہو رہی ہیں۔'' زاہد بولے چلا جا رہا تھا۔

اسد گہری سوچ والے لہجے میں بولا'' میں سمجھتا ہوں کہ آدمی اپنے نجی غم کو کسی اجتماعی غم کے ساتھ پیوست کر دے تو یہ اچھی بات ہے۔ تنہائی کے غم میں بہت اذیت ہے۔ لیکن اگر غم میں منافقت آ جائے تو یہ بہت مذموم بات ہے۔ یہ تو درد والم جیسی سچائی کے خلاف جرم کا ارتکاب ہے اور میرے نزدیک تو لے دے کر یہی ایک سچائی ہے۔'' زہرا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

''لیکن یہ غم سراسر منافقت ہے۔'' زاہد کو اپنی بات پر اصرار تھا۔

''چپ ہو جاؤ۔'' زہرا چلا اٹھی۔

''چپ ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ لوگ ہسٹیریا کے مارے ہوئے ہیں۔ مذہب ان کے لیے اس جنون کی نکاسی کا وسیلہ ہے۔ آج سے تیرہ سو برس پہلے کے تاریخی واقعات کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق کا بیج بوتے ہیں جب کہ اس وقت مسلمان خطروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ ان میں اتحاد ہو۔''

''زاہد میاں'' میں نے پوچھا۔

''تم جو یہ نفرت کا زہر اگل رہے ہو، اس سے اتحاد پیدا ہو گا؟ تمہاری یہ نفرت نہ مسلمان کو دیکھتی ہے نہ غیر مسلم کو۔''

''جو بھی اسلام کے دشمن ہیں مجھے ان سے نفرت ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہوں۔ میں اسلام کے لیے جان بھی دینے کو تیار ہوں۔''

''اور دوسروں کی جان لینے کے لیے بھی۔ اللہ کے نام پر لوگوں کو قتل کرو گے تو قتل تھوڑا ہی کہلائے گا۔''

''لیلیٰ آپا کن کتابوں میں آپ نے یہ باتیں پڑھی ہیں؟'' زاہد تضحیک پر اتر آیا۔

''زاہد مجھے تم پر رشک آتا ہے۔'' اسد نے بہت آہستگی سے کہا۔

''تمہارے یقین اور اعتماد پر رشک آتا ہے۔ میں تو کوئی بات بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، سوائے اس بات کے کہ نفرت سے نفرت ہی جنم لیتی ہے۔ نفرت اور تشدد، غم اور الم۔ دوسروں کو غم والم میں مبتلا کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے، بے شک ہم اپنی جان پر غم سہہ لیں۔''

''میں بور ہو گئی ہوں، تھک چکی ہوں یہ باتیں سن سن کر۔'' زہرا بیچ میں بول اٹھی۔ اس کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔ ''کیا صحیح ہے، کیا غلط ہے یہ مسئلے اپنے کمرے میں جا کر طے کرو۔ ویسے بھی تمہیں بہت

پہلے اپنے کمرے میں چلا جانا چاہیے تھا یا حکیمن بوا کا انتظار کر رہے ہو کہ وہ آ کر تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں۔"

اسد نے حیران ہو کر کسی قدر تکلیف کے احساس کے ساتھ زہرا کو دیکھا لیکن زہد نے کمرے سے نکلتے ہوئے اپنے اس تضحیک آمیز انداز میں کہا۔" زہرا آپا! اپنی زبان کو زنجیروں میں لٹکے ان چاقوؤں کی طرح تو آپ استعمال نہ کریں جنہیں کل جلوس میں ماتمی اپنے آپ کو مار مار کر گھائل کریں گے۔"

جب ہم اپنے اندھیرے کمرے میں لیٹے کروٹیں لے رہے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ کسی طرح نیند آ جائے تو میں کہنے لگی۔" میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ ویسے تو زاہد ایسا مرجیو نا دکھائی دیتا ہے، ننھی سی جان ہے اور چہرہ دیکھو تو پیلا پھدق لیکن اس کے اندر نفرت منوں کے حساب سے بھری ہوئی ہے۔"

زہرا ایسے بولی اس کے اندر غصہ پل رہا ہو۔ کہنے لگی" مجھے تو اس سے زیادہ اسد پر غصہ آتا ہے۔ اس کی حالت تو ایسی ہے جیسے کوئی دوغلی نسل کا کتا ہو۔ اسے لاتیں مار مار کر بھگاؤ مگر وہ ٹانگوں میں دُم دبائے پھر تمہاری طرف آئے گا۔"

پھر اس نے جمائی لی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔

گیارہواں باب

دوسرے دن صبح کو ہمیں بتایا گیا کہ پرانے شہر جا کر جلوس دیکھنے کا پروگرام موقوف۔ آپ لوگ وہاں نہیں جا سکتے۔ یہ پیغام مسز مارٹن کو بھی بھجوا دیا گیا۔ وجہ صرف اتنی نہیں تھی کہ بابا جان کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اس کے سوا یوں تھا کہ محسن چچا نے، جنھیں شہر خبر و کہنا چاہیے، خبردار کیا تھا کہ شہر میں افواہ گرم ہے کہ جلوس کے موقع پر فساد ہوگا۔

جیسے کوئی چھجا پکڑے لٹکا ہو اور نیچے بہت گہرائی ہو، ایسے شخص کے چہرے پر جو کیفیت اور کھنچاؤ ہوگا بس عابدہ پھپھی کا چہرہ کچھ ویسا ہی ہو رہا تھا۔ ماجدہ پھپھی مستقل بڑبڑاتی رہتی تھیں کہ "حامد بھائی جانے کب آئیں گے۔ ایسے وقت میں تو انھیں یہاں ہمارے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ کیا وہ سرکار کے زرخرید ہیں۔ ارے آخر وہ کب آئیں گے۔"

زہرا اور میں دونوں بہت بے کل ہوئے پھرتے تھے اور ہر ایک سے لڑنے کو دوڑتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے اس لیے کہ بابا جان قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ ان کا آخری وقت لمبا کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری بے کلی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہم جلوس دیکھنے کے لیے جانا چاہتے تھے۔ اس بہانے گھر سے نکلنے کی صورت تو پیدا ہوتی۔ بڑے جلوس سے تو ہم گئے۔ بس اب ان چھوٹے چھوٹے جلوسوں پر ہی صبر کرنا تھا جو ہماری طرف سے گزر کر بڑے جلوس میں جا شامل ہوتے ہیں۔

رمضانو اور سلیمن بھی آ کر ہمارے ساتھ پورچ کی چھت پر بیٹھ گئیں۔ اس چھت کے اردگرد جو جالی دار دیواریں تھیں، ان کی جالیوں سے جھانک کر ہم باہر دیکھ رہے تھے۔ اب چونکہ نندی کو تو نکال باہر کر دیا گیا تھا اس لیے ان دونوں سے میری اب زیادہ باتیں ہونے لگی تھیں۔ وہ تھیں تو نری گاؤدی مگر بہت ہشاش بشاش نظر آتی تھیں۔ مجھ سے اور زہرا سے ان کی عمریں کچھ ایسی زیادہ نہیں تھیں۔ ویسے تو کالی کلوٹی تھیں اور چہرے چیچک کے داغوں سے لپے ہوئے تھے لیکن جوانی کا اپنا حسن ہوتا ہے اس لیے وہ بدصورت دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جوانی کے لطف سے محروم تھیں کہ پابندیاں بہت لگی ہوئی تھیں۔ سارا جوشِ جوانی گھٹ کے رہ گیا تھا۔

جس دن سے بوجھ اٹھانے لائق ہوئیں اسی دن سے گھر میں ماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ اس

کے آخری وقت تک جب وہ تپ دق سے مری ہے اس کے سارے کاموں میں ہاتھ بٹاتی رہیں۔ اس عورت کو کال کے زمانے میں خریدا گیا تھا جب وہ ابھی بچی تھی۔ میری دادی اماں نے اس کی پرورش کی تھی۔ خادمہ کے طور پر اس کی تربیت کی۔ جب بڑی ہوگئی تو ایک نوجوان سے اس کا بیاہ کر دیا۔ اس نوجوان کا گھرانا پشتوں سے ہمارے خاندان کا خدمت گزار چلا آ رہا تھا مگر ایک آیا کے چکر میں آ کر اس نے اس کو چھوڑ دیا۔ ساتھ میں بیٹیوں کو بھی چھوڑ گیا۔ وہ آیا بڑی طرح دار تھی۔ لال کوٹ اور سر سراتا سایہ اس کا پہناوا تھا۔ ایک انگریز خاندان کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ وہیں اس نے اس نوجوان کو بھی رکھوا دیا۔

سورج چڑھ کر گرجا گھر کے مینار کے عین اوپر آ گیا تھا۔ اُس وقت ہمیں دور سے حسن حسین، حیدر کی صدائیں سنائی دیں۔ صدائیں قریب آتی گئیں۔ ان صداؤں کے ساتھ ہی ماتم کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ان کے ساتھ ایک ہی گت پہ بجتے ہوئے تاشے اور جھانجھ۔ ان آوازوں سے میرے اندر ایک عجیب قسم کا اشتیاق کروٹیں لینے لگا۔ اسی آن برہنہ سر، برہنہ پا لوگ نمودار ہوئے کہ کاندھوں پر تعزیے اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ قسم قسم کے تعزیے، مور کے پروں کا تعزیہ، کانچ کا تعزیہ، کھانڈ کا تعزیہ، شوخ رنگ پتنگیا کاغذ کا تعزیہ۔ کتنے خوبصورت، کتنے باریک اور نفیس کام والے تعزیے تھے۔ ہر تعزیے میں محرابیں اور گنبد بنے ہوئے تھے۔ ٹیلی گراف کے کھمبوں کے برابر اونچے اونچے۔ چھوٹے چھوٹے اور اتنے ہلکے کہ ایک تعزیے کو اکیلا ایک آدمی سر پر ٹکا کر چل سکتا تھا۔ یہ سب تیز تیز قدم اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ جلدی میں تھے کہ مقررہ وقت پر بڑے جلوس میں جا ملیں۔ انہیں ان تعزیوں کو دفن بھی تو کرنا تھا۔

زہرا ٹھنڈا سانس بھر کر کہنے لگی "ہائے کیسا اچھا ہوتا کہ ہم امیر پور کے سونے چاندی والے تعزیے کی زیارت کر لیتے۔"

"اور وہ جو آبنوسی تعزیہ ہوتا تھا، اس کے پیچھے پیچھے چپ چاپ چلتے ہوئے سیاہ پوش عزادار۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔

"بٹیا! مورا تو ڈلڈل دیکھنے کو جی کرے ہے۔ بالکل ایسے لگے ہے جیسے دولہا ہو۔ چاندی کی زین، سونے کی لگام۔" یہ رمضانو تھی جو دلہن بننے کے لیے تلملاتی رہتی تھی۔

"اری رمضانو!" سلیمن چھیڑتے ہوئے بولی۔

"میں تو جانوں ڈلڈل کو جو دودھ جلیبی ملے ہے، وہ کھانے کو تیرا جی کرے ہے۔ پر یہ سوچ اس کے بعد کیا ہوگا۔ پھر وہی تانگہ اور وہی تانگے والے کا چابک۔"

"اری مجھے تو پیاس لگ رئی اے" رمضانو بولی "نگوڑے سورج میں تو ایسی تیزی ہے کہ کیا کسی چابک میں ہوگی۔ پرے اس نکڑ پہ جمن دھوبی نے شربت کی سبیل لگا رکھی ہے۔ سب پیاسوں کو شربت پلا رہا ہے۔ واں پہ ہوتی، مجھے بھی شربت مل جاتا۔ اس کی جورو نے اسے مار باندھ کے بھیجا ہے کہ جا، جا کر منت مان

کہ تیرا بیٹا ہووے۔ تو اس محرم میں وہ جتن کر رہا ہے کہ اللہ رسول سے راضی ہو جائیں۔

"پچھلے برس کی بات ہے" سلیمن بیچ میں بولی "کہ اس نے ہنومان جی سے منت مانی تھی۔ قسم کھائی کہ میں چت لیٹ کے یاں سے ندیا پار مندر تک سرکتا سرکتا جاؤں گا۔ اور سڑکیں اُس وخت جلتا توا بنی ہوئی تھیں۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے۔ وہ ہے بھی تو لمبو۔" رمضانو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اری کم بختو" میں نے جھوٹ موٹ کی ڈانٹ بتاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری چھاتی میں بہت سانس ہے کیا جو دم ہی نہیں لے رہیں۔ جیسے ندی کنارے جھینگر چیں چیں کرتے ہیں ویسے ہی چیں چیں کیے چلی جا رہی ہو۔"

"نہیں، جیسے مینڈک ٹرٹراتے ہیں۔" زہرا نے ہنس کر کہا۔ "اچھا اب یاں سے چلیں۔ اس سے پہلے کہ حکیمن بوا یاں آ کے چٹیا سے پکڑ کے تمہارا دم نکال دیں، یاں سے چلتی بنو۔ اور اب دیکھنے کو کیا رہ گیا ہے۔ چلو نیچے چلیں۔"

دھوپ میں اونچے درختوں کے پتے پژمردہ دکھائی دے رہے تھے۔ دور فاصلے پر گرجا گھر کا کلس آسمان کو گھور رہا تھا۔ آسمان پر سفید بادل ایک خواب آور کیفیت میں ڈوبے اس کنارے سے اُس کنارے تک تیرتے بہتے دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان کے عکس سے گرجا گھر کا کلس نیلا نیلا لگ رہا تھا۔ کوئے یوکلپٹس کے درختوں پر بیٹھے کائیں کائیں کر رہے تھے۔ بھورے اور سفید چینی کبوتر پھڑ پھڑاتے ہوئے نوکروں کے کوارٹروں کی سمت میں اڑتے جا رہے تھے۔ بہت بلندی میں ایک شکرا اس طرح اڑ رہا تھا جیسے بہتا چلا جا رہا ہو۔

"اے زہرا بٹیا اور اے لیلیٰ بٹیا!" آخر رمضانو نے خاموشی کے طلسم کو توڑا۔ "اگر حکیمن بوا کچھ کہنے لگیں تو کہہ دیجیو کہ انہیں ہم ساتھ لائے ہیں۔"

"نہیں تو یہی کہیں گی کہ فلاں فلاں کام ادھورا چھوڑ آئی ہو۔ اور پھر ڈانٹ پھنکار کرنے لگیں گی۔" سلیمن نے ٹکڑا لگایا۔

زہرا نے شرارتاً کہا "ارے ڈانٹ پھٹکار سے کسی کا کیا جاتا ہے۔"

اس پر میں نے کہا "میں ان سے کہہ دوں گی کہ بوا ان لڑکیوں کو مارتے ہوئے ہاتھ ذرا آہستہ رکھو۔"

رمضانو اور سلیمن ٹھٹھا مار کر ہنس پڑیں۔ ان کی باتوں سے زیادہ بامعنی اور موثر تو ان کے ٹھٹھے ہوتے تھے۔ ان کے ٹھٹھوں سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی خفیہ معاملہ ہے جس کے سلسلے میں وہ ایک دوسرے کی رازداں بنی ہوئی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی نے انہیں ایسے موقع فراہم کرنے میں ہمیشہ

بخل ہی سے کام لیا۔

جب ہم زینے سے اتر کر نیچے پہنچے تو ہنسی ٹھٹھے غائب۔ پھر وہی پریشانی کا گھٹا گھٹا ماحول تھا اور ہم تھے۔

''اب کیا کریں؟'' زہرا نے سوال اٹھایا۔

''بھئی ہمارے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' میں نے اپنی کنپٹیوں کو دباتے ہوئے کہا۔

''بٹیا تمہارے سر پر مالش کر دوں؟'' رمضانو بولی۔

''لاؤ تمہارے پاؤں داب دوں۔'' سلیمن نے کہا۔

''تا کہ حکیمن بوا کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچ جاؤ، ہے ناں؟ یا تمہیں بلا لیں کہ اِدھر آؤ۔ کیوں ہے نا یہی بات؟'' زہرا نے کہا۔

''وہ دونوں پھر ٹھٹھے لگانے لگیں اور سلیمن بولی'' اگر اس وقت ہم ان کے پاس چلے گئے اور کہیں انہوں نے بھانپ لیا کہ ہم ہنس رہے تھے تو جن بی بی اور استانی جی ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ جاویں گی۔ تو بٹیا ہمیں یاں تنک بیٹھا رہنے دو۔''

میں اپنے بستر پر دراز تھی۔ ان کے آہستہ آہستہ دبانے سے مجھے بہت آرام مل رہا تھا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ جانے کس وقت وہ اٹھ کر چلی گئیں، مجھے تو پتہ چلا نہیں۔ میری اس وقت آنکھ کھلی جب مجھے زہرا نے جھنجھوڑا۔'' کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ سب تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔''

بڑی الکساہٹ کے ساتھ میں اٹھی اور بولی'' چھت پہ دھوپ بہت تیز تھی۔ مجھے تو گمان بھی نہیں تھا کہ اتنی تیز دھوپ ہوگی۔ زہرا بی بی اس کا مطلب یہ ہے کہ گرمیاں سر پہ آئی کھڑی ہیں۔ مجھے تو گرمیوں کے خیال ہی سے وحشت ہوتی ہے۔ مگر خیر اس کا ایک فائدہ تو ہے کہ دوزخ کی زندگی کے لیے ہماری تیاری ہو جائے گی۔''

''میں تو تمہیں وہاں نظر نہیں آؤں گی۔ میں تو جنت میں ہوں گی۔ ویسے میں جنت میں تمہیں یاد بہت کروں گی۔''

''ہاں تم تو وہاں لمبی لمبی داڑھیوں والے بڈھے ٹھڈے مولویوں کا دل بہلا رہی ہو گی۔''

ہم ہنسنے لگے۔ پھر ایک دم سے ٹھٹھک گئے جیسے ہم سے کوئی جرم ہو گیا ہو۔

بارہواں باب

کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ اب تو ہم جب بھی اکٹھے ہوتے تھے، خاموش ہی رہتے تھے۔
عابدہ پھپھی کہنے لگیں "اسد اور زاہد نظر نہیں آ رہے۔ تمہیں کہیں دکھائی دیے؟"
زہرا اور میں نے ساتھ ساتھ نظریں اٹھا کر دیکھا۔ میں نے جواب دیا۔ "نہیں، شہر میں جلوس دیکھنے نکل گئے ہوں گے۔"
ماجدہ پھپھی بگڑنے لیں۔ "محسن بھائی نے آ کر جو بتایا تھا اس کا نہیں پتہ تھا۔ پھر بھلا وہ کیوں چلے گئے؟"
ہم سے اس کا کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ مگر جب ہم ہاتھ دھو رہے تھے تو حکیمن بوا گھبرائی ہوئی آئیں "بٹیا، خانساماں کا بھیا ابھی ابھی بڑے بازار سے آیا ہے۔ ارے وہ کہوے ہے کہ واں پہ تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے لوگ مارے گئے ہیں۔"
"ہئے ہئے! اللہ رحم کرے۔" ماجدہ پھپھی نے سینہ پیٹ لیا۔
"قیامت! کیسی قیامت؟ کون مارا گیا؟" عابدہ پھپھی کی کوشش تھی کہ ان کے لہجے سے کسی پریشانی کا اظہار نہ ہو۔
"اب یقین سے تو کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چپے چپے پہ تو نگوڑی پولیس کھڑی ہے۔ پر جس جگہ فساد ہوا ہے واں سے دور گلیوں میں چھرے بازی ہوئی ہے۔ دیکھنے والوں نے اپنی آنکھوں سے زخمیوں کو دیکھا ہے۔" حکیمن بوا کے لہجے میں ایک فخر کا رنگ جھلک رہا تھا جیسے دل ہی دل میں فخر کر رہی ہوں کہ ایسی ہنگامہ خیز خبر پہلے پہل انہوں نے آ کر سنائی ہے۔
ماجدہ پھپھی چلانے لگیں۔ "ہائے اللہ! یہ کم بخت لڑکے کہاں چلے گئے؟"
"حکیمن بوا!" عابدہ پھپھی نے بیتابی سے پوچھا۔ "آخر ہوا کیا؟ کس جگہ ہوا؟"
"خانساماں کہوے تھا کہ اس کے بھتیجے نے اسے بتایا تھا۔ پھول گنج والی سڑک پہ ہوا تھا۔ کہویں ہیں کہ گاؤں والے تھے۔ اپنا تعزیہ لے کر بڑے جلوس کی طرف جاوت تھے۔ راستے میں آ گیا پیپل، ہنومان جی کے مندر کے پاس۔ ان کے تعزیے کی چوٹی پیپل کی ٹہنیوں میں الجھ گئی۔"

''ارے ان بخت ماروں نے تھوڑی احتیاط کر لی ہوتی۔'' ماجدہ پھپھی چبا چبا کر کہنے لگیں ''پیپل کے پیڑوں میں بھوت پریت کا بسیرا ہوتا ہے۔ ان کے اثر سے کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔''

حکیمن بوا اسی طرح جاری تھیں ''اے بٹیا، کیا ہو سکے تھا۔ پیپل کی ٹہنی کاٹتے تو ہندو بگڑ جاتے۔ لیکن بی بی کوئی شرات پہ اتر آوے تو اس کے سو طریقے ہیں۔ کسی کم بخت نے مندر میں جا کے سنکھ پھونکنا شروع کر دیا، یہ پتہ ہوتے ہوئے بھی کہ باہر تعزیے نکل رہے ہیں۔ یہ ہندوانہ شور سن کر کسی سر پھرے نے مندر میں روڑا پھینک دیا۔ لو بی بی واں پہ تو لڑائی بھڑک اٹھی۔ اور تم جانو کہ فتنہ فساد کی بات تو ایسے پھیلے ہے جیسے سوکھی گھاس میں آگ۔ خانساماں کا بھیا کہوے تھا کہ پولیس سڑکوں پہ ایسی بھری ہوئی ہے جیسے گرمیوں کے دنوں میں مکھیں بھنبھنا رہی ہوں۔ پر وہ کہاں کہاں پہ جاویں گے۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں جا کر تو نہیں جھانکیں گے۔ اللہ ہی جانے آج کس کس کی موت کا بلاوا آوے گا۔ بس اللہ ہم پہ رحم کرے۔'' حکیمن بوا نے ٹھنڈا سانس بھرا اور سر کو جنبش دی۔

''ارے یہ بخت مارے نصیبو جلے، انہیں آج ہی گھر سے نکلنا تھا۔'' ماجدہ پھپھی کو تو ایک رٹ لگ گئی تھی۔

''کیا خبر ہے وہ مردوا اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کے کہہ رہا ہو۔'' عابدہ پھپھی بیزاری کے ساتھ بولیں ''لیکن خبردار کسی نے باباجان کے سامنے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا یا کوئی ذرا سا اشارہ بھی کیا۔'' ان کی نظر پل بھر کے لیے بہن پر جا کر ٹک گئی۔ پھر انہوں نے سر پر آنچل لیا اور باباجان کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

حکیمن بوا اپنی بات پر اڑی ہوئی تھیں ''اے واہ! وہ ڈوبا تو سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ کے آیا ہے۔'' ماجدہ پھپھی اللہ میاں کی بدنصیب مخلوق کے حال پہ گریہ کر رہی تھیں۔ زہرا کس غور سے سن رہی تھی، بیچاری پیلی ہلدی ہو گئی تھی۔ میں تو اٹھ کر چلی آئی۔

میں نے کتاب پڑھنے کی کوشش کی لیکن دل پڑھنے سے اچاٹ تھا۔ بار بار اسد اور زاہد کا دھیان آ جاتا تھا کہ بیچارے جانے کس مصیبت میں ہیں۔ شہر کے مشتعل ہجوم میں پھنس گئے ہیں یا پیچ کھاتی تنگ گلیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں یا ان گلیوں کے گھیچ پیچ گھروں میں پناہ لینے کے لیے بھاگتے پھر رہے ہیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جگہ کہیں بہت دور ہے۔ جیسے وہ درختوں سے آراستہ چوڑی سڑک جو ہمارے اس خاموش گھر کے پاس سے چلتی ہوئی، پارکوں میں سے ہوتی ہوئی محلات اور باغات کو چھوتی ہوئی دھیرے دھیرے بہتی ہوئی ندی کے برابر سے گزرتی ہوئی شہر کے قلب کی طرف جاتی ہے، وہ گویا ایک دنیا سے گزر کر بالکل دوسری دنیا میں جا نکلتی ہے۔

چار بجے کے بعد جب زاہد آیا تو یوں سمجھ لو کہ ہم سب کی ساری فکر و پریشانی سمٹ کر عابدہ پھپھی کے غصے میں اکٹھی ہو گئی تھی۔ بس وہ اس غریب پر ایک دم سے پھٹ پڑیں۔ اے وہ وہ سنائیں اور ایسی غیظ

بھری نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ بیچارہ کانپنے لگا۔ اسد کے متعلق وہ کیا بتاتا، وہ دونوں اکٹھے تھوڑا ہی گئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ جلوس کے بعد یونیورسٹی کے قریب جو دوست کا گھر ہے وہاں ملیں گے۔ لیکن وہ مجمع کے بگڑتے تیور دیکھ کر بھانپ گیا کہ یہاں تو گڑبڑ کے آثار ہیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ پولیس دم بدم چلی آ رہی ہے۔ بس وہ یہ دیکھ کر وہاں سے کھسک لیا اور سیدھا دوست کے گھر پہنچ گیا۔ واں بیٹھ کر اسد کا انتظار کیا۔ پھر کچھ آوازیں سنائی دیں۔ جیسے شب برات میں آتش بازی چلنے کی تیز چناخ پناخ آوازیں ہوتی ہیں، کچھ ویسی ہی تھیں، اسی لیے ان سے کچھ ڈر بھی لگا۔

''کہیں گولی چل رہی ہے۔'' زاہد نے بہت دبے لہجے میں کہا۔

مجھے ڈر لگنے لگا'' لگتا ہے کہیں قریب ہی کچھ ہو رہا ہے۔''

''ہاں!'' زاہد نے آہستہ سے کہا اور پھر ایک دم چیخنے لگا۔ ''میں یہاں گھر میں بیٹھا ہوں۔ نہیں، ہرگز نہیں، مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

زہرا کی اچانک سسکیوں سے رونا شروع کر دیا'' وہ کہا کرتا تھا کہ میں مرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی بات کا اعتبار ہی نہیں کیا۔ میں اسے تکلیف پہنچانا تو نہیں چاہتی تھی۔۔۔۔۔''

زاہد کی نظروں سے اچانک نفرت ٹپکنے لگی۔ نفرت بھری نظر سے اسے دیکھا، پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ میں چپ رہی۔ غصہ بھی آ رہا تھا۔ دردمندی کا بھی احساس تھا۔ بس میری اس وقت کچھ عجیب سی ملی جلی کیفیت تھی۔ زہرا نے اسد کے بارے میں اپنے جذبات کو جس چالاکی سے چھپا کے رکھا ہوا تھا، اس وقت اس کا سارا راز فاش ہو گیا۔ اس وقت ہماری خواہش تو یہی تھی کہ کہیں الگ اکٹھے بیٹھیں لیکن ایک دوسرے سے کہیں گے کیا، بس یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اسی میں ایک اور گھنٹہ گزر گیا۔ پھر کہیں ایک کار کے رکنے کی آواز سنائی دی مگر ہم نے اس پر ایسا دھیان نہیں دیا۔ بس خاموش بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ پھر رام سنگھ پہریدار بھاگا بھاگا آیا، راسد کے آنے کی خبر دی۔ خاموشی کی جو مہر ہم پہ لگی ہوئی تھی ایک دم سے ٹوٹ گئی، بلکہ یہ کہیئے کہ ٹوٹ کے ریزہ ریزہ ہو گئی۔ کس طرح ہم نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔ زاہد تیر کی طرح چلتا دروازے سے نکل کر برآمدے میں دوڑتا چلا گیا۔ عابدہ پھپھی اس وقت بابا جان کے کمرے میں تھیں لیکن مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ چپکے سے کمرے میں جا پہنچی۔ پھپھی جان کے کان میں سرگوشی کی'' اسد آ گیا ہے۔''

وہ چونکیں، پھر سر جھکا لیا اور سرگوشی میں کہا'' ابھی آ رہی ہوں۔'' ایک فکر تو تھی ہی، اب یہ دوسری فکر لگ گئی تھی لیکن یہ کوشش بھی تھی کہ بابا جان کو اس کی ہوا نہ لگے۔

زاہد، رام سنگھ کی مدد سے اسد کو اندر لایا اور تخت پر سر کے نیچے تکیہ رکھ کر لٹا دیا۔ چہرہ زخمی تھا اور پیلا ہلدی ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور پٹی بندھا سر ڈھلکا ہوا تھا۔ بازو گلے میں پڑی پٹی

میں جھول رہا تھا۔ زہرا دوڑی ہوئی گئی اور ماجدہ پھپھی کو بتا آئی۔ وہ روتی پیٹتی ہوئی آئیں "ہائے میرا بچہ، میرا لال، اللہ تیرا شکر ہے۔"

اسد نے آنکھیں کھولیں۔ تکلیف کی وجہ سے ان کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ وہ منہ دوسری طرف کرنے لگا تھا کہ اس کی نظر عابدہ پھپھی پر جا پڑی جن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اس نے ہولے ہولے کہا۔

"میں کیا کرتا، مجبور تھا، مجبور تھا۔"

زاہد بولا "پریشانی کی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جو پولیس انسپکٹر انہیں لے کر آیا تھا، وہ بتا رہا تھا کہ یہ لوگ انہیں ہسپتال لے گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ بس آرام کی ضرورت ہے۔"

زاہد کو جو کچھ بتایا گیا اور اسد نے ہوش آنے پر جو ٹوٹی پھوٹی دو چار باتیں کیں انہیں جوڑ کر دیکھنے پر پتہ چل رہا تھا کہ اسد کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ اصل میں وہ ہجوم کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ یہ تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ بس وہ خوفزدہ ہو گئے۔ اس کے بعد بھگدڑ مچ گئی۔ "مجھے ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ وہ گری پڑی تھی۔ بچہ اب تک اس کے سینے سے لپٹا ہوا تھا۔ مگر میں رک نہیں سکتا تھا اور پلٹ کر اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی بھی نہیں رکا۔"

اس نے اس سڑک کی طرف بھاگنے کی کوشش کی جو ندی کی طرف جاتی تھی لیکن بھیڑ میں دھکے کھاتا ایک تنگ گلی میں جا نکلا مگر وہ تو گلیوں کا ایک جال تھا۔ وہ اس جال میں پھنس گیا۔ اسے جب ذرا اطمینان ہوا کہ وہ اب محفوظ ہے تو اسے ایک بوڑھا نظر آیا۔ چاقو لیے دو آدمی اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ غریب ان سے بچ نکلنے کی کوشش میں بھاگ رہا تھا اور مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ میں نے بھاگنا تو چاہا تھا مگر مجھ سے بھاگا نہیں گیا۔ لیکن میں اسے بچا بھی نہیں سکا، میں اسے نہیں بچا سکا۔۔۔۔۔" اس کی آنکھوں میں کرب کی کیفیت تھی۔ ہمیں اسے روکنا پڑا کہ تم زیادہ مت بولو۔

وہ چاقو باز بوڑھے کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکے، مگر اس نے بھی جان پر کھیل کر اپنا پورا زور لگا دیا۔ ان سے بچ کر بھاگا۔ ایک دروازہ کھلا نظر آیا تو اس میں گھس گیا بلکہ اسے اتنا ہوش رہا کہ دروازہ اندر سے بند کر لیا جائے۔ تو اس نے اندر سے کنڈی لگا لی۔ اس بوکھلاہٹ میں اسے اور کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ نہ یہ احساس تھا کہ اس کے سر میں کتنی تکلیف ہے، نہ یہ احساس کہ وہ خون میں لت پت ہے۔ لڑکھڑاتا لڑکھڑاتا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا اور ایک دم سے اسے احساس ہوا کہ یہ تو کسی ناچنے گانے والی کا گھر ہے۔ عورتیں اسے دیکھ کر ڈر گئیں۔ بہر حال انہوں نے اس کی دیکھ بھال ضرور کی۔ ہاں اس گھر میں جو مرد تھے وہ اس سے خار کھا رہے تھے۔ اسے اس آن اچانک مشتری بائی کا خیال آیا۔ اس حوالے کے بعد ان عورتوں نے اس کا اور زیادہ پاس لحاظ کیا۔ اس کے زخم دھوئے، پٹی باندھی اور اسے لٹا دیا۔ شام پڑے ان میں سے ایک شخص نے

کہا کہ میں اس کو اس کے گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔ اسد نے کہا کہ تم یہ عنایت کر دو تو میں تمہیں خوش کر دوں گا۔ اس نے کہا "اے میاں، میں تو مشتری بائی کے خیال سے یہ خدمت کر رہا ہوں۔"

اسد سائیکل کے آگے ڈنڈے پر بیٹھا۔ اس طرح وہ دونوں سائیکل پر لد کر چلے۔ سڑکیں ہوحق کر رہی تھیں۔ بس پولیس والے گشت کرتے نظر آ رہے تھے۔ سبزی منڈی کے قریب پہنچے تو گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ اب وہ شخص آگے جانے کے لیے تیار نہیں تھا اور اسد اس کے ساتھ واپس جانے پر تیار نہیں تھا۔ گھر اب کوئی تین میل رہ گیا ہوگا۔ وہ اکیلا ہی چوک بازار کی طرف دوڑ پڑا۔ ساتھ میں ڈر بھی رہا تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ دور مسجد کے قریب ایک ٹکڑ پہ ایک ٹولی کھڑی تھی کہ منتشر ہو چلی تھی۔ لوگ اس وقت بھی بھاگتے بھاگتے پولیس پر پتھر پھینک رہے تھے۔ چوک کے پرلی طرف والی سڑک پر بہت روشنی تھی۔ وہاں اسے تھوڑے فاصلے پر کچھ گھڑسوار پولیس والے دکھائی دیئے۔ اندھیرے اور ہجوم سے ڈر کر وہ اس طرف دوڑ پڑا۔ ان پولیس والوں میں اسے سٹی پولیس کے چیف خان عبداللطیف دکھائی دیئے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ اب اسے کوئی جوکھوں نہیں ہے اور بس فوراً ہی وہ ایسے گر پڑا جیسے پتلی کو نچانے والی ڈوری پیچھے سے ڈھیلی کر دی جائے اور وہ گر پڑے۔ خان صاحب نے ڈاکٹر سے اسد کا معائنہ کروایا اور اسے گھر لے کر آئے۔ خان صاحب کی شروع جوانی میں باباجان نے ان کی تعلیم اور کیریئر بنانے کے سلسلے میں مدد کی تھی۔

جس طرح اس شخص نے حفاظت کے ساتھ اسد کو گھر پہنچایا، اس کا ہمیں پہلے ہی احساس تھا۔ محسن چچا تو ان کی طرف سے پیغام بعد میں لائے۔ اصل میں عابدہ پھپھی نے اس سلسلے میں اپنا شکریہ انہیں کہلوایا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے پیغام بھجوایا کہ سید محمد حسن صاحب اور ان کے خاندان والوں کی خدمت بجا لانا نہ صرف میرا فرض ہے بلکہ میرے لیے اس میں عزت بھی ہے۔

ماجدہ پھپھی نے جب دیکھا کہ اسد کو بخار ہو گیا ہے تو وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ صبح ہی صبح ان کے آواز دینے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں بڑی مشکل سے اٹھی۔ دیکھا کہ زہرا تو پہلے ہی سے اٹھی ہوئی ہے۔ کہنے لگی کہ رات میں سو نہیں سکی۔ ماجدہ پھپھی اسد کی پائنتی بیٹھی اس کے تلوے سہلا رہی تھیں۔ گھبرائی آواز میں مجھ سے چپکے چپکے کہنے لگیں کہ "بہت تیز بخار ہے۔ رات بھر بے چین رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے پانی مانگ رہا تھا۔ زہرا! وہ گلاس لو اور جلدی سے پانی لے کر آؤ۔ لیلیٰ! تم اس کے تلوے سہلاؤ، میں اس کی ہتھیلیاں سہلاتی ہوں۔ اس سے بخار تھوڑا کم ہو جائے گا۔"

اسد کے خشک ہونٹ ہل رہے تھے مگر کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بے چینی سے سر کبھی ادھر کرتا کبھی اُدھر۔ جب میں نے اس کے تلوے چھوئے تو وہ جل رہے تھے۔

زہرا پانی لے کر آئی۔ ماجدہ پھپھی نے اسے سہارا دے کر تھوڑا اٹھایا اور کہنے لگیں "اسد میاں! لو پانی پیو، اسد میاں! آنکھیں کھولو۔" اسد جب پانی پی رہا تھا تو اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ پھر پھپھی

جان نے اس کا سر تکیے پر ٹکایا اور اس کا منہ صاف کیا۔ زہرا گلاس لے کر پیچھے ہٹ گئی۔ اسد نے آنکھیں کھولیں اور زہرا کو دیکھنے لگا۔ اس کے دوپٹے کا آنچل اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ آنچل پکڑے پکڑے چلاتے ہوئے بولا" زہرا ڈارلنگ، زہرا! مجھ سے منہ مت موڑو، کبھی منہ نہ موڑنا۔ زہرا!۔۔۔۔۔ زہرا!۔۔۔۔۔" اس کی آواز ایک اتھاہ سناٹے میں اترتی چلی گئی۔ وہ ایک پل ایسا لگتا تھا کہ اس پل کا کوئی انت نہیں ہے۔

ماجدہ پھپھی نے خشک لہجے میں کسی قدر تختی سے کہا" زہرا، اپنے کمرے میں جاؤ۔ لیلیٰ تم بھی جاؤ۔"

زہرا سہم کر پیلی پڑ گئی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹہ چھڑایا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ بھاگ کر کمرے سے نکل گئی۔

"زہرا!۔۔۔۔۔ زہرا!" اسد درد بھرے لہجے میں بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے ماجدہ پھپھی کو دیکھا کہ نفرت بھری غصیلی نظروں سے اسد کو دیکھ رہی ہیں۔ اسد کے لیے میرا دل بہت دکھا۔ محبت میں باولا ہو کر گناہ کر بیٹھا۔ ہماری روایات کے حساب سے تو یہ گناہ ہی تھا۔ کب سے چپکے چپکے دل میں آرزوؤں کو پال رہا تھا۔ آج صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا اور اس کے ساتھ ہی جیسے اس کی آرزوؤں پر ناکامی کی مہر لگ گئی۔ انہوں نے پھر کہا" لیلیٰ جاؤ۔" پھر رکتے رکتے بولیں" سرسامی کیفیت میں کیا بک رہا تھا، اس پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ ہمیں رسوائی سے محفوظ رکھے۔"

پھپھی جان کی نافرمانی مقصود نہ تھی مگر اب میں نے اس کی کمزوری کو بھانپ لیا تھا۔ سو میں اسد کے قریب گئی، اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لیا اور کہا" اسد! میں لیلیٰ ہوں۔"

"زہرا!" اس نے سرگوشی میں کہا" زہرا!"

"اسد، اب تم سو جاؤ، ہاں اب تم سو جاؤ۔" میں اس کی جلتی پیشانی کو سہلانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آہستہ آہستہ آنسو بہنے لگے۔ دھیرے دھیرے اس کا سر ڈھلک گیا اور میرے ہاتھ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

جب میں اٹھنے لگی تو میں نے ماجدہ پھپھی کو دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں" اس کو یہ ہمت کیسے پڑی، اتنا ناشکرا پن!" میں نے جب اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو زہرا نے سہمے ہوئے انداز میں نظریں اٹھا کر دیکھا۔

"میں سمجھی کہ امی آ گئیں۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اللہ کے واسطے یہ رونا بند کرو۔ اپنی امی کی کم از کم اس عادت کو مت اپناؤ۔"

"اتنی ظالم تو مت بنو۔" زہرا سسکیاں لیتے ہوئے بولی" اب میں کیا کروں۔ ان کے سامنے کیسے جاؤں۔ ایسی خطرناک بات اس نے آخر کہی کس طرح؟"

"ارے وہ تو غشی میں بڑبڑا رہا تھا۔ اسے کہاں ہوش تھا کہ وہ کیا بک رہا ہے۔ بھولی بی بی! ابھی تک

توتم اس میں بہت لذت لے رہی تھیں۔ کیوں؟ ہے نا یہ بات؟ تمہیں اس میں بہت لطف آ رہا تھا کہ ایک چڑی کا غلام ہر وقت تمہارے نام کی مالا جپتا رہتا ہے۔ ہے ناں؟ تم نے ہی اسے یہ حوصلہ دلایا۔ کیوں دلایا تھا؟ جیسے یہاں سب منافق ہیں ویسے ہی تم بھی ہو۔" آخر مجھے غصہ آ گیا۔

"غلط۔ یہ بات نہیں ہے۔ بالکل یہ بات نہیں ہے۔ ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟"

"ہونا کیا ہے، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اور تمہیں بھی پتہ ہے کہ کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری امی جان بات پر ایسا پردہ ڈالیں گی کہ کسی کو ذرا سا شک بھی نہیں ہوگا۔ اپنے بارے میں جتنی تمہیں فکر ہے اتنی ہی انہیں بھی ہے۔ لیکن بیچارے اسد کا کیا ہوگا؟ مجھے تو اس کی فکر ہے۔"

"تم سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہیں کہ۔۔۔۔۔"

میں نے بات کاٹی اور کہا "ہاں میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی اور کبھی نہیں آئے گی۔ تم پلیز مجھے سونے دو۔"

میں زہرا کی طرف پیٹھ کر کے کروٹ لیے پڑی رہی اور اپنے الجھے خیالات کے ساتھ الجھتی رہی۔ اسد غریب پہ ترس آ تا رہا، زہرا پہ غصہ، اس کی امی پر جھنجھلاہٹ، اور حیران ہوتی رہی کہ آخر محبت کیا شے ہے، فریضہ کس چیز کا نام ہے، صداقت کسے کہتے ہیں۔

اگلے روز ماجد وچچی اٹھ کر ہمارے کمرے میں آ گئیں۔ زاہد سے کہا گیا کہ تم اسد کے پاس چلے جاؤ۔ اس کا بخار اب ہلکا ہو گیا تھا۔ اس روز جو ہوا تھا اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی گئی۔ اور گھر میں پہلے ہی بہت تناؤ کا ماحول تھا۔ سو اس واقعے کے باعث جو تھوڑا بہت تناؤ پیدا ہوا اس کا کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔ لیکن اس رات گویا یہ طے ہو گیا کہ جو بھی مناسب رشتہ پہلے آ گیا اس سے زہرا کا بیاہ کر دیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہ اب اسد کے لیے اس گھر میں اطمینان سے رہنا مشکل ہو جائے گا۔

اس کے کوئی چار دن بعد ڈاکٹروں نے بتا دیا کہ بس اب حامد چچا کو فوراً ہی بلا لیا جائے۔ لیکن بابا جان تو ان کے آنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

تیرہواں باب

ابھی تیسرا پہر چل رہا تھا۔ صبح سے دونوں پھپھیاں بابا جان ہی کے کمرے میں بند بیٹھی تھیں۔ بس کھانے کے وقت باہر نکلی تھیں۔ ہیز د بز کھانا کھایا، بات کوئی نہیں کی۔ ہاں اتنا ضرور پوچھا تھا کہ ان کے تار کا حامد چچا کی طرف سے کوئی جواب آیا؟ کھانا کھا کر پھر کمرے میں چلی گئیں۔ زہرا اور میں اپنے کمرے ہی میں ٹکے رہے۔

میں کتابوں کو درست کر کے رکھ رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح سے اپنے آپ کو مصروف تو رکھنا تھا۔ زہرا سی پرو رہی تھی۔ اتنے میں حکیمن بوا روتی ہوئی آئیں "بچیو چلو جلدی چلو۔ میری غریب یتیم بچیاں، اللہ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔ ہم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ جن کو یہ غم دیا ہے انہیں صبر عطا کرے۔ ارے ہمارا کیا بنے گا، بس اللہ ہی رحم کرنے والا ہے۔"

ہوا کیا؟ یہ ہم نے ان سے سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بس ہم سمجھ گئے اور اندیشے سے ہمارا برا حال ہو گیا۔ موت کا تو ہم نے اب تک نام ہی سنا تھا۔ ہمارے لیے وہ دور کی کوئی شے تھی جیسے کوئی مجرد خیال ہو، کوئی تصور ہو یا کہانیوں کی کوئی بات جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اتنے قریب سے تو ہم نے اسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

عابدہ پھپھی کے کمرے میں ساری نوکرانیاں فرش پہ پھسکڑا مارے بیٹھی تھیں۔ ان کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھا تو آہیں بھر بھر کے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھنے لگیں۔ استانی جی اور تمن بی بی تخت پر بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے ایسے ہو رہے تھے جیسے تڑے مڑے بھیگے ہوئے ٹشو پیپر ہوں۔ رو رو کے کہہ رہی تھیں "اے اللہ! ہم پہ رحم کیجیو! پاک پروردگار! ماجدہ بی بی اور عابدہ بی بی پہ رحم کر، ان یتیم بچیوں پر رحم کر۔"

میں اپنی پیاری عابدہ پھپھی کے لیے چپکے چپکے دعا مانگنے لگی۔ انہوں نے تو اپنی زندگی ہی اپنے باپ کے لیے تج دی تھی۔ زندگی میں اور تو کوئی ان کا مقصد ہی نہیں تھا۔ جب میں نے دروازے میں قدم رکھا تو دم بھر کے لیے موت کا خوف میرے دل سے بالکل نکل گیا۔ بس یہ جی چاہ رہا تھا کہ جلدی سے پھپھی کے پہلو میں جا بیٹھوں۔ کلمہ کے ورد کا نہیں، ان کی خاموشی کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ بابا میاں کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ بار بار چڑھتی اترتی آواز میں کلمہ پڑھ رہے تھے: لاالہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔

میں نے دیکھا کہ پھپھی جان سیدھی بیٹھی بابا جان کو سہارا دے رہی ہیں۔ میں نے ان کی کھوئی کھوئی نظروں کو دیکھا اور اسی آن میرے اندر ایک دہشت سماتی چلی گئی۔ ایسے لگا جیسے میں مفلوج ہو گئی ہوں۔ بات یہ تھی کہ بابا جان پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ تو مر چکے تھے۔ میرا خیال یہی تھا کہ مر چکے ہیں مگر مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے سر ڈھانکا ہوا نہیں تھا۔ میں نے جھک کر انہیں آداب بھی نہیں کیا، کر بھی نہیں سکتی تھی۔

اسی ایک حیرت بھرے پل میں مجھے ان کے حلق کی خرخراہٹ سنائی دی اور میں نے دیکھا کہ کالی کالی رال ان کی سفید داڑھی پر بہہ رہی ہے۔ میں روتی چیختی کمرے سے نکل گئی۔ مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ میں سسکیوں سے رو رہی تھی۔ وہ جو شک کا ایک پل تھا کہ وہ مر گئے ہیں یا ابھی جی رہے ہیں، وہ ایک پل احساسِ جرم بن کر مجھے ستا رہا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ پریشان کر رہا تھا کہ انہیں ابھی ہوش تھا۔ انہیں میری بے ادبی سے نہیں، بلکہ اس بے ادبی سے جو مطلب نکلتا تھا اس سے انہیں تکلیف پہنچ رہی تھی۔ کلمہ پڑھنے والے تو شاید ابھی تذبذب ہی میں تھے۔ پورے تیقن سے تو میں نے ان کی موت کا اعلان کیا تھا۔

چودہواں باب

اگلے دن حامد چچا کے آنے کے بعد ہمیں باباجان کے ہمراہ شاید آخری بار حسن پور جانا تھا۔ ہمارا آبائی گاؤں اپنے جنوں کو ان کے جیتے جی تو کبھی سنبھال نہیں پایا مگر جب کسی کی آنکھ بند ہوتی تو وہ بہت قطعیت کے ساتھ اپنی امانت واپس لے لیتا تھا۔ صدیوں سے یہ ریت چلی آ رہی تھی۔

رات ہوتے ہوتے گھر لوگوں سے بھر گیا جیسے شادی بیاہ کے موقعوں پر یا کوئی دعوت ہونے پر بھر جایا کرتا تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ ان موقعوں پر جو گانا بجانا ہوتا تھا وہ نہیں ہو رہا تھا۔ جو بھی شور ہنگامہ تھا موت کی فضا سے ہم آہنگ تھا۔ زنان خانے میں اُسی قسم کی گہما گہمی تھی جو موت کے موقع پر ہوا کرتی ہے۔ ہمارے خاندان کے جتنے بھی گاؤں تھے ان سب سے نائیوں کے گھروں کی عورتیں آن پہنچی تھیں۔ ان کی آمد سے ہمیشہ یہی مطلب لیا جاتا تھا کہ اس گھر میں کوئی شادی ہے یا موت ہوئی ہے۔ کوئی خوشی کی تقریب ہے یا غمی کا کوئی موقع ہے۔ یہ عورتیں مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ کیونکہ موت کے گھر میں تین دن تک چولہا نہیں چڑھا کرتا اس لیے کھانا راجہ حسن احمد کی حویلی سے آ رہا تھا۔ نوکر قطار در قطار کھانا لے لے کر آ رہے تھے۔

جو عورتیں رونے دھونے سے فارغ ہو چکی تھیں اور مرحوم کے پرانے ذکر اذکار کا فریضہ بھی نبٹا چکی تھیں، وہ اب تختوں اور پلنگوں پر بیٹھی باتیں ملک رہی تھیں۔

اس ساری چہل پہل کے بیچ ایک سکوت کا گوشہ بھی تھا اور یہ عابدہ پھپھی کا کمرہ تھا۔ اپنے پلنگ پر بت بنی بیٹھی تھیں۔ آنکھ میں آنسو نام کو نہیں تھا جیسے سکتے میں ہوں۔ ارد گرد عورتیں دو پٹوں میں لپٹی لپٹائی بیٹھی تھیں۔ جو بی بی آتی وہ میری پھپھیوں کے گلے لگتی، میرے اور زہرا کے گلے لگتی، تھوڑا گریہ اور پھر وہی خاموشی۔ ماجدہ پھپھی کی آنکھیں تو یوں خشک ہو گئی تھیں کہ وہ روئیں بہت تھیں۔ اور عابدہ پھپھی کی آنکھیں اس لیے پتھر بن گئی تھیں کہ وہ بالکل روہی نہیں سکی تھیں۔

رانی امیر پور کی آمد سے بیبیوں میں اشتیاق کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اُن میں جو باتیں ملک رہی تھیں اور اُن میں بھی جو رو رہی تھیں۔ گیارہ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے مگر اس عمر والے لڑکوں کو بھی مردانے میں دھکیل دیا گیا۔

رانی صاحبہ اپنی بیٹیوں، بہوؤں، خواصوں اور خادماؤں کے جلو میں برآمد ہوئیں۔ یہاں سب

بیبیاں ان کی آمد کی منتظر تھیں۔ ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی ہر ایک کے سلام کا سر کی جنبش سے جواب دیتی ہوئی گزریں۔ جب دروازے کی چوکھٹ پر آ کر رکیں تو ایک خادمہ پکاری" پاک پروردگار ہماری رانی بی بی کو نظر بد سے بچائے! اللہ کرے دنیا جہان کی ساری نعمتیں ان کے قدموں میں ہوں!" انہوں نے میری پھپھیوں کو، مجھے اور زہرا کو سب کو گلے لگایا اور مغموم لہجے میں فرمانے لگیں" اللہ کی مرضی میں کسی کا کیا دخل ہے۔ مرحوم کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کا غم سہنے کی ہمت عطا کرے۔ غم کی تو کوئی حد نہیں ہے۔ یہ تو محض آغاز ہے اور جانے کتنے غم دیکھنے ہیں۔"

سب بیبیوں نے ایک آہ سرد بھری۔ ماجدہ پھپھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ عابدہ پھپھی کا منہ بھنچ گیا مگر ان کی آنکھ سے آنسو نہیں نکلا" میری بی بی غم کو سہنے کی عادت ڈالو، یہ غم تو اب جان کے ساتھ ہے۔"

تسلی دینے کا یہ انوکھا طریقہ تھا۔ مجھے تو بہت غصہ آیا۔ اس جانے مانے رسمی انداز فکر کے خلاف میں جو کڑھی تو اس سے یوں سمجھو کہ میرے دل کا غبار نکل گیا۔ نندی کو نکال باہر کیے جانے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے عابدہ پھپھی کے گلے میں باہیں ڈالیں اور اپنے رخسار کو ان کے رخسار کے ساتھ چسپاں کر دیا۔ عابدہ پھپھی نے ایک جھرجھری لی، لمبا سانس کھینچا۔ پھر انہوں نے مجھے چمٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

بابا جان کے کمرے میں رات بھر چراغ جلتا رہا۔ بابا میاں رات بھر جاگا کیے اور قرآن خوانی کرتے رہے۔ ایک کمرے میں لوبان سلگ رہا تھا۔ اس کی سگندھ کمروں سے ہوتی ہوئی باہر تک جا رہی تھی۔ لوبان کی اس سگندھ میں موت کی خوشبو بھی تو رچی ہوئی تھی اور یہ خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دماغوں میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ اس کے اثر سے پرانی یادیں جاگ رہی تھیں۔

ہمارے بچپن کے دنوں میں ایک کرن علی تھے۔ یہ لمبی داڑھی اور بڑے اللہ والے تھے۔ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ گرمی کی راتوں میں ایک لمبے سے دستے والا آگھی داغ، جس میں لوبان جلتا رہتا تھا، ہاتھ میں لے کر ایک کمرے سے نکلتے اور اس کمرے کی طرف جاتے نظر آتے جس میں اندھیرا پڑا رہتا تھا۔ لوبان کے دھوئیں سے کانوں کے آس پاس بھن بھنانے والے مچھر تو یقیناً مر جاتے تھے۔ لوبان کی خوشبو بہت تیز ہوتی تھی۔ یہ خوشبو جراثیم کو بھی مارتی تھی۔

مجلس، مولود اور ایسی ہی دوسری مذہبی تقریبوں میں لوبان چاندی کے کٹوروں میں سلگایا جاتا۔ ان موقعوں پر اس کی خوشبو میں کتنا تقدس ہوتا تھا، کتنی تیز مہک ہوتی تھی۔ ذہن کا وہ کون سا عمل تھا جس نے اس وقت اس خوشبو کو موت کی خوشبو بنا دیا تھا۔

رفتہ رفتہ گھر کے سب لوگ سو گئے اور اندھیرا چھا گیا۔ بس ایک چراغ جلتا رہا۔

پندرہواں باب

حامد چچا اپنی بیگم یعنی سائرہ چچی کے ساتھ اگلے دن صبح کو آن پہنچے۔ ان کی موجودگی کی وجہ سے رونے دھونے میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ وہ دکھاوے کے قائل نہیں تھے۔ ایک تو ان کی طبیعت ہی کچھ اس قسم کی تھی، دوسرے یہ کہ وہ مغربی طور طریقوں کے بہت شیدائی تھے۔ ان کے عزیز رشتہ دار تو اب ان سے یہ توقع ہی نہیں رکھتے تھے کہ وہ روایتی رسموں کو نبھائیں گے۔ ادھر وہ اپنے آپ میں مطمئن تھے۔ مطلق پروا نہیں کرتے تھے کہ دوسرے ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ جب بھی پردیس سے آتے تو یوں لگتا کہ ہم کسی ایسے اجنبی سے مل رہے ہیں جو اپنے آپ کو خاندان کا ایک فرد ظاہر کر رہا ہے۔ خاندان والوں کے ساتھ ان کے میل جول میں ایک عجب رکھ رکھاؤ تھا۔ ایسا رکھ رکھاؤ جس میں محبت والفت کی چاشنی نہیں ہوتی، بس فرض نبھانے والی بات ہوتی ہے۔

حامد چچا کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ بابا جان بھی اس عمر میں بس ایسے ہی ہوں گے۔ اسی طرح کا اکڑا اکڑا سا جبڑا، ویسی ہی رخسار کی ابھری ہوئی ہڈیاں، ویسا ہی تنا ہوا دہانہ اور اسی طور پھولی پھولی آنکھیں۔ ان کے طور طریقوں اور ان کے بناؤ سنوار میں بہت نپے تلے ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ ان کے سر کے سفیدی مائل بال مانگ کے ساتھ اس طرح بنے سنورے دکھائی دیتے تھے جیسے ابھی ابھی کنگھی کی گئی ہو۔ گھنی مونچھیں بڑے سلیقے سے ترشی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ لباس کے معاملے میں بہت نفاست پسند تھے اور یہ کہ لباس مغربی پہنتے تھے۔ بات انگریزی میں کرتے تھے۔

باپ بیٹے کے مزاج میں جو عدم یگانگت تھی اسی وجہ سے آپس میں کبھی بنی نہیں۔ پچھلی صدی کے اواخر میں مسلمانوں میں اصلاح کی آواز اٹھی۔ بابا جان اس زمانے کے اصلاحی خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ بیٹے کو انہوں نے انگلش یونیورسٹیوں میں تعلیم دلائی۔ انہوں نے تو یہ سوچا تھا کہ بدیشیوں کا مقابلہ انہی کے ہتھیاروں سے کرنا چاہیے۔ ورثے میں جو ثقافت اور اقدار ملی ہیں ان کا تحفظ بھی انہی سے سیکھے ہوئے طریقوں سے کرنا چاہیے، لیکن ان کی نقالی کو وہ بہت مکروہ فعل جانتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بڑے بیٹے نے جائیداد کا انتظام سنبھالنے کے بجائے انڈین سول سروس کو اپنا لیا تو انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ ان کی دانست میں جائیداد ان تمام اقدار کا ظاہری نشان تھی جن کا اہل خاندان کو تابع ہونا چاہیے اور جس کے لیے کسی

قسم کی قربانی سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

حامد چچا نے جب یہ فیصلہ کیا کہ پنشن لے کر اپنے ٹھکانے پر منتقل ہو جائیں تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت تک بیماری اور گزرتے وقت نے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ باپ بیٹے کے درمیان تبادلۂ خیال ہی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

بیٹے نے جو طور اختیار کیا تھا اسے بابا جان معاف کرنے کے لیے کسی صورت تیار نہیں ہوئے۔ یہی طور کہ مغربی طرزِ زندگی کو اپنایا، بیوی کا پردہ تڑوا، بیٹوں کی مذہبی تعلیم و تربیت سے غفلت برتی اور یہ سب کچھ علی الاعلان کیا اور اس پر فخر کیا۔

سائرہ چچی بھی حامد چچا ہی کی زبان بولتی تھیں۔ جو وہ کہتے یہ دہرا دیتیں۔ سرو قد، حسین و جمیل، شوہر ان پر حاوی تھے، وہ دوسروں پر حاوی تھیں۔ ان کی تربیت کے لیے چچا نے میم استانیوں کا بندوبست کیا تھا اور وہ میموں کی تربیت یافتہ تھیں۔ شادی سے پہلے سخت پردہ کرتی تھیں۔ متوسط طبقے کے ایک راسخ العقیدہ مسلمان گھرانے کی بیٹی تھیں۔ اب شان یہ تھی کہ ان کی ٹھاٹ دار ساڑھی، شائستہ میک اپ، ویوڈ ہیئر، سگریٹ ہولڈر اور اونچی ایڑی کے جوتے کو دیکھ کر فینسی ڈریس کا گمان ہوتا تھا۔

میرے دونوں چچیرے بھائی کمال اور سلیم ابھی تک انگلستان ہی میں تھے۔ انہیں کم عمری ہی میں وہاں بھیج دیا گیا تھا۔ چچی کی اکثر ہندوستانی سہیلیوں کا خیال یہ تھا کہ یہ لڑکے ولایت میں پڑھ کر اپنی تہذیب اور اپنے لوگوں سے بیگانے ہو جائیں گے اس لیے ممانی جب بھی بیٹوں کا ذکر کرتیں، ان کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ جیسے صفائی پیش کر رہی ہوں۔ کہا کرتی تھیں کہ ہندوستانی سکولوں میں تو انگریزی تعلیم کی نقالی کی جاتی ہے۔ اس انگریزی تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اصلی انگریزی تعلیم پا کر ہی لڑکے ایسے اٹھ سکتے ہیں کہ مشرق و مغرب کا حسین امتزاج ان میں نظر آئے۔ باقی رہے چچا جان تو وہ صفائیاں پیش کرنے اور وضاحتیں کرنے والی باتوں سے بے نیاز تھے۔

چچا اور چچی کی آمد سے ماحول میں کسی قدر تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، جیسے ہوا میں کوئی نیا عنصر راہ پا گیا ہو۔ یہ تو طے تھا کہ اب کچھ تبدیلیاں نمودار ہوں گی۔ ہاں یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا تبدیلیاں ہوں گی۔ تو بس اب ہونی کا انتظار تھا۔ عابدہ پھپھی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ انہوں نے قبول کر لیا ہے کہ اب انہیں یہاں سے نکلنا ہے۔ جب میں ان کے قریب نہیں ہوتی تھی تو ڈری ڈری رہتی تھی۔

دن ڈھلے تک کفن دفن کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔ مرد میت لے کر امریوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ نمازِ جنازہ بھی وہیں ہونی تھی۔ یہ آموں کا باغ ہمارے گاؤں کے نواح میں تھا۔ وہیں ہمارے بزرگوں کی قبریں تھیں جن پر لمبی لمبی گھاس اُگ آئی تھی۔

ہم حسن پور کے لیے ایک گھنٹے بعد روانہ ہوئے۔ گھر جسے حویلی کہنا چاہیے ایک دم سے خالی اور ویران ہو گیا۔

سولہواں باب

حسن پور جانے کا ہمیشہ ایک اشتیاق رہتا تھا۔ وہاں جانے کے خیال ہی سے دلوں میں ایک شوق کروٹیں لینے لگتا۔ دور حدِ افق تک ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ کر فخر سے سر اونچا ہو جاتا کہ اچھا ہم اتنی زمینوں کے مالک ہیں۔ مگر بات صرف اتنی نہیں تھی۔ اس سے کچھ بڑھ کر تھی۔ زمین سے رشتہ آدمی کی روحانی ضرورت ہے۔ یہاں آ کر وہ روحانی ضرورت جیسے پوری ہو جاتی ہو۔ لگتا کہ ہم ایک ادھورے سے پورے ہو گئے ہیں۔ ایک احساس کہ جو پہلے تھا جو اب ہے اور جو آئندہ ہوگا ان میں ایک تسلسل ہے۔ شہر میں تو حال پر ماضی کی یلغار رہتی تھی۔ اس آویزش میں مستقبل کا کہیں پتہ ہی نہیں چل پاتا تھا۔ وہ تو بس گم تھا۔

کار میں صورت یہ تھی کہ ونڈوز پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ بیچ میں حکیمن بوا، ایک طرف میں، دوسری طرف زہرا۔ آگے کی سیٹ پر ڈرائیور، بیچ میں پردہ پڑا ہوا۔ ہم دونوں نے باہر دیکھنے کی نیت سے اپنی اپنی طرف کا پردہ تھوڑا سا کھول لیا تھا۔ حکیمن بوا کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

کار گیٹ میں سے بہت تیزی سے باہر نکلی تھی۔ گیٹ پر سنگِ مرمر کی تختی لگی تھی جس پر کالے حروف میں اس گھر کا نام کھدا ہوا تھا "آشیانہ" اور اس کے نیچے میرے دادا کا نام تھا۔ ہمارے پڑوس میں راجہ بھیم نگر پیلس تھا۔ اس کے گیٹ پر سنتری مستعد کھڑا تھا۔ ہماری کار سامنے سے گزری تو اس نے قدم جما کر سلام کیا۔ پیلس کے برج اونچے اونچے درختوں کے بیچ میں سے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ اونچے درخت بھاری دیواروں کے پیچھے اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے پہریدار کھڑے ہوں۔ بھیم نگر پیلس کو ہم بہت حیرت اور شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ اس میں اس فرنگی کا بھوت رہتا ہے جس نے اسے تعمیر کیا تھا۔ آخری تاجدار اودھ کے زمانے میں اس کی تعمیر ہوئی تھی۔ جس فرنگی نے وہ بنوایا تھا اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ اس قتل کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ ایک بات یہ مشہور تھی کہ وہ فرنگی ایک نواب صاحب کی حسین و جمیل داشتہ پر عاشق ہو گیا تھا۔ نواب صاحب نے جوشِ رقابت میں اسے قتل کرا دیا۔

پیلس کے اردگرد سبزہ زار اور باغیچے پھیلے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی جھیل تھی جس میں کنول کے پھولوں کے بیچ ہنس تیرتے رہتے تھے۔ گلاب کے تختوں کے درمیان ایک سنگِ مرمر کا چبوترہ تھا۔ یہاں ہم اپنے بچپن کے دنوں میں آ کر کھیلا کرتے تھے اب بھی رانی صاحبہ کے ساتھ یہاں چہل قدمی کرنے میں بہت

لطف آتا تھا۔ اوپر درختوں کا سایہ، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے، ٹہنیاں ہوا سے جھوم رہی ہیں، چڑیاں چہک رہی ہیں اور سارے میں ایک مہک بسی ہوئی ہے۔ چہل قدمی میں کتنا مزہ آتا تھا۔

کار ان خستہ حال اور گولوں سے چھلنی دیواروں کے برابر سے گزری جو کسی زمانے میں سلطان کی چہیتی بیگم کے باغ کو اپنی حفاظت میں لیے شان سے کھڑی نظر آتی تھیں۔ ہم سکول سے سنک کر یہاں آ جایا کرتے تھے۔ کلاسیں ختم ہوتیں تو لڑکیوں کے غول کے غول چیں میں کرتے باہر نکلتے اور آنکھ مچولی کھیلنے کے شوق میں یہاں آ جاتے۔ یہاں برگدوں کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور رنگ رنگ کے پودوں سے بھرے شیشے کے گھروں کی زمین سیلی سیلی نظر آتی تھی، ہم خوب آنکھ مچولی کھیلتے۔

کار جن مقامات کے پاس سے گزر رہی تھی وہ سب مجھے بہت عزیز تھے۔ یہ جگہیں تو میری یادوں میں بسی ہوئی تھیں۔ انہی کے بیچ تو میں نے آنکھ کھولی تھی اور چھوٹی سے بڑی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر میں کتنی خوش ہو رہی تھی۔ اس خوشی میں یہ بھول ہی گئی کہ ہم کار میں بیٹھے کیوں دوڑے جا رہے ہیں۔

رستے میں یوکلپٹس کا ایک جھنڈ آیا۔ شاخوں میں ہلکی ہلکی سی سرسراہٹ ہو رہی تھی جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہوں۔ اسے گزر کر کار چڑیا گھر کے پارک میں مڑ گئی۔ ایک بندر کلکار رہا تھا۔ ایک بہت اونچی آواز لگائی جیسے چیخ رہا ہو اور پھر ایک دم سے آواز دھیمی پڑ گئی۔ بچے اس کی نقلیں کر رہے تھے۔ اسی طرح چیختے اور قہقہے لگاتے۔ چڑیوں کی چہکار، جانوروں کی پکار، شیر کی دہاڑ، کٹہرے میں سلاخوں کے پیچھے ایک تیندوا ایسے چل پھر رہا تھا جیسے ڈراونا سایہ حرکت میں ہو۔

''ارے، ارے! وہ دیکھو شیر۔'' زہرا جوش میں آ کر چلا اٹھی۔ شیر سامنے ایک ٹیلے پر بڑی شانِ بے نیازی سے کھڑا اپنے جسم کو سیدھا کر رہا تھا۔ اس کے عین سامنے ایک بھٹ نظر آ رہا تھا۔ نقلی قسم کی چٹان سے تراشا ہوا بھٹ۔ زہرا کہنے لگی ''کھائی کے گرد جنگلا ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اسے دیکھ کر بڑا ڈر لگتا ہے۔ بس یہ لگتا ہے کہ ابھی چھلانگ لگائے گا اور کھائی کو پار کر کے آ جائے گا۔''

''ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے، بلکہ وہ تو مجھے خواب میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ خواب میں لگتا ہے کہ جیسے وہ کھلا پھر رہا ہے اور میں گھر کے دروازے بند کرتی پھر رہی ہوں۔ لیکن ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی دروازہ کھلا رہ جاتا ہے۔ میں اسے تالا نہیں لگا پاتی اور۔۔۔۔۔''

''اے لڑکیو! یہ تم نے کیا میں میں لگا رکھی ہے۔'' حکیمن بوا ہم پہ گرم ہونے لگیں۔ ''یہ ان باتوں کا وقت ہے؟ اس وقت تو تمہیں اپنے باباجان کی مغفرت کی دعا مانگنی چاہیے تھی۔''

ہم چپ ہو گئے۔ کار فرانے سے گزر رہی تھی۔ درختوں کے سائے میں پھیلی ہوئی سڑکیں، مکان اور باغ، ان سے آگے دل کی شکل والے چوراہے۔ یہاں سے اس فیشن ایبل شاپنگ سنٹر کی طرف رستہ جاتا تھا جس کی اپنی شان تھی۔ پیدل چلنے کے صاف ستھرے کشادہ پکے رستے، اونچے اونچے ستون، دکانیں،

دفاتر، ریستوران، سینما گھر ان سب کے آگے پھیلے ہوئے برآمدے۔

سڑک کے برابر پیپل تلے کھڑے ایک چھوٹے سے مندر سے گھنٹیوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے دائیں بائیں عمارتیں اس انداز سے نظر آ رہی تھیں جیسے دونوں طرف سے عمارتوں کی قطار آتے آتے اس مندر کو دیکھ کر بہت ادب کے ساتھ ٹھٹھک گئی ہو۔

ٹریفک کے ہجوم میں کار کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔ تانگے والے اپنے گھوڑوں کو ٹکٹکاتے، گھنٹیاں بجاتے، تانگوں کو دوڑائے لیے جا رہے تھے۔ کاریں ہارنوں کے شور کے ساتھ فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھیں۔ گورے سپاہی سائیکلوں پہ سوار سیٹی بجاتے اینگلو انڈین لڑکیوں کو اشارے کرتے گزر رہے تھے۔ اور وہ اینگلو انڈین لڑکیاں جواب میں یا تو مسکرا دیتیں یا ایک شان بے نیازی سے سر کو جھٹکا دے کر گزر ی چلی جاتیں۔

شاپ ونڈوز اور فلموں کے پوسٹر، انہیں دیکھ کر دل میں کتنی ہلچل پیدا ہوتی تھی۔ دکان کے اندر جانے کی اجازت تو ہمیں شاذ و نادر ہی ملتی تھی۔ بس کار میں بیٹھے بیٹھے ہی چیزیں منگا کر دیکھ بھال لیتے اور خریداری کر لیتے۔ ہاں ایک مرتبہ رانی امیر پور اور ہماری پھپھیوں نے ایک انگلش سٹور میں سیل کے موقع پر خریداری اس طور کی تھی کہ ان کی خریداری کے دوران کسی گاہک کو سٹور میں نہیں آنے دیا گیا۔

دائیں سمت میں ایک گرجا گھر کا مینار دکھائی دیا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ دکانوں کا سلسلہ یہاں آ کر ختم ہو گیا۔ آگے مال پر پھر وہی کنارے کنارے درختوں کی قطار اور باغات اور عالیشان مکان، اور اس کے بعد اچانک ایسا لگا کہ آگے سڑک بند ہے۔ بالکل سامنے ایک شاہی مقبرے کے گنبد نظر آ رہے تھے۔

کار تیزی سے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گئی، اور اب ندی بھی زیادہ دور نہیں تھی۔ پہلے پل کہ ہم پار کر کے آگے نکل آئے تھے۔ اس پل کا نام ان بندروں پر رکھا گیا یا پڑ گیا تھا جنہوں نے جانے کیا سوچ کر اس پل کو اپنے اکٹھا ہونے کا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ کس کس طرح وہ انسانی جذبات کی نقالی کرتے تھے۔

"ارے دیکھو! وہ ملکہ وکٹوریہ ہے نا، اسے ذرا دیکھو۔" زہرا کہہ رہی تھی۔ مرمریں سر پر غرور پر ایک کوا بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ کوے نے بازو پھڑ پھڑائے اور کائیں کائیں کرتا اڑ گیا۔

"بیچاری ملکہ وکٹوریہ" ہم ہنسنے لگے۔

مسز مارٹن روز شام کو مجھے اس باغ میں لے کر آیا کرتی تھیں۔ وہ تو بنچ پر بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھنا شروع کر دیتیں یا سلائی کرنے لگتیں، میں سنگِ مرمر کے اس چبوترے کے گرد کھیلنا شروع کر دیتی جس پر ملکہ معظمہ تخت نشین تھیں، ہاتھ میں عصا لیے ہوئے، بھاری شاہی پوشاک پُر وقار انداز میں زیب تن کیے ہوئے، صلیب کے نقش سے آراستہ کرۂ ارض کا نشان اس پوشاک پر سجائے ہوئے۔ ہرے ہرے سبزہ زار، ان میں بھڑکتے رنگوں والے پھولوں کی کیاریاں، وسط میں یہ ملکہ وکٹوریہ کے بت والا چم چم کرتا چبوترہ۔

ہم ان محلات کے پاس سے ہو کر گزرے جن میں سے کسی میں کوئی کلب قائم ہو گیا تھا، کسی میں

کچہری کھل گئی تھی، کسی نے عجائب گھر کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کتنے ہی سرکاری رہائش گاہ بن گئے تھے۔ جس محل میں اب ایک انگلش کلب قائم تھا اس کے گنبد پہ نصب سنہری چھتر دھوپ میں جگر جگر کر رہا تھا۔

زہرا بولی "سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں عمارتوں پہ کھرے سونے کی پرت چڑھائی جاتی تھی!"

میں نے تردید میں کہا "یہ تو ملمع ہے۔"

حکیمن بوا کہنے لگیں "بادشاہوں کے راج میں سچا سونا ہی چڑھایا جاتا تھا۔ انگریز سارا سونا اتار کے لے گئے۔ ارے اس نگر میں بہت خزانہ چھپا ہوا ہے۔ ان میں کتنا سونا کتنے بھاری گہنے ہیں۔ بی بی! جب یہاں سے اشراف، گورے سپاہیوں سے جان بچا کر بھاگے تو اپنی جمع جتھا زمین میں گاڑ گئے۔ یاں پر سرنگیں کھدی ہوئی ہیں، ایک محل سے دوسرے محل تک، دوسرے محل سے تیسرے محل تک۔ ان سرنگوں میں خزانے دبے ہیں۔ مگر ان سرنگوں میں کوئی جا نہیں سکتا۔ ان میں جن رہتے ہیں۔ جو واں قدم رکھتا ہے اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔" انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ کہنے لگیں "ہم دنیا میں بند مٹھیوں کے ساتھ آتے ہیں، پر جب جاتے ہیں تو ہاتھ کھلے اور خالی ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں کسی کو بقا نہیں ہے۔ بس اللہ مرنے والوں پر اپنا فضل کرے۔" حکیمن بوا نے طے کر رکھا تھا کہ ہمیں غافل نہیں ہونے دیں گی کہ ہم یہ سفر کیوں کر رہے ہیں۔

کار اُس سڑک پہ مڑی جو ندی کے کنارے کنارے جا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے بہتے پانی میں اٹھتی ہوئی سست لہروں پر دھوپ سے نقش بن بن کر بکھر رہے تھے۔ دوسرے کنارے پر یہاں سے وہاں تک دھوبیوں نے اپنے دھوئے ہوئے کپڑے پھیلا رکھے تھے۔ شوخ رنگ، ہلکے رنگ، ہر طرح کے رنگ زمین پہ بکھرے ہوئے تھے۔ قمیص اور پائجامے جو اس وقت کسی تن پہ آراستہ تھے، یوں لگ رہے تھے جیسے رقص میں ہوں۔

دور پرے یونیورسٹی کی محرابیں اور گنبد نظر آ رہے تھے۔

بائیں سمت میں ریذیڈنسی کی عمارت دکھائی دے رہی تھی جو گولہ باری اور وقت کی ستم رانیوں سے اب کھنڈر بن چکی تھی۔ درختوں، بیلوں اور پھولوں کی کیاریوں کی وہ بہتات تھی کہ لگتا تھا کہ یہ کھنڈر سبزے کے بیچ سے اگا ہے۔ ایک ٹوٹی پھوٹی برجی پر یونین جیک لہرا رہا تھا۔

زہرا کہنے لگی "ہوا بہت ہی سست چل رہی ہے۔ پرچم میں کوئی جنبش ہی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "وہ لوگ کہتے ہیں کہ پوری دنیا میں یونین جیک ایسا پرچم ہے جو دن رات لہراتا رہتا ہے۔ لیکن ایک دن آئے گا کہ یہ پرچم نہیں لہرائے گا۔"

"شاید تم اس پرچم کو اتارو گی۔" زہرا نے کہتے کہتے اچانک ایک ٹکڑا لگایا "اسد کی مدد سے۔"

"تمہیں اسد کا نام لینے کی جرأت کیسے ہوئی۔" میں تو بھڑک اٹھی۔

''بٹیا، اے بٹیا! یہ کوئی لڑنے کا وقت ہے۔'' حکیمن بوا نے سرزنش کی۔

کار کی رفتار ایک دم سے آہستہ ہوگئی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی ایک ٹولی جوش میں چیختی چلاتی سڑک کے پار جا رہی تھیں۔ آنکھیں آسمان پر لگی ہوئی تھیں۔ چلا رہے تھے'' پکڑو، پکڑو۔''

ندی کنارے ایک وسیع و عریض ریتلا میدان تھا جہاں پتنگ بازی کا مقابلہ گرم تھا۔ پیچ لڑائے جا رہے تھے۔ ایک اچھا خاصا چھوٹا موٹا میلہ جما ہوا تھا۔ ایک طرف خوانچہ فروشوں اور پھیری والوں کی بولیاں تھیں۔ دوسری طرف پیچ لڑانے والے استادوں کے گرد بے فکروں، احدیوں کا ہجوم تھا۔ نظریں ان کے نیلے آسمان پر جمی تھیں جہاں رنگ رنگ کی پتنگیں ماہرانہ چالوں کے ساتھ کبھی ڈولتی کبھی چکر کھاتی، کبھی کبھی گھوم پھیر کا رنگ دکھاتی نظر آ رہی تھیں۔

اچانک میری نظر ایک اور ہجوم پر جا پڑی جس میں بہت ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اپنی لڑائی جھگڑائی کو بھول کر میں نے زہرا کو ٹہوکا دیا'' ارے زہرا دیکھ، مرغوں کی لڑائی۔''

لڑتے ہوئے مرغوں کے گرد ایک شور مچاتا ہجوم اکٹھا تھا۔

'' کہاں؟ کدھر؟ مجھے تو دکھائی نہیں دیا۔۔۔۔۔ ہائے اللہ میں نے مرغوں کی لڑائی کیوں نہیں دیکھی۔''

'' اے لڑکیو! بھلا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔'' حکیمن بوا نے ہمیں جھاڑ پلائی۔ لیکن اگر کہانی سنانے کا موقع ہاتھ آ جائے تو وہ اسے کبھی جانے نہیں دیتی تھیں۔ سو بس شروع ہو گئیں'' اب دیکھنے کے لیے رہ کیا گیا ہے۔ وہ زمانے چلے گئے جب نواب لوگ مرغ بازی اور بٹیر بازی میں اپنی دولتیں لٹا دیتے تھے اور تگوڑی پتنگ ایسے اڑاتے تھے کہ اڑاتے ہوئے اس میں سو سو روپے کا ایک ایک ہزار نوٹ ٹانک دیتے تھے۔''

کار کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی اور اب ہم مڑ کر ندی پار کر رہے تھے۔

یہ میرا پسندیدہ پل تھا۔ لگتا تھا کہ یہ پل سوچ سمجھ کر اس مقام پر بنایا گیا تھا جہاں شہر ختم ہوتا تھا کہ جب کوئی شہر سے نکلنے لگے تو اسے اس کی آخری حد پر اس کا سارا حسن ایک نقطے پر سمٹا نظر آئے۔ ندی پل سے پرے بے چوڑے پیانے پر خم کھاتی ہوئی پھیلتی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بائیں کنارے پر اور اس سے پرے افق کتنا بھرا پرا دکھائی دے رہا تھا۔ پیش منظر میں مسجد اور ٹنگ زیب نمایاں تھی۔ پھر نوابوں وزیروں کے امامباڑے اور دور فاصلے پر گھنٹہ گھر کہ اپنے گرداگرد پھیلے ہوئے پارک کے درختوں میں سے ابھرتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پرے افق کو تکتی ہوئی نظروں سے اوجھل پرانا شہر پھیلا ہوا تھا۔ آغوش میں کیا کیا کچھ لیے ہوا تھا۔ قلاش اشراف کے ڈھیرے ڈھیرے ڈھیتے ہوئے مکان، خلقت سے بھرے بازار، گندگی، شور و ہنگامہ، پھر اس کا اپنا حسن، اپنی صنعت گری، اس کے اپنے ہنرمند اور فنکار، وہ تنگ پتلی گلیاں اور ان میں چلتے پھرتے شیریں سخن لوگ۔

اب ہم پل پار کر کے نواحی علاقے سے گزر رہے تھے جہاں شہر کا رنگ مدھم پڑ چلا تھا۔ اس کی جگہ کچھ دیہات کا سا نقشہ ابھر رہا تھا۔ چھوٹا سا بازار، اڑتی گرد، بھنبھناتی مکھیاں، پلاستر سے محروم مکان، مفلسی کا ڈیرا تھا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک پر بیل گاڑیاں اونگھتی رینگتی چل رہی تھیں، بیل تھکے تھکے دکھائی دے رہے تھے۔ اور گاڑی بان ایسے بے حس کہ پیچھے کار کا ہارن تیز تیز بج رہا ہے مگر ان کے کان پہ جوں ہی نہیں رینگ رہی۔ دہقان سڑک کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے۔ جوتیاں اتار کر ہاتھوں میں سنبھالی ہوئی تھیں کہ ان کا چمڑا خراب نہ ہو اور پیروں کو آرام ملے۔ عورتیں گرد میں اَٹے لہنگے پہنے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ پھولے پیٹوں اور دھنسی آنکھوں والے ادھ ننگے بچے انگلی پکڑے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

جب کوئی کار یا لاری ہمارے برابر سے گزرتی تو اتنی گرد اڑتی کہ گرد کے بادل بن جاتے جو ساری سڑک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے اور جھریوں میں سے چھن کر گرد اندر آ جاتی۔ ہم اس سے بچنے کی کوشش میں اپنے منہ اور ناک کے نتھنے ڈھانک لیتے اور سانس روک لیتے۔

گرد اڑ کر درختوں کی نچلی ٹہنیوں پر جم گئی تھی۔ ان اونچے اونچے ٹیڑھے میڑھے درختوں کی بل کھاتی خشک جڑیں سڑک کے کنارے پھیلتی چلی گئی تھیں۔ ان کناروں سے گزر کر کھیتوں میں پہنچ کر کھڑی فصل کے ساتھ گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ دور فاصلے پر آم اور امرود کے جھنڈ ہرے بھرے دکھائی دے رہے تھے۔ کچے گھروں میں رہنے والے دیہاتیوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ لوگ زمین ہی کا کوئی حصہ ہیں۔

شہر سے آٹھ میل دور گئے ہوں گے کہ امیر پور کے راجہ حسن احمد کی کوٹھی اور باغ کی سفید چونا دیواریں نظر آئیں۔ یہ کوٹھی انہوں نے مہمان خانے اور ریسٹ ہاؤس کے طور پر بنوائی تھی۔ میرے لیے وہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میں سمجھ لیتی کہ اب حسن پور زیادہ دور نہیں ہے، اور یہاں سے میل کچھ چھوٹے چھوٹے محسوس ہونے لگتے۔

بس جلدی ہی ہم مڑ کر حسن پور والی سڑک پہ آ گئے۔ اونچے نیچے رستے پہ موٹر اچھل اچھل کر چلنے لگی۔ بار بار ہمیں دھکے لگتے۔ ویسے تو بابا جان نے یہاں سڑک بنوا دی تھی مگر اس کی مرمت کے اخراجات روز بروز بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے جو گرد اڑتی چلی آ رہی تھی وہ لگتا تھا کہ اب موٹا بادل بن گئی ہے۔ بیل گاڑیاں ہمیں دیکھ کر چلتے چلتے چرخ چوں کر کے رک گئیں۔ اس پتلی سڑک پر وہ ہمیں راستہ دے رہی تھیں۔ دیہاتی لوگ بہت جھک کر بڑے ادب سے سلام کرتے اور گرد سے بچتے ہوئے سڑک پار کر کے اپنے رستے پر پڑ لیتے۔

مجھے بڑی آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ضرور ان کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ تھا کہ یہ لوگ ـــــ ان لوگوں سے، جو شاہراہ پر ہمیں ملے تھے، مختلف نظر آ رہے تھے۔

کار ایک نالے پر سے ہو کر گزری۔ اس پر سے گزرتے ہوئے ایسا جھٹکا لگا کہ پیٹ میں بل پڑ گیا۔

حکیمن بوا بے ساختہ بولیں "یا اللہ"۔ میری اور زہرا کی ہنسی چھوٹنے لگی تھی کہ اتنے میں سید ھے ہاتھ پر ہماری نظر جا پڑی جہاں آم کے گھنے جھنڈ کے بیچ قبریں نظر آ رہی تھیں۔ ہمارے ہونٹوں پہ جیسے مہر لگ گئی ہو۔

گھڑی بھر بعد پہلے پہل نمودار ہونے والے جھونپڑوں سے پرے ہمیں گھر کی بلند و بالا سفید چونا دیواریں دکھائی دیں۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ ہارن سُن کر آوارہ کتے بھونکتے ہوئے پیچھے دوڑنے لگے۔ پیچھے اڑتی گرد کا پیچھا کرتے ہوئے آہنی گیٹ کے اندر تک آئے۔ کار زنان خانے کے صدیوں پرانے بھاری دروازے کے سامنے جا کر رکی۔ چوکھٹ ویسے تو لکڑی کی تھی مگر اس میں تانبا بھی جڑا ہوا تھا۔ اس اونچی چوکھٹ کو پھلانگ کر ہم نے ڈیوڑھی کے اندر قدم رکھا جہاں کسی زمانے میں پرانے وقتوں کی پالکیاں کھڑی رہا کرتی تھیں۔ ڈیوڑھی سے گزر کر صحن میں آ گئے جہاں دھوپ بھری ہوئی تھی۔ سب سے پہلے جس نے ہمارے قدم لیے وہ شریفن مراسن تھی۔ جس طرح منہ لٹکائے وہ ہمارے سامنے آئی اس سے گویا اُس دن پر سوگ کی مہر لگ گئی۔

حسن پور کے جس خاندان میں اور اس خاندان کے جس رشتہ دار کے کسی گھر میں کوئی تقریب کوئی دعوت ہوتی تو شریفن اپنے طائفے کو، جو اسی کی رشتہ دار تھیں، لے کر وہاں پہنچ جاتی۔ یہ ٹولی خوب گاتی بجاتی نقلیں اتارتی۔ اس کا ڈھولک اعلان ہوتا تھا کہ یہ خوشی کی تقریب ہے۔ شریفن نے بہت اچھی آواز پائی تھی۔ لوک گیت، خاص طور پر جنسی اشاروں کنایوں والے بیاہ کے گیت، خوب مزے لے لے کر گاتی تھی۔ لیکن جب وہ رخصتی کا گیت گاتی تھی تو قیامت ڈھاتی تھی۔ اسے سن کر شاید ہی کوئی ہو جس کی آنکھ بھیگ نہ جاتی ہو۔ نقلیں اتارنے میں اسے خداداد ملکہ تھا۔ اس کی سب سے مقبول نقل وہ تھی جس میں وہ میم صاحب کا سوانگ بھرتی اور گانا گاتی۔ ایسا لگتا جیسے کوئی بلی گا رہی ہے۔ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا کہ کیا بول گا رہی ہے۔ بس تین لفظ پلے پڑتے تھے "ویل۔۔۔۔۔یس۔۔۔۔۔نو۔"

مجھے ہمیشہ انگریزی میں بدحائی دیتی تھی، ایسی انگریزی میں جس کا مجال ہے کوئی لفظ سمجھ میں آ جائے۔ بڑے پیار سے مجھے ننھی میم صاحب کہا کرتی تھی۔ لیکن آج اس نے بہت خاموشی سے مجھے گلے لگایا۔

سترہواں باب

گھر میں بیبیاں کچا کچ بھری ہوئی تھیں۔ صرف حسن پور میں رہنے والی عزیز رشتہ داری ہی نہیں آئی تھیں، آس پاس کے دیہات سے بھی رشتہ دار آئی ہوئی تھیں۔ پھوپھیاں بلند و بالا محرابی درّوں والے چوڑے برآمدے میں تخت پہ بیٹھی تھیں۔ ساری بیبیاں ان کے گرد اکٹھی تھیں۔ گنوارنیں صحن میں پھسکڑا مارے بیٹھی تھیں۔ ان کے بچے کچے یا تو خاموش ان کے گھٹنوں سے لگے بیٹھے تھے یا کھڑے تک رہے تھے۔ ان کے منہ اور ناک پر مکھیاں بیٹھی تھیں۔ ان کے بدن سے چربی کی سی بساند آ رہی تھی۔ ایک عورت نے اپنے موٹے کرتے کا دامن اٹھایا اور اپنی تھل تھل کرتی چھاتی سے بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیا۔ اپنے پھٹے پرانے دوپٹے سے اس نے چھاتی ڈھانکنے کی اپنی سی کوشش تو کی تھی مگر چھاتی مشکل ہی سے ڈھک پا رہی تھی۔

پھر وہی چکر۔ بار بار گلے لگ کر رونا، سسکیاں بھرنا، پرسا دینا۔ اس تکرار سے مجھ پہ تو ایسی بے حسی طاری ہوئی کہ باباجان کی موت ہی میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی۔ کچھ اس قسم کا احساس کہ وہ مر گئے تو پھر میں کیا کروں۔ مجھے تو زندہ رہنا ہے۔ بلکہ حسن پور میں تو زندگی اور بھی بامعنی نظر آ رہی تھی کیونکہ یہاں تو زندگی کا وہ نقشہ نہیں تھا کہ جیسے بساط الٹی پڑی ہو، گوٹیں تتر بتر ہوں۔

مجھے اور زہرا کو دور پرے کی خلیری، پھپھیری، ممیری بہنوں نے آ کر گھیر لیا۔ انہی میں زینب بھی تھی جس سے میرا دل ملا ہوا تھا۔ سولہویں برس میں تھی مگر موٹی بھسبھس، نہ صورت نہ شکل۔ مگر بڑی خوشدلی سے اس نے اپنی روکھی شکل و صورت کو قبول کر لیا تھا۔ بس اسی خوش دلی نے اس کی بے رنگ زندگی میں تھوڑی چمک پیدا کر دی تھی۔ کہا کرتی تھی کہ دیکھنا اگلے جہان میں میں کتنی خوبصورت نکلتی ہوں۔ اب اگر خوبصورت ہوتی تو اسی فکر میں گھلا کرتی کہ میرا رنگ روپ زائل نہ ہو جائے۔" بیاہ کا اسے بہت شوق تھا۔ اس شوق کو وہ چھپاتی بھی نہیں تھی۔" ارے ویسے تو یہی ہوگا کہ اب ماں باپ بھائیوں کی خدمت کرتی ہوں۔ بیاہ کے بعد ساس سسر اور میاں کی چاکری کروں گی۔ مگر خیر گہنا پاتا تو پہنوں گی اور ریشمی کپڑے پہنا کروں گی۔"

زینب تو مجھ سے بھی زیادہ گھر میں بند رہی تھی، لیکن جنس کی باتیں اسی نے مجھے بتائی تھیں۔ مگر جنس کے معاملات کو وہ ہنسی دل لگی میں اڑا دیا کرتی تھی۔ ہاں ویسے تو جنس بہت خوفناک چیز ہے۔ بیچاری لڑکی کو تو اچھی خاصی شہادت پیش کرنی پڑتی ہے۔ اس کی دہشت کو کم کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کے بارے میں لطیفہ بازی شروع کر

دو۔ لیکن وہ تو محبت کا بہت رومانٹک انداز میں ذکر کرتی تھی۔ روایتی گیتوں اور کہانیوں میں جو محبت میں ناکامی کی، ہجر کی اداس کر دینے والی باتیں ہوتی ہیں انہیں دہراتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے چپکے سے اپنے دل کی بات مجھ سے کہی تھی کہ مجھے اسد سے عشق ہے۔ مگر اس سے بیاہ کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ حسب نسب میں اس کے برابر کی نہیں ہوں نا۔

اصل میں زینب کی دادی ایک رقاصہ تھی۔ ہمارے دادا جان کے بھیا نے اس سے شادی کر لی تھی۔ ویسے تو ان کی پہلی بیگم نے کبھی اس سے کلام نہیں کیا تھا۔ وہ الگ گھر میں رہتی تھی، یہ الگ اپنے گھر میں رہتی تھیں مگر اس کے باوجود اس عورت کو اتنی ہی عزت دی گئی جتنی ہمارے بیچ دادا کی بیوی کو ملنی چاہیے تھی۔ دونوں بیویوں کی اولاد سے یکساں شفقت برتی جاتی تھی۔ ہاں شادی بیاہ اور جائیداد کے معاملات میں ضرور امتیاز برتا جاتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد زہرا، زینب اور میں مل کر برآمدے سے ایک بانوں والی چارپائی اٹھا لائے۔ وہ ہم نے آنگن کے ایک کونے میں، جہاں لوگ ہمیں پریشان نہ کریں، لے جا کر بچھائی۔ اچانک زینب بولی ''اے لو نندی آ گئی۔'' اور پھر پکارنے لگی ''اری او نندی!''

میں بھی خوش ہو کر اسے پکارنے لگی ''نندی! ادھر آ۔''

نندی ہنستی مسکراتی لپک کر آئی اور میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میرے پاؤں پکڑ کر کہنے لگی ''سلام بٹیا، اپنی لیلیٰ بٹیا کو دیکھ کے میں تو سکھی ہو گئی اور زہرا بٹیا کو دیکھ کے۔''

''نندی! تو کیسی ہے؟''

''بٹیا، بس جی رہی ہوں۔'' نندی کی آنکھیں خاک میں اٹے میدانوں کی طرح لگ رہی تھیں۔

''نندی! تو واپس آ جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں تو یہی چاہتی ہوں۔''

''بٹیا، میں بھی یاں سے جانا ہی چاہوں ہو۔ مجھے یاں پہ رہنا اچھا نہیں لگے ہے۔ میرے چاچا کی جو لگائی ہے اسے تو میں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ سارا کام میں کروں ہوں، پھر بھی وہ کہوے ہے کہ یہ ہم پہ بوجھ ہے۔ اور تو اور، میری دادی بھی مجھے بہت مارے ہے۔''

''تجھے نہیں'' زہرا مسکراتے ہوئے بولی ''تیرے اندر جو شیطان گھسا بیٹھا ہے اور جو تجھ سے بے حیائی کے کام کرواتا ہے، وہ اس کی پٹائی کرتی ہے۔''

''لیلیٰ بٹیا، تمہیں تو پتہ ہے، جی کہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ جو ہوا اس میں میری تو کوئی خطا نہیں تھی۔''

''نندی، تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔'' زینب نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''جو برے کام کریں ہیں انہیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کرتوتوں پہ پردہ جو ڈال دیویں ہیں۔''

نندی نے بڑے معنی خیز انداز میں یہ بات کہی۔

''زینب ذرا بتا تو سہی، تیرے کیا کرتوت ہیں؟'' میں نے دل لگی میں کہا۔

''مجھے تو پتہ نہیں۔ تھوڑا بہت یہی جھوٹ بولا ہے کہ میں نماز پڑھ رہی تھی، یا ہانک دیا کہ میں نے

قرآن کی اتنی سورتیں ختم کرلی ہیں۔ اس کے آگے تو مجھے اپنا کوئی جھوٹ یاد نہیں ہے۔''

نندی نے زور دیتے ہوئے کہا'' زینب بٹیا، تمہیں تو پتہ ہے کہ میں کس کی بات کر رہی ہوں۔''

''بتاؤنا، کیا بات ہے۔'' زہرا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

نندی کہنے لگی'' ہم غریبوں کا تو بس نام ہی بدنام ہے۔ ہم گھر میں بند ہو کے جو نہیں بیٹھ سکتے۔ مگر ذرا ان چچاؤں اور چچیروں کی خبر لو جو زنان خانوں میں تاک جھانک کرتے پھرتے ہیں۔ ارے وہ مرد ہی تو ہیں، یا کہہ دو کہ نہیں ہیں۔ جو مال سات تالوں میں چھپا کے رکھا جاوے ہے چور اسی کی چوری کریں ہیں۔''

''نندی! اپنی تمری زبان کو بند رکھ۔'' زینب نے جھڑک کر کہا'' کیوں شریفوں کو بدنام کرتی ہے۔''

''شریف؟!'' نندی نے طنز بھرے لہجے میں کہا'' شرافت تو سونے چاندی کے مرتبانوں میں رکھا اچار ہے اچار۔ اگر یہ لونڈیا۔۔۔۔۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں کس کی بات کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ غریبوں کی بچی ہوتی تو کیا ان کے بس کی بات تھی کہ اس کا پیٹ گروا کے اس کے لیے کوئی بر ڈھونڈ لیتے؟''

''نندی، تو بہت بے شرم ہے۔ حرافہ کہیں کی۔'' زہرا نے یہ بات کہتے ہوئے زینب کی طرف رخ کیا ''زینب، یہ کس کے بارے میں بات کر رہی ہے؟ تو نے نہ بھی بتایا تو مجھے کسی نہ کسی طرح پتہ تو چل ہی جائے گا۔''

''مولوی کی بٹیا کا قصہ ہے۔'' زینب نے جھجکتے ہوئے کہا'' نندی، اللہ کرے تیری زبان جل کے کوئلہ ہو جائے۔''

''نندی، تو ایسی سنگدل کیوں ہے۔'' میں نے کہا۔

نندی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔'' میرے ماں باپ تو ایسے ہیں کہ اس سے بہت چھوٹی بات تھی، پر انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں نے یہی تو کیا تھا کہ جو دوسروں کے دلوں میں تھی میں نے وہ بات زبان سے کہہ دی۔''

''میں چلوں۔ پھپھی جان کے پاس جا کے بیٹھنا چاہیے۔'' میں اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔

زہرا بھی کھڑی ہوگئی'' چل کے دیکھوں امی کیا کر رہی ہیں۔''

زینب بولی'' میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

نندی چُپ چاپ زمین پر پسری بیٹھی رہی۔ کیسی دُکھ بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس پہ بہت ترس آیا۔

''نندی، میں کسی کو تیرے ساتھ کر دوں۔ وہ جا کے تیری دادی سے بات کرے کہ وہ تجھے یہاں میرے ساتھ چھوڑ دے۔ تیری دادی تجھے آنے دے گی نا؟''

نندی کھل اٹھی۔ آنکھیں پونچھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہنے لگی'' بٹیا، دادی تمہیں ناں نہیں کرسکتی۔''

اٹھارہواں باب

زینب کورات کے کھانے کے بعد چلے جانا تھا۔ گھر جا کر اسے دیکھنا تھا کہ دادی کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ زہرا اور میں نے اس کے ساتھ جانے کی اجازت حاصل کر لی۔ بڑی بی کو جا کر سلام بھی تو کرنا تھا۔ وہ خود پڑے کے لیے نہیں آ سکتی تھیں کہ ان کی طبیعت خراب تھی۔ گھر کی فضا میں تو ہمارا دم گھٹا جا رہا تھا۔ چاہ رہے تھے کہ کسی بہانے یہاں سے نکلیں۔

ہمارے پڑدادا اور ان کے بھیا کے بیٹوں پوتوں کے گھر گاؤں کنارے برابر برابر تھے۔ صحن میں بیچ کی دیوار میں دروازہ نکالا گیا تھا کہ اس میں سے ہو کر آدمی ایک گھر سے دوسرے گھر جا سکتا تھا۔

نندی لالٹین لے کر ہمارے آگے آگے چل رہی تھی۔ ایک نوکر کو اس نے آتے دیکھا تو چلائی "پردہ، پردہ"۔ وہ غریب وہیں ٹھٹھک گیا اور منہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ جب تک ہم گزر نہیں گئے وہ اسی طرح کھڑا رہا۔

نندی ہمیں بڑھئی کے احاطے کی طرف سے لے گئی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں بچی تھی تو یہاں آ کر بیٹھ جاتی اور کاریگروں کو کام کرتے دیکھتی رہتی۔ کوئی آری چلا رہا ہے، کوئی لکڑی پہ کھدائی کر رہا ہے۔ جو بڑھئی ان سب کا استاد تھا اس نے ایک مرتبہ چھوٹا سا منقش گڑیا کا پالنا بنا کر دیا تھا۔ ویسے میں نے تو اس سے تیر کمان مانگا تھا۔

ہم سانڈ بیلوں کے سائبانوں سے ہوتے ہوئے گزرے۔ یہ بیل رہٹ میں جوتے جاتے تھے۔ ہلوں میں بھی جتتے تھے۔ اور جو گاڑیاں ہمارے لیے اناج اور لکڑی لے کر شہر آتی تھیں ان لدی پھندی گاڑیوں کو بھی یہی بیل کھینچتے تھے۔ ان کے پاس ہی گائیں بھینسیں بھی کھڑی تھیں جو دودھ دیتی تھیں اور اس دودھ سے مکھن اور گھی نکلتا تھا۔

یہ کیم شیم ڈھور ڈنگر گوبر کی بساند سے لپے اندھیرے میں کس طرح بار بار جھرجھری لیتے، کس طرح نتھنوں سے لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔ میں ڈر کر زینب کے بالکل قریب آ گئی۔ زینب کھلکھلا کر ہنسی اور مجھے کھونٹوں کی طرف دھکیل دیا۔ میں چیخ مار کر نندی کی طرف لپکی۔

ہمارے اس مختصر سفر میں سب سے لمبی مسافت یہی تھی۔ زینب کا گھر ایسا کون سا دور تھا۔ یہی کوئی

سات منٹ کا پیدل کا رستہ ہوگا۔ مجھے تو وہاں جانے میں بہت لطف آیا۔ وہ اس وجہ سے کہ زینب کی دادی اور اماں جان اتنی محبت سے پیش آتی تھیں کہ نہال کر دیتی تھیں۔ ان کے یہاں صرف محبت تھی۔ نکتہ چینی اور اعتراضات سے پاک محبت۔

یہ لوگ دوسرے افرادِ خاندان کے مقابلے میں غریب تھے۔ زینب کے ابا جان کامل آدمی تھے۔ جو تھوڑی بہت زمین انہیں ورثے میں ملی تھی اسی کے محصول پر گزارہ تھا۔ ٹھگنے قد کے آدمی تھے، تو ند نکلی ہوئی۔ گال جیسے اُدھ پھولے غبارے ہوں، داڑھی سرخ، سر کے بال سفید۔ آواز تاروں کی کرر کرر سے ملتی جلتی۔ سارے دن گھر کے باہر بانوں والی چارپائی پہ بیٹھے حقہ گڑگڑاتے اور گپ بازی کرتے رہتے۔ لیکن جب کبھی کھانا دانا ہوتا تو پھر یری لے کر اٹھ کھڑے ہوتے اور کام میں جت جاتے۔ اس لمبے چوڑے بھرے پرے خاندان میں جب کبھی دعوت کی تقریب پیدا ہوتی تو باورچی خانے کا انتظام اور باورچیوں کی نگرانی انہی کے سپرد ہوتی۔ مہمان جتنے زیادہ ہوتے اتنے ہی زیادہ یہ خوش نظر آتے۔ سیکڑوں میں ہوتے تو پھر تو ان کی خوشی دیکھنے والی ہوتی۔ بھڑکتی بھٹیوں اور تندوروں کے بیچ گھومتے پھرتے یوں دکھائی دیتے جیسے کوئی جادوگر ہو۔

زینب کی امی جان کو جڑی بوٹیوں کی معلومات بہت تھی۔ ان سے وہ عرق، مرہم اور جلاب کی دوائیں تیار کرتی تھیں۔ اسی سبب اس گاؤں کے وید حکیم ان سے بہت چڑتے تھے۔ لیکن اس بی بی کے پاس ان باتوں کے لیے وقت کہاں تھا۔ خود آل اولاد کی دیکھ بھال کرنا اور میاں کو ٹہکاتے رہنا کہ زمینوں کو جاکے دیکھو، بس اسی میں سارا وقت گزرتا تھا۔ چھ بچے تھے۔ تین بیٹے جو زینب سے بڑے تھے اور دو بیٹیاں جو اس سے چھوٹی تھیں۔ دو بچے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بچے اگر اس سے بھی زیادہ ہوتے تو بھی وہ خوش رہتیں کیونکہ ان کا ایمان تو یہ تھا کہ سب کا پالنے والا اللہ ہے۔ اور پھر اولاد میں بھی تو ایک کی دیکھ بھال دوسرا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات میں پختہ ایمان نے ان میں اتنی ہمت پیدا کر دی تھی جس کا کوئی حد و حساب نہیں تھا۔ ایک دفعہ گاؤں میں ہیضہ پھیل گیا۔ گاؤں سے نکل جانے کا خیال دل سے نکال کے وہ بیماروں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئیں کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے کوئی مفر نہیں ہے اور اس لیے ڈرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

گھر کے اس بھاری لکڑی کے دروازے پہ سب سے پہلے زینب پہنچی۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو کواڑ چرچرائے۔ ٹاٹ کا پردہ ایک طرف ہٹا کر اس نے اونچی آواز میں کہا "دادی اماں! دیکھو تو کون آیا ہے۔ زہرا اور لیلیٰ آئی ہیں آپ کو دیکھنے۔"

بائیں طرف کے کچی دیواروں والے برآمدے سے کھٹر پٹر کی آواز آ رہی تھی۔ نوکرانی کی بیٹی کالو برتن بھانڈے دھو مانجھ رہی تھی۔ ننھی کی لالٹین کی روشنی میں اس کی دھندلی دھندلی شکل نظر آ رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں مونج کا گچھا تھا، دوسرے ہاتھ میں گیلی راکھ میں سنا تانبے کا پیالہ۔

"سلام" اس نے اونچی آواز سے کہا۔

جواب میں ہم نے بھی کہہ دیا "سلام"۔

ہم ڈھلواں چھپر کے نیچے سے ہوتے ہوئے گزرے۔ یہ چھپر لکڑی کے دو کھمبوں پر ٹکا ہوا تھا اور دھوپ اور بارش سے بچاؤ کا کام دیتا تھا۔ یہاں سے نکل کر ہم صحن میں آئے اور صحن سے مٹی اور اینٹ سے بنے دالان میں داخل ہوئے۔ اس کے لکڑی سے بنے منقش ستونوں نے اتنا زمانہ دیکھا تھا کہ اب کالے پڑ گئے تھے۔ دالان کے اُس طرف وہ نیچی چھت والا کمرہ تھا جس میں لوہے کی سلاخوں والی کھڑکیاں تھیں اور جس میں زینب، اس کی بہنوں اور اس کی دادی اماں کی رہائش تھی۔ برابر میں دو اور کمرے تھے۔ ان میں اس کے ماں باپ اور بھائیوں کی رہائش تھی۔

ہم زینب کے ساتھ اس گھٹن کمرے میں داخل ہوئے۔ لیمپ کی روشنی میں کچھ بستر بچھے نظر آئے، کچھ پوٹلیاں گٹھریاں اور صندوق۔ اس چھوٹے سے کمرے میں اتنا کچھ ٹھنسا ہوا تھا۔ روشنی دادی اماں کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس روشنی میں ان کے چہرے کی جھریاں کچھ زیادہ ہی گہری نظر آ رہی تھیں۔ یہ چہرہ جو کبھی حسین و جمیل ہوگا اب اپنی دھندلی دھندلی آنکھوں میں پڑے گڑھوں کے ساتھ تو بہت خستہ و درماندہ نظر آ رہا تھا۔ پائنتی سے بستر تھوڑا ہٹا کر کالو کی ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ مفلسی نے اس کی شکل بگاڑ دی تھی اور بھوک نے لاغر کر دیا تھا۔ کالو آ کر دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس میں ایک پھبن تھی جس کا شاید خود اسے احساس نہیں تھا۔ اپنی اندھی آنکھوں میں ایک شوق لیے ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اس طرح کھڑی تھی کہ جیسے کھلی ملی بھی ہو اور الگ تھلگ بھی ہو۔ ہر آواز پر اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اسی طرف مڑ جاتیں۔

"آداب، دادی اماں!" زہرا اور میں نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آداب کیا۔

"بیٹیو جیتی رہو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی کھال لٹکی بانہیں پھیلا کر ہمیں گلے لگایا۔ ہم نے نوکرانی کو بھی سلام کیا۔ جواب میں اس نے اپنی سوکھی چمڑی والی باہوں کو پھیلایا اور ہمارے سروں پہ ہاتھ پھیرا۔ "بڑی عمر ہو، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو!"

دادی اماں نے انگلیوں سے ہمارے چہرے ٹٹولے اور کہنے لگیں "بڑھاپے میں دکھائی بھی تو نہیں دیتا۔ اور اندھیرا ہو تو آنکھیں بالکل ہی پٹ ہو جاتی ہیں۔ میں اپنی بیٹیوں کو دیکھ بھی نہیں سکتی کہ بڑی ہو کے کتنی خوبصورت نکلی ہیں"

بڑھاپے نے دادی اماں کو کالو سے بھی زیادہ اپاہج بنا دیا تھا۔ بلکہ کالو کے یہاں تو بینائی چلے جانے کے بعد حواس زیادہ تیزی سے کام کرنے لگے تھے۔

دادی اماں نے لہک کر کہا "زینب بیٹی، بہنوں کی خاطر کرو۔ ان کا منہ میٹھا کرو۔ تمہاری اماں نے جو حلوہ بنایا ہے وہ جا کے لے آؤ۔"

"بی بی جی، میں جا کے لاوت ہوں۔" کالو اس کے ساتھ ہی اندھیرے میں گم ہو گئی۔

زینب کی بہنیں اپنے اپنے بستر پہ بیٹھی ہمیں خاموشی سے دیکھے جا رہی تھیں۔ جب ہم انہیں دیکھ کے مسکراتے تو وہ جھینپ کر دوپٹوں میں منہ چھپا لیتیں۔ دادی اماں باباجان کی باتیں کر رہی تھیں۔ پرانے دنوں کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھر رہی تھیں۔

ہم بستر پہ بیٹھے حلوہ کھا رہے تھے اور مگن تھے۔ اتنے میں بیرونی دروازے کا پردہ ہٹا اور زینب کا بڑا بھائی برآمد ہوا۔ دبلا پتلا، پیلا ہلدی، بکھرے الجھے گھنگریالے بال۔ لڑکپن میں بہت ذہین تھا۔ ماں نے اسے علی گڑھ یونیورسٹی بھیجنے کی خاطر اپنے کئی زیور بیچ دیئے تھے۔ سال بھر بعد وہ وہاں سے دق کا مرض لے کر واپس آ گیا۔

کالج سے جتنی کتابیں لے کر آیا تھا ایک دن اس نے ان سب کو آگ میں جھونک دیا۔ بات یہ تھی کہ باپ ان کتابوں کو بیچ ڈالنے کے درپے تھا۔ ایک دفعہ میں نے اس کی شیلف میں رکھی یہ کتابیں دیکھی تھیں۔ چھپر تلے کچی دیوار کے سہارے کیا کیا کتابیں رکھی تھیں۔ شیکسپیئر، میکالے، رسکن، ڈوما، کانن ڈائل۔

باپ بیٹے میں بات چیت بھی شاید ہی کبھی ہوتی ہو۔ بس ایک ماں تھی جو اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ اس محبت میں چون و چرا نہیں تھی۔ اسے یہ احساس ستاتا رہتا تھا کہ زندگی نے اس کے بیٹے سے دغا کی ہے۔

وہ آ کر بہن کے پلنگ کے کنارے بیٹھ گیا۔

"میرے لعل" دادی اماں بولیں "تو چپ چپ کیوں ہے؟"

"تھک گیا ہوں۔" وہ بولا۔

"جا جا کے لیٹ جا۔"

"ہاں جا رہا ہوں۔" لیکن بیٹھا رہا۔ پھر مجھ سے انگریزی میں باتیں کرنے لگا "تم نے امتحان تو پاس کر لیا۔ اب تم سکول تو جاؤ گی نہیں۔"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"آگے پڑھائی کا ارادہ ہے؟"

"پتہ نہیں۔ یہ تو حامد چچا پہ موقوف ہے۔"

"ہر بات کسی نہ کسی پہ موقوف ہوتی ہے۔" اس نے بڑے خشک سے لہجے میں کہا۔ پھر لہجہ بدل کر کہنے لگا "میری اسد سے جو باتیں ہوتی رہی ہیں، تمہیں ان سے اتفاق ہے؟"

"کس بارے میں؟" میں نے پوچھا اور زہرا نے بے کلی سے پہلو بدلا۔

"سیاست کے بارے میں۔" پھر تضحیک کے لہجے میں کہنے لگا "اسد انگریزوں کو اب نکال کے دم لے

گا۔ حق اور عدم تشدد کے زور پر انھیں نکالے گا۔ اس کا آئیڈیلزم اصل میں اس کی جہالت کی پیداوار ہے۔ اس نے تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی نے اقتدار آسانی سے چھوڑ دیا ہو۔ یہ تو ماں باپ بھی نہیں کرتے جو رات دن ایک رٹ لگائے رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نورِ نظر کے لیے کتنی قربانیاں دی ہیں۔''

وہ اپنی رو میں بولے چلا جا رہا تھا جیسے بہت دیر چپ رہنے سے تنگ آ گیا ہو۔ بیچ بیچ میں اردو میں بولنے لگتا۔ ''کالج میں ایک میرا دوست تھا جو گھنٹوں روسی انقلاب پر بولتا رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس سے ہمیں سبق سیکھنا چاہیے اور ظلم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ اسد والے راستے کو وہ نہیں مانتا تھا۔ وہ اس سے مختلف راستے کا قائل تھا۔ وہ اپنے آپ کو عقلیت پسند کہتا تھا۔ مجھے کہتا تھا کہ تمہیں مذہب کی افیم لے بیٹھی۔ فرد کی آزادی، فرد کی آزادانہ رائے اور مرضی، عزائم اور منصوبے، بس وہ کچھ اسی قسم کے موضوعات پر مجھ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ باتیں، باتیں، باتیں، باتیں ہی باتیں۔'' ایک تلخ سے انداز میں ہنسا اور پھر جاری ہو گیا۔ ''اسے اس کے مطلق پروا نہیں تھی کہ ہم اس کی باتیں سن اور سمجھ رہے ہیں یا نہیں'' میں نے تو منصوبہ بنا لیا۔ لیکن دوسرے بھی تو منصوبے بنا رہے ہوں گے۔ اگر میرے بنائے ہوئے منصوبے دوسروں کے بنائے ہوئے منصوبوں سے لگا نہیں کھاتے تو پھر کیا ہوگا۔ اگر میری آزادی کا دوسروں کی آزادی سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو پھر کیا ہوگا۔ زندگی تو یوں سمجھو کہ الجھی ہوئی ڈور کا گچھا ہے۔ آدمی بیچارہ اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اسے ڈور کا سرا نہیں ملتا۔ نہ پہلا نہ آخری۔''

بولتے بولتے اسے کھانسی کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ نڈھال ہو کر رہ گیا۔ اس نے بولنا بند کر دیا۔ مجھے بے کلی سی ہونے لگی، مگر میں نے اس بے کلی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ سادگی سے کہا ''اسد صحیح کہتا ہے، ہمیں آزادی ملنی چاہیے۔''

''مگر اس سے فرق کیا پڑے گا۔'' وہ تھکی تھکی آواز میں بولا ''کسی بھی بات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس گاؤں میں ذرا اردگرد نظر ڈالو۔ لوگ جس طرح اب انگریزوں کی حکومت میں پس رہے ہیں ایسے ہی اُس وقت بھی پس رہے تھے جب ان کے اپنے ان پر حکومت کر رہے تھے۔ اور اگر اب پھر اپنوں کی حکومت آئی تو لوگ اسی طرح پستے رہیں گے۔ اسد تو ہمیشہ کا احمق ہے۔ وہ، وہ کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے بس میں نہیں ہے۔''

زہرا بول اٹھی ''بھئی دیر ہو رہی ہے، چلنا چاہیے۔''

ہم نے دادی ماں کو جلدی سے آداب کیا۔ انہوں نے ہمیں دعا دی۔ زینب دروازے تک ہمیں چھوڑنے آئی۔

زینب کے بھائی نے مجھے پریشان کر دیا۔ میرا احساس کچھ اس قسم کا تھا کہ جیسے میں رقص کر رہی ہوں۔ اچھل کود رہی ہوں اور کوئی اپاہج مجھے گھور رہا ہے۔

نندی ہمارے آگے آگے لالٹین لے کر چل رہی تھی۔ گاؤں کی رات، دھوئیں جیسا کہرا۔ اس میں لالٹین کی ہلتی جھلتی پیلی پیلی روشنی۔

اُنیسواں باب

سوم کی رسوم ادا ہو چکی تھیں۔ پُرسے کے لیے آنے والوں نے قرآن کا ایک ایک پارہ پڑھ کر بابا جان کو اس کا ثواب بخشا، دعائے مغفرت کی، کھایا پیا اور رخصت ہو گئے۔ غریبوں مسکینوں میں کھانا تقسیم ہوا۔ یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ اب ہم تھے اور مستقبل کی فکریں۔

اس گھر میں ایک بہت پرانا دھرانا گوشہ تھا جو ہمیشہ اجڑا اجڑا ویران پڑا رہتا تھا۔ وہاں ایک شہ نشین بنی ہوئی تھی۔ میں اور زہرا وہاں جا بیٹھے۔ وہاں بیٹھ کر اپنی جون میں آتے۔ ایک دن ہم وہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ زینب نے ایک شوشہ چھوڑا۔ کہنے لگی "زہرا، اری تیرے تو ہاتھ پیلے ہونے لگے ہیں۔ بوجھو میں نے کہاں سے سنا؟ امی، دادی اماں سے یہ ذکر کر رہی تھیں۔"

"تیرے کان بہت بڑے ہیں۔ پھر تو قیاس کے گھوڑے بھی تو بہت دوڑاتی ہے۔" زہرا کہتے کہتے کچھ اس طرح مسکرائی جیسے دل ہی دل میں خوش ہو رہی ہے۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ زینب نے مجھے دولہا دلہن کی کیا کیا کہانیاں سنائی تھیں۔ اسی نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اس شہ نشین کے عقب میں جو کمرے ہیں ان میں اس خاندان کی کتنی دلہنیں راتیں بسر کر چکی ہیں۔ کس طرح ان کے دولہا دبے پاؤں کھڑی سیڑھیاں چڑھ کر چپکے سے کمرے میں داخل ہوتے، رات بسر کرتے اور اس سے پہلے کہ کسی کی آنکھ کھلے، چپکے سے یہاں سے سٹک جاتے۔

میں نے بڑے بھولپن سے پوچھا "مگر کیوں؟"

"میری بھنو! تو کس سوچ میں پڑ گئی۔" وہ کھی کھی ہنسنے لگی۔

"بوجھو کہ وہ اُس طرح لپ چھپ کے کیوں جاتے تھے۔ ارے، وہ بڑوں کے سامنے تو کھل کھیل نہیں سکتے تھے۔"

"زینب" اب میں نے اس سے پوچھا "تجھے یاد ہے تو نے اس طرح بیویوں کے پاس چوروں کی طرح آنے والوں کے متعلق مجھ سے کیا کہا تھا؟ مجھے حیرانی اس پہ ہوتی تھی کہ آخر وہ اس بات کو کتنے دن چھپا کر رکھ سکتے ہوں گے۔ بچہ پیدا ہونے پر تو سارا بھانڈا پھوٹ جاتا ہوگا۔"

زینب دم بھر کے لیے چکرا گئی۔ پھر ہنسی اور بولی "جو تو کہہ رہی ہے وہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں

آتی تھی۔ اور میری امی تو آج بھی جب دادی اماں بیٹھی ہوں تو ابا کے سامنے نہیں آتیں۔"

زہرانے اس پہ ٹکڑا لگایا "اور تمہیں پتہ ہے کہ بابا جان کی موجودگی میں امی مجھ سے بات نہیں کرتی تھیں۔"

"اچھا! یہ تو بہت بیہودہ بات ہے۔"

"بھنو تم اس بارے میں جو بھی کہو، جو بھی سوچو اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔" زینب نے کندھے جھکائے اور چپ ہو گئی۔

"ارے مجھے کوئی یہ تو سمجھائے۔" میں نے دلیل پیش کی "حامد چچا تو سائرہ چچی سے بااتکلف گفتگو کرتے ہیں۔ کرنے میں کوئی ہے تو ہوا کرے۔ ایک کام ایک کرے تو بے شرمی کی بات ہے، وہی کام دوسرا کرے تو اس میں کوئی بے شرمی کی بات نہیں ہے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ اور ایک بات اور ہے۔ اری بھنو! بیاہ ہے جاتا اور بچے پیدا کرنا ایسی ہی بے شرمی کی بات ہے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ ادھر لڑکی پیدا ہوئی اور اُدھر اس کے بیاہ کی باتیں ہونے لگیں۔ بیاہ کے سوا اور کوئی بات ہوتی ہی نہیں۔"

زینب کو دل لگی سوجھی۔ کہنے لگی "بی بی مجھے لگتا ہے کہ تم میاں کے ساتھ باہوں میں باہیں ڈال کر انگریزی میں گٹ پٹ گٹ پٹ کرتی پھرا کرو گی۔ اچھا زہرا! تو بتا تو کیا کرے گی؟"

"یہ تو اس وقت کے حالات پہ منحصر ہے۔"

"ہاں اس پہ منحصر ہے کہ تیرا بیاہ کسی کالے صاحب سے ہوتا ہے یا کسی اور سے۔" زینب نے ٹھٹھا لگایا۔

"اچھا بتا، تو کیا کرے گی؟" زہرا نے پلٹ کر سوال کیا۔

"مجھ سے تو بھنو جو کہا جائے گا وہی کروں گا۔ لیلیٰ بی بی تم نے کیوں ایسا منہ بسور رکھا ہے۔ لو میں ایک لڑکی کا قصہ سناتی ہوں۔ وہ تم جیسی نہیں تھی۔ پرانی رسموں رواجوں کی قائل تھی۔ جب اس کا بیاہ ہوا اور منہ دکھائی کی رسم ہونے لگی تو جہاں مہمان بیٹھے انتظار کر رہے تھے وہاں اسے لے جا کر بٹھا دیا۔ اور تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ رواج یہ ہے کہ منہ دیکھنے والیوں کی خاطر بار بار سہرا ہٹا کر صورت دکھائی جاتی ہے تو دلہن سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ گم متھان بیٹھی رہے اور نہ ہلے جلے۔ جو بی بی دلہن کو سہارا دیئے بیٹھی تھی، اسے ایسا لگا کہ دلہن کا بدن بھاری پتھر ہو گیا ہے۔ ارے دلہن تو بیہوش ہو چکی تھی۔ اور پتہ ہے کیا بات تھی؟ اس کے تلوے میں ایک کنکھجورا چمٹا ہوا تھا اور اس نیک بخت نے مجال ہے کہ سانس بھی لیا ہو۔"

میں بولی "یہ تو گدھا پن ہے اور کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ یہ سب دقیانوسی باتیں ہیں۔ تو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟"

"ارے میرا کیا خیال ہوتا۔ میں تو ایسی باتوں کے بارے میں سوچتی وو چتی ہی نہیں۔ جو کسی نے

کہہ دیا وہ کر لیا۔" زینب کہتے کہتے اٹھ کھڑی ہوئی "اچھا اب نیچے چلیں۔ تم لوگ تو بہت زیادہ سنجیدگی پہ اتری ہوئی ہو۔"

جب ہم گھر میں بند بند بہت اکتا جاتے تو قریب کے باغیچے میں چلے جاتے۔ اس کے گرداگرد ایک اونچی پکی دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ اس لیے پردہ دار بیبیوں کے لیے وہاں گھومنے پھرنے کی بہت آسانی تھی۔

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جو آم اور امرود کی ٹہنیوں سے کھیل رہی تھی۔ جھکی جھکی ٹہنیوں کے بیچ گرگٹ دوڑتے پھر رہے تھے۔ ان ٹہنیوں سے چھن چھن کر دھوپ زمین پر پڑ رہی تھی جس سے زمین پر نقش و نگار بن گئے تھے۔ جب ہوا چلتی تو یہ نقش و نگار تتر بتر ہو جاتے۔

گلاب کے باغیچے کے برابر سائبان میں جو ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا ہم اس کی سیڑھیوں پہ بیٹھے تھے۔ گئے دنوں کی باتیں کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ آنے والے دنوں کا کیا رنگ ہوگا۔

آموں کی ٹہنیاں بور سے لدی نظر آ رہی تھیں۔ بندی انہیں دیکھتے ہوئے بولی "اب کے آموں کی فصل اچھی ہوگی۔"

"ہاں اگر بے وقت کی بارش نہ ہو جائے۔" زینب بولی "زیادہ مینہ پڑے تو مشکل، کم پڑے تو مشکل۔ کسی بات کا کوئی پتہ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔"

"اگر ہم اس وقت تک یہاں رہے" زہرا کہنے لگی "پھر میں تو ڈال سے توڑ توڑ کے آم چوسا کروں گی۔"

"اور ہم پھر جھولا ڈالیں گے۔" میں نے کہا۔

برسات کے دنوں میں ہم یہاں آم کا جو سب سے اونچا پیڑ ہوتا تھا اس کے سب سے موٹے گدے میں موٹی رسیوں سے باندھ کر تختہ لٹکا لیتے تھے۔ اس میں بیٹھ کر جھولتے تھے۔ زینب برکھا کے گیت گاتی تھی۔ جھولتے ہوئے ہمارے دوپٹے ہوا میں کیسے لہراتے تھے اور جھوٹا لے کر جب ہم اوپر جاتے تھے تو دیواروں سے پرے اودی اودی گھٹاؤں سے لدے آسمان تلے ہریالی لہلہاتی نظر آتی۔

"میرا خیال ہے" زہرا کہنے لگی "ہم حسن پور میں رہیں گے۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ اچھا ہی ہے۔" میں نے اپنی رائے بتا دی۔ مگر زینب کو یقین نہیں آیا۔ بولی "اگر مستقل یہاں رہنا پڑا تو رہو گی؟ پھر شہر میں جو تمہاری سہیلیاں ہیں ان کا کیا ہوگا۔"

"میری کوئی سہیلی ہے ہی نہیں۔ رہی سیتا تو اس کا خط آیا ہے کہ وہ پڑھنے کے لیے انگلینڈ جا رہی ہے۔" اور میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری جس میں خود ترحمی کا بھی احساس تھا اور رشک بھی تھا۔

"تمہیں انگلینڈ جانے کی خواہش نہیں ہے؟" زینب نے پوچھا۔

"میں تو پوری دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔ تو اپنی کہہ۔ تیرا کیا جی چاہتا ہے؟"

''میں تو چاند پہ جانا چاہتی ہوں۔'' زینب نے دل لگی میں کہا۔

نندی بولی ''میرا تو بس ایک ہی جی چاہتا ہے کہ گھر جاؤں، ماں باپ کے پاس۔''

''کسی کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ قسمت اسے کہاں لے جائے گی۔'' زہرا نے بڑے حکیمانہ انداز میں بات کی۔

''تیرا کیا مطلب ہے کہ تیرا میاں کہاں لے جائے گا؟'' زینب نے چھیڑخانی کی اور زہرا نے کھی کھی ہنسنا شروع کر دیا۔ ''فضول باتیں مت کیا کر۔''

''ایک دن تو میں جاؤں گی۔'' میں نے بڑے وثوق سے اعلان کیا ''میں پوری دنیا کا سفر کروں گی۔''

زہرا بولی ''بی بی، تمہیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ تم کالج بھی جا سکو گی یا نہیں۔ تمہیں کیا معلوم فیصلے کیسا ہو رہے ہیں۔''

ایسے خواب دیکھنے کا کوئی حاصل حصول تو تھا نہیں۔ سوچا کہ عافیت اسی میں ہے کہ جب تک یہاں ہو گپ بازی کرتے رہو۔ باقی نندی اور زینب کو تو گاؤں کی ایک ایک بات معلوم تھی کہ کیا کیا ہوا ہے اور کیا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

بیسواں باب

عابدہ پھپھی کو تو بالکل چپ لگ گئی تھی۔ نماز ختم کرنے کے بعد بھی کتنی دیر تک عالمِ استغراق میں جانماز پہ بیٹھی رہتیں۔ لگتا تھا کہ ان کے لیے نماز کے پانچ وقتوں کے سوا وقت کے کوئی معنی ہی نہیں رہ گئے ہیں اور ان پانچ وقتوں کا پتہ انہیں مؤذن کی آواز سے چلتا تھا۔

گاؤں کی بڑی بوڑھیوں میں اس پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ زینب کی دادی اماں نے سائرہ چچی اور ماجدہ پھپھی سے کہا "ویسے تو نماز پڑھنا بڑی اچھی بات ہے، مگر عابدہ کی ابھی یہ عمر تو نہیں ہے کہ سارا وقت اللہ اللہ کیا کرے۔ ابھی تو یہ عمر ہے کہ کسی کا گھر آباد کرے، پوتوں پھلے، دودھوں نہائے۔"

ماجدہ پھپھی نے ٹھنڈی آہ بھری اور رونا شروع کر دیا۔ سائرہ چچی نے دادی اماں سے اتفاق کیا کہ کچھ بندوبست کرنا چاہیے۔

ایک روز حامد چچا نے مجھے اور زہرا کو بلا بھیجا۔ اپنی نشست کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ہماری پھپھیاں پہلے سے وہاں موجود تھیں۔ صوفے پر چچا کے برابر سائرہ چچی بیٹھی تھیں۔ ماجدہ پھپھی سامنے بیٹھی تھیں۔ درمیان میں جو سیدھی پشت والی لکڑی کی بنی کرسیاں تھیں، ان پر جا کر ہم دونوں مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ ہمارے پیچھے پیچھے اسد اور زاہد بھی آ گئے اور دروازے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ حامد چچا نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

سب خاموش تھے۔ حامد چچا نے جیب سے پائپ اور پاؤچ نکال کر پائپ بھرا اور اسے جلانے کے لیے کئی ایک دیا سلائیاں پھونک ڈالیں۔ میں سامنے دیوار پر آویزاں تصویریں دیکھنے لگی۔ کچھ فوٹو تھے، کچھ چھپی ہوئی تصویریں۔ ریفائل کی تصویر میڈونا، سیگ ایٹ بے، ڈانٹے اور بیٹرس، سٹارم ایٹ سی۔

پھر میری نظر پنکھے پر گئی جو چھت میں ایک موٹے لکڑی کے شہتیر میں لٹکا ہوا تھا۔ موٹا غف کپڑا جس میں ہرے سوتی کپڑے کی جھالر لگی ہوئی تھی۔ گرمیوں میں یہ پنکھا آہستہ آہستہ حرکت کرتا رہتا تھا اور اس میں سے چوں چوں کی آواز نکلتی رہتی تھی۔ اس کے اثر میں آنکھیں مندتی چلی جاتیں اور پھر نیند آجاتی۔ باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا قلی پنکھے کی رسی کھینچتا رہتا۔ جب قلی کو بھی نیند آ لیتی تو پنکھا چلتے چلتے رک جاتا اور سونے والوں کی آنکھ کھل جاتی۔ بس پھر قلی کو اتنا برا بھلا کہا جاتا کہ اس سے دوسرے سونے والے بھی اٹھ بیٹھتے۔

حامد چچا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور سب نظریں ان پر جم گئیں۔ انہوں نے ماچس کی تیلی ایش ٹرے میں رکھی، صوفے سے کمر لگائی اور تامل کے بعد بولے "بہت سوچنے سمجھنے کے بعد میں نے تم لوگوں کے مستقبل کے بارے میں کچھ فیصلے کیے ہیں۔ ماشاءاللہ تم اب جس عمر۔۔۔۔۔"

"مناسب یہ ہے کہ آپ اردو میں بات کریں۔" سائرہ چچی نے بیچ میں ٹوک دیا۔ "اس سے تمہاری بھو کو تمہاری بات سمجھنے میں آسانی رہے گی۔"

وہ اس پر اک ذرا چیں بہ جبیں ہوئے اور پھر اردو میں شروع ہو گئے "اب تم لوگ اس عمر میں پہنچ گئے ہو کہ اس وقت جو قدم بھی اٹھایا جائے گا اس کا تمہارے مستقبل پر فیصلہ کن اثر پڑے گا۔ میری ہمیشہ سے یہ سوچ رہی ہے کہ بزرگوں کو اپنے چھوٹوں پر اپنے فیصلے مسلط نہیں کرنے چاہئیں۔ اسی لیے میں نے تم لوگوں کو یہاں بلایا ہے کہ تم لوگ سن لو کہ ہماری دانست میں تمہارا بھلا کس بات میں ہے۔"

میں سوچنے لگی کہ اگر ہمیں ان کی رائے سے اتفاق نہ ہو تو پھر کیا صورت ہوگی۔ ماننے کے سوا ہمارے لیے کوئی چارہ ہے؟

حامد چچا بدستور جاری تھے "ماجدہ کی خواہش ہے کہ زہرا حسن پور میں ان کے ساتھ رہے اس وقت تک۔۔۔۔۔ ہاں اس وقت تک۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ جب تک صورتحال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔"

ماجدہ پھپھی کہنے لگیں "بھیا، میں نے تو عرض کر دیا ہے کہ میں نے سارے معاملات آپ پر چھوڑ دیے ہیں۔ محسن بھائی سے بھی میں نے یہی کہا تھا کہ بھیا کے مشورے کے بغیر میں کوئی کام نہیں کروں گی۔ اگر آپ کی رضامندی ہے تو پھر آپ جو وقت بھی مناسب سمجھیں گے اس وقت یہ شادی ہو جائے گی۔ دنیا میں ہمارا اور کون ہے۔ سر دھرے تو آپ ہی ہیں۔" اور انہوں نے ہولے ہولے رونا شروع کر دیا۔

"ماجدہ" وہ بیکل ہو کے بولے "میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں اس معاملے پر غور کروں گا۔ بظاہر تو اس نوجوان میں کوئی خرابی دکھائی نہیں دیتی لیکن مزید پوچھ گچھ کروں گا۔ تمہیں خواہ مخواہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اسد نے مٹھیاں بھینچ کر اپنی گود میں رکھ لی تھیں۔ اس کی آنکھیں جمی ہوئی تھیں۔

مجھے اس کانفرنس کا خیال آیا جو چند ہفتے پہلے ہوئی تھی۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کانفرنس میں محسن چچا موجود نہیں ہیں۔ ماجدہ پھپھی نے ناک سے سوں سوں کی اور شال سے بھیگی آنکھوں کو پونچھا۔

حامد چچا نے میری طرف رخ کیا اور بزرگانہ لہجے میں بولے "میں ہمیشہ سے لڑکیوں کی تعلیم کا حامی ہوں۔ والدین اور بزرگوں کا یہ فرض ہے کہ اس بدلتی دنیا میں انہیں جو ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں ان کے حساب سے انہیں تعلیم دلوائیں۔" رک کر انہوں نے ایک دیا سلائی جلائی اور پائپ کے جلدی جلدی

کش لینے شروع کر دیے۔

سائرہ چچی کہنے لگیں "آج کل کے نوجوان تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی اتنی پڑھی لکھی ہو کہ ان کے دوستوں سے بات چیت کر سکے۔ ان کی تواضع کر سکے۔ آج کل کے لڑکے شرطیں بہت لگاتے ہیں۔"

"سائرہ! تم بیچ میں غیر متعلق قصے نہ چھیڑو تو زیادہ اچھا ہو۔ شادی کی طرف تو میرا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔ کسی بات کا کوئی اصول ہونا چاہیے۔ جس چیز کی اہمیت ہے وہ اصول ہے۔"

انہوں نے میز پر مکے مار مار کے ایک ایک لفظ زور دے دے کر ادا کیا۔ پھر وہ برہمی کے عالم میں اپنی ماچس ٹٹولنے لگے۔

سائرہ چچی نے کچھ بیزاری کی کیفیت کے ساتھ کہا "زہرا! اپنے ماموں کو ماچس اٹھا کر دے دو۔ وہ ان کے پاؤں کے پاس پڑی ہے۔" وہ اپنے سر سے روایت کا بوجھ اتار نہیں سکی تھیں۔ اب بھی ان کا نام نہیں لے پاتی تھیں۔

عابدہ پھپھی اچانک اٹھ کر میری کرسی کے پاس آئیں۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں اور آہستہ سے بولیں "میں بہت خوش ہوں۔ یہ طے ہو گیا ہے کہ لیلیٰ کی تعلیم جاری رہے گی۔ اس کے پاپا کی خواہش پوری ہوئی ہے۔"

حامد چچا آہستگی سے بولے "ہاں عابدہ۔" پھر انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ساتھ ہی میں دوسری بات کہی "لیکن سکول کالج کھلنے میں ابھی کئی مہینے ہیں۔ اس عرصے میں اس کی اپنی مرضی ہے جہاں بھی رہنا چاہے۔ ہمارے ساتھ رہے یا آپ لوگوں کے ساتھ حسن پور میں۔ لیلیٰ یہ دونوں ہی تمہارے گھر ہیں۔ ان معنوں میں بھی تمہارے گھر ہیں ان میں تمہارا حصہ ہے۔" پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا "لیلیٰ کہاں رہنا پسند کرو گی؟"

میں نے زبان کھولی تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے کہا "میں یہیں رہوں گی۔"

عابدہ پھپھی کی انگلیوں نے میرے شانے کو جکڑ لیا۔

"مناسب ہے۔" حامد چچا نے کہا "تمہاری یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے پائپ کا ایک کش لیا۔ اسد اور زاہد کی طرف دیکھا اور کہا "تمہارے سلسلے میں یہ ہے کہ تمہاری دونوں کی تعلیم پہلے کی طرح جاری رہے گی۔ اس کے بعد ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ کس قسم کا کام تمہارے لیے موزوں رہے گا۔ میں اس عرصے میں ہوسٹل میں تمہاری رہائش کا بندوبست کردوں گا۔ بہر صورت تمہارے لیے یہی مناسب ہے۔ محنت اور ڈسپلن دونوں اعتبار سے یہ انتظام مناسب رہے گا۔"

"چچا جان! آپ جو مناسب سمجھتے ہیں بجا ہے۔"

اسد بے چینی سے کسمسایا۔ پھر لڑکھڑائے لہجے میں بولا "میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں دہلی

جانا چاہتا ہوں۔"

"کیا کہا؟" حامد چچا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ سب نے اسد کو گھور کے دیکھا۔ زہرا نے بھی۔ اسے اپنی رائے ظاہر کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔

"میں دہلی جا کر جامعہ میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" اسد نے دبے سے لہجے میں اپنی بات کو وضاحت کے ساتھ دہرایا "میرا خیال ہے کہ وہ اس قسم کی درسگاہ ہے جہاں سے تعلیم حاصل کر کے میں ملک کی خدمت کر سکتا ہوں۔"

"ینگ مین!" حامد چچا نے اونچے لہجے میں کہا "پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اس کے بعد سیاست بگھارنا، اس وقت جب تم اپنے پیروں پہ کھڑے ہو جاؤ۔"

اسد کا چہرہ سرخ پڑ گیا "میں کسی پر اپنا بوجھ نہیں ڈالوں گا۔ میں وہاں کوئی کام بھی کروں گا اور تعلیم بھی حاصل کروں گا۔ میں نے اس بارے میں سوچ سمجھ لیا ہے۔"

"تو تم نے سوچ سمجھ لیا ہے؟" حامد چچا نے خشک لہجے میں کہا "اور اب تم ان سے، جنہوں نے تمہیں اس قابل بنایا ہے، مشورہ کیے بغیر اپنے فیصلے خود کرتے ہو؟!"

لگتا تھا کہ بابا جان بول رہے ہیں، جب ان کی مرضی کے خلاف بات ہوتی تھی، اُن لوگوں کی طرف سے جنہیں وہ اپنے آپ سے کمتر سمجھتے تھے یا جن پر انہوں نے کوئی احسان کیا ہوتا تھا۔ میں ان کے تحکمانہ لہجے سے خوفزدہ ہو گئی۔ پتہ نہیں صاحب اختیار لوگ اپنے اختیار کو ہمیشہ دوسروں کو ذلیل کرنے ہی کے لیے کیوں استعمال کرتے ہیں۔

اسد کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ بولے چلا جا رہا تھا جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو کہ کیا کہا گیا ہے۔ "میرا خیال ہے کہ اگر میرے والد زندہ ہوتے تو وہ میری رائے سے اتفاق کرتے اور رضامند ہو جاتے۔"

اسد نے بہت موثر ہتھیار استعمال کیا تھا کیونکہ اس کا منطقی طور پر تو کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ دل اور ضمیر دونوں کو اس نے جھنجھوڑا تھا۔

حامد چچا کا منہ سرخ ہو گیا۔ لگتا تھا کہ جیسے اکھڑ گئے ہوں۔ پھر انہوں نے مختصراً کہا "میں اس سے آگے کچھ نہیں کہوں گا۔" انہوں نے غصے سے کرسی کو پیچھے دھکیلا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ چاروں طرف دیکھا اور پھر اپنی بات دہرائی "مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔ سارے معاملات طے ہو گئے ہیں۔"

سب خاموش تھے۔ اس خاموشی میں موذن کی آواز سنائی دی۔ ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔

اکیسواں باب

بابا جان کے گزر جانے کے بعد یوں لگتا تھا کہ وہ سخت گیر ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے ہیں جنہوں نے سب کو ایک رشتے میں باندھ رکھا تھا۔ ان سب کو جو کل تک ان کی مرضی اور اختیار کے تابع رہ کر زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک برس کے اندر اندر عابدہ پھپھی اور زہرا دونوں کی شادی ہو گئی۔ جس شخص کو عابدہ پھپھی کا شوہر بننے کا شرف حاصل ہوا وہ شیخ اعجاز علی تھے۔ شیخ صاحب دور کے رشتہ داروں میں تھے جن کی بیوی تپ دق میں مبتلا ہو کر اب سے پانچ برس پہلے اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ ان کے بیٹے اور بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ خود صوبائی سول سروس سے ریٹائر ہو کر گاؤں میں، جو حسن پور سے بارہ میل دور ہو گا، آ کر رہنے لگے تھے اور اپنی جائیداد کی، جو زیادہ بڑی نہیں تھی، دیکھ بھال کرتے تھے۔ کسی زمانے میں انہوں نے حامد چچا کی ماتحتی میں تھوڑا وقت گزارا تھا۔ اس نسبت سے اب تک وہ اسی طرح ان کے سامنے مؤدب نظر آتے تھے۔ لمبے تڑنگے، دبلے پتلے۔ امتیاز اس کے سوا انہیں کوئی حاصل نہیں تھا کہ عابدہ پھپھی کے شوہر نامدار تھے۔

جب حکیمن بوا سے اس فیصلے کا ذکر کیا گیا تو خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگیں "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری عابدہ بٹیا کے پھول کھلنے کا وقت آیا۔ قسمت کے لکھے کا کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ یہ میاں تھے جن کے لیے قسمت نے بٹیا کو اتنے برس تک انتظار میں بٹھائے رکھا تھا۔"

مجھے حکیمن بوا کے ایمان پہ بہت رشک آیا، خاص طور سے عابدہ پھپھی کے بیاہ سے پہلے والی رات کو۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پھپھی پر اپنا پیار کیسے ظاہر کروں اور کیسے بتاؤں کہ تمہارے جانے سے میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ آخر میں نے یہ کیا کہ چپکے سے ان کے بستر میں سرک آئی اُسی طرح جس طرح بچپن میں جب مجھے ڈر لگتا تھا تو ان کے بستر میں آ کر دبک جاتی تھی۔ میں نے ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ وہ بھی میرے گلے سے ایسے لگ گئیں جیسے دلاسے اور سکون کی اصل میں انہیں ضرورت ہے۔ ان کے آنسوؤں نے میرے دل کو مسوس لیا اور میرے دماغ پر دھند چھا گئی۔ تقدیر اور فرض اور درد و الم کے بارے میں جو میرے اندر سوال اٹھ رہے تھے ان کا جواب کس کے پاس تھا۔

اس کے بعد زہرا کا بیاہ ہوا۔ اس بیاہ پر ریت رسموں کی وہ پرانی دھوم دھام تو نہیں تھی جب دنوں دعوتوں کا، گانے ناچنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس سے پوری برادری کا الگ تھلگ زندگی والا طور بدل جاتا تھا۔ زندگی میں ایک رنگ آ جاتا تھا اور رونق پیدا ہو جاتی تھی۔ مگر خیر ایسا بھی نہیں تھا کہ بالکل ہی خشک اسلامی طریقے سے شادی ہو کر نکاح کے دو بول پڑھا دیئے، باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

حسن پور کے گھر میں پھر بھیڑ بھڑکا دیکھنے میں آیا، مگر یہ خوشی کا بھیڑ بھڑکا تھا۔ زنان خانے میں زندگی کی ایک زود وزی ہوئی تھی۔ چہل پہل تھی، شور شرابہ تھا۔ مہمان، نوکرانیاں، بچے کچے اور گاؤں کی عورتوں کا غول کا غول۔ کیسی گہما گہمی تھی۔ ان کا بولنا، چہکنا، شور مچانا، اس سارے شور میں خوشی کی کیسی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ ہر عورت ہر لڑکی کو آج بھاری جوڑے اور گہنے پاتے پہننے کا موقع میسر آیا تھا۔ پورے گھر میں کس طرح ہیرے موتی کی چمک سے جھلا جھل کرتے رنگ امنڈ رہے تھے۔ اُدھر مراثنیں بیاہ کے گیت گا رہی تھیں، ڈھول بجا رہی تھیں۔

بیبیاں ماجدہ پھپھی کو مبارک بادیاں دے رہی تھیں۔ ”بیاہ کی خوشی مبارک ہو۔ سر سے بوجھ اتر گیا۔ بہت بھاری ذمہ داری تھی۔ تم اپنے فرض سے بری ہو گئیں۔ اب اللہ رسول کی یاد میں کوئی کھنڈت نہیں پڑے گی۔ اب اس کے سوا اور کون سا کام رہ گیا۔ اب تو خیر سے تم حج پہ بھی جا سکتی ہو۔“

اس گھر میں خاموش گوشہ اب صرف زہرا کا کمرہ تھا جہاں وہ مائیوں بیٹھی تھی۔ زینب نے اور میں نے، دس اور رشتے کی بہنوں نے ایک ہی طرح کے جوڑے پہنے ہوئے تھے۔ یہ جوڑے ہمیں ماجدہ پھپھی نے بنا کر دیئے تھے۔ دوسری سب لڑکیاں کس رشک سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ دلہن کو دیکھنے اور اس کے پاس گھس کر بیٹھنے کے لیے مری پڑ رہی تھیں۔ آخر انہیں بھی تو ایک دن دلہن بننا تھا۔

بڑی عمروں والیوں کو زہرا کے جہیز کے بارے میں زیادہ تجسس تھا۔ جہیز ایک الگ کمرے میں سجایا گیا تھا۔ وہاں حکیمن بوا پہریدار بنی بیٹھی تھیں۔ نیا جوڑا اور سونے کا گہنا پہن کر کیسی چمک دمک رہی تھیں۔ یہ جوڑا اور یہ گہنا ان کے لیے ماجدہ پھپھی نے بنوایا تھا۔ بیبیوں نے گنتی شروع کر دی کہ کتنے جوڑے دیئے گئے ہیں، کتنے زیور کے سیٹ ہیں، کتنے برتن ہیں، کتنا گھر کا دوسرا سامان ہے۔ پھر انہوں نے حساب لگایا کہ شب عروسی کے لیے جو چاندی کی مسہری دی گئی ہے اس پر کتنا خرچ آیا ہوگا۔ انہیں یہ ساری معلومات بعد میں ان بیبیوں کو فراہم کرنی تھیں جو اس شادی میں آ نہیں سکی تھیں۔ اور اسی سے تو خاندان کی حیثیت کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔

اس کے بعد انہوں نے بری کا جائزہ لینا شروع کر دیا، جوڑوں بیڑوں کا، گہنے پاتے کا، عطر پھلیل کا، شکر اور میوے کی گٹھریوں کا اور مٹھائی سے بھری سینیوں کا۔ اس واسطے سے وہ دولہا کے گھر والوں کی حیثیت کا اندازہ لگا رہی تھیں۔

بیاہ کی رسم کے بعد دولہا کو زنان خانے میں لایا گیا۔ اب تک تو ہم دروازوں کی درازوں اور بانس کی تیلیوں کے پردوں کی جھریوں میں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے جھلک سی نظر آئی تھی کہ دولہا سنہری بروکیڈ کی اچکن پہنے دوستوں میں گھرا ہوا سنہری چھتر کے نیچے بیٹھا ہے۔

دولہا نے جب زنانے میں قدم رکھا تو زینب، جو ہم رشتے ناتے کی بہنوں میں سب سے بڑی تھی، رستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ تقاضا تھا کہ پہلے نوشہ کی بہن نیگ ادا کرے، پھر ہم اندر آنے دیں گے۔ ایک سو ایک روپے پہ معاملہ طے ہوا۔ یہ رقم وصول کرنے کے بعد ہم نے نوشہ کو اندر آنے دیا۔ دولہا کو دیکھنے کے شوق میں سب ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ ہر بی بی دوسری کو دھکیل کر خود آگے آنا چاہتی تھی۔ دولہا تو بالکل اپنی تصویر کی طرح تھا۔ گھنگھریالے بال، بھرے بھرے ہونٹ، گہری گہری آنکھیں، گٹھا ہوا بدن، رنگت زہرا سے ایک ذرا زیادہ سانولی تھی۔ مسکراتا ہوا اچھا لگتا تھا۔

میں نے اسے دیکھا تو سوچنے لگی کہ اب یہ شخص کوئی اجنبی تو رہا نہیں۔ اب تو موصوف زہرا کے دولہا نصیر بھائی ہیں۔ زہرا کے لیے اسے دیکھنے کی نوبت بہت بعد میں آئی۔

صبح جب زینب، زہرا کے ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگا رہی تھی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے ہیں۔ رسمیں جب ادا ہو رہی تھیں تو اس وقت بھی وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ لیکن جب دولہا کی طرف سے آیا ہوا عروسی جوڑا اور زیور اسے پہنایا جا رہا تھا تو وہ چپ ہو گئی تھی۔

تیل اور عطر ملا گیا۔ لال جوڑا پہنایا گیا اور اس کے ساتھ زیور۔ مانگ میں صندل بھری ہوئی، ہاتھ پیر مہندی سے رچے ہوئے، چہرے پر سہرا پڑا ہوا، اس شان سے زہرا کمرے میں لائی گئی جہاں بیبیاں دلہن کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھیں۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جو عطر میں بسی ہوئی چمکتی دمکتی گٹھری ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کوئی زہرا تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو دوسروں کی امنگوں کی ایک علامت ہے۔

آخر وہ وقت آیا جب دولہا کو اندر بلایا گیا۔ اسے زہرا کے قریب لا کر دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل بٹھا دیا گیا۔ ایک ریشمیں دوپٹہ دونوں کے سروں پر ڈال دیا گیا اور بیچ میں قرآن، اس کے ساتھ آئینہ اور جلتی موم بتی رکھ دی گئی۔ اس گھڑی زہرا نے پہلی مرتبہ آئینے میں شوہر کی آنکھوں کو دیکھا۔

زینب نے جوش میں آ کر اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ میں اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ میرا ذہن کسی اور ہی طرف نکل گیا۔ یہ شاید وہی لمحہ تھا جب ممکن ہے زہرا کو کوئی دوسری پرچھائیں نظر آئی ہو۔ کیا آئینے میں اس کا کوئی عکس اسے دکھائی نہیں دیا تھا۔ ان دکھ بھری آنکھوں کا عکس۔ کیا محبت اتنی بے اثر ہوتی ہے۔ کیا اس کا وجود بس درد ہجر بیان کرنے والی نظروں تک ہی محدود ہوتا ہے۔ مگر

دوسروں نے جس صورتحال کو قبول کرلیا ہے اس کے بارے میں سوال کیوں اٹھایا جائے۔ آخر میں دوسروں سے مختلف کیوں ہوں۔

وہ ایک خاموشی کا پل تھا اور اس کے گرد بیبیوں کی بیتابی سے لبریز آوازیں، مبارک بادیاں، دعائیں۔ ساتھ میں ہنسی، دل لگی اور مراسنوں کے گیت گانے کی آوازیں، خوشی کے گیت۔

دوسرا حصّہ

پہلا باب

وہ سب ہی لوگ جو کل تک یہاں کی زندگی کا حصہ تھے اب دور چلے گئے تھے، اور دور ہوتے ہی چلے گئے۔ عابدہ پھپھی اور زہرا تو بیاہے جانے کے بعد اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ ماجدہ پھپھی حسن پور میں رہ پڑیں۔ انہی کے ساتھ استانی جی اور نجمن بی بی نے بھی وہیں ڈیرا ڈال دیا۔۔۔۔۔۔ وسیع و عریض گھر میں چاروں طرف کمرے ہی کمرے نظر آتے تھے۔ یہ کمرے اب خالی ڈھنڈار پڑے تھے۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے، دروازوں میں قفل لگے ہوئے۔ ماجدہ پھپھی، استانی جی اور نجمن بی بی کے ساتھ اس گھر کے ایک گوشے میں سما گئیں۔ افسردہ تو پہلے ہی رہتی تھیں، اب افسردگی کی گہرائیوں میں وہ ڈوبتی چلی گئیں۔

اسد دلی میں تنگی ترشی کے ساتھ بسر کر رہا تھا۔ پڑھ بھی رہا تھا اور پڑھا بھی رہا تھا۔ ادھر زاہد ویسے تو گھر سے قریب ہی تھا مگر گھر کبھی کبھار ہی آتا تھا۔ محسن چچا کو حامد چچا پسند نہیں کرتے تھے۔ محسن چچا نے اس کا جواب یوں دیا کہ اس گھر میں آنا بند کر دیا۔

بابا جان کا خدمت گار بوڑھا کرم علی تو بابا جان کے انتقال کے برس بعد ہی دنیا سے سدھار گیا تھا۔ حکیمن بوا، عابدہ پھپھی کے ساتھ چلی گئیں اور رمضانو، زہرا کے ساتھ ہولی۔ نندی ایک موچی کے ساتھ بھاگ گئی۔ یہ موچی قریب ہی کے ایک قصبے سے ادھر کا پھیرا لگایا کرتا تھا۔ پرانے زمانے کی یادگار بس لے دے کے ایک سلیمن رہ گئی تھی۔ ہمارے بڑوں نے طے کیا کہ وہ ذاتی خادمہ کے طور پر میرے ساتھ رہا کرے گی۔

ادھر زینب کے بھیا کا انتقال ہو گیا۔ زینب کی شادی ہو گئی۔ اس کے بعد حسن پور میں کوئی ایسا نہ رہا کہ میں اس نگر کو یاد کرتی۔ وہاں میرا جانا اب کبھی کبھار ہی ہوتا تھا اور بہت کم وقت کے لیے، اس لیے کہ حامد چچا اور ان کی بیگم وہاں اتنا ہی وقت گزارتے تھے جتنا جائیداد کے انتظام کے سلسلے میں ضروری ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حسن پور اور جائیداد کی طرف سے وہ غافل ہو گئے تھے۔ حسن پور کے تعلقدار کی حیثیت سے ہمارے چچا جان نے پرانی خاندانی مہر کے نمونے پر ایک نشان بنوایا تھا۔ ان کے پیڈ پر نشان ثبت کیا گیا تھا اور وہی نشان ان کے باوردی خدمت گاروں کی پگڑیوں پر بیج کا کام دیتا تھا۔

میں حسن پور سے چلی آئی اور اپنے چچا چچی کے ساتھ اس گھر میں آ کر رہنے لگی جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ حسن پور سے واپس آئی تو اس جگہ کو بہت بدلا ہوا پایا۔ مجھے بے طرح پرانے دن یاد آئے اور میں اداس ہو گئی۔

واپسی کے بعد جو پہلی رات آئی اس میں یہ ہوا کہ سلیمن نے اپنی بانوں والی کھٹیا لا کر میری پائنتی کے برابر بچھالی۔

''بٹیا، میں نے سوچا کہ تم اکیلی ڈرو گی۔'' اس نے تو اپنی طرف سے یہی وضاحت پیش کی تھی لیکن میں نے بھانپ لیا کہ اصل میں وہ خود ڈری ہوئی ہے اور تنہائی اسے ستا رہی ہے۔

اس رات گرمی بہت تھی۔ ہوا بند تھی۔ لگتا تھا کہ بارش ہوگی۔ سلیمن میرا پلنگ اور اپنی کھٹیا آنگن سے اٹھا کر برآمدے میں لے آئی۔ بجلی کا پنکھا مچھر دانی کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ اس سے عجب سی غنود آمیز آواز پیدا ہو رہی تھی۔ سلیمن اپنی کھٹیا پہ ایسے لیٹی تھی جیسے کوئی پوٹلی پڑی ہو۔ میں چاہ رہی تھی کہ کسی طرح مجھے نیند آ جائے۔

گول مٹول چاند چاندی ایسے کنارے والے کالے کالے ڈراؤنی شکلوں والے بادلوں کے بیچ دیوانہ وار بھاگتا نظر آ رہا تھا، جیسے کسی کا پیچھا کر رہا ہو۔ بھاگتے بھاگتے بادلوں سے نکل کر آسمان کے کسی صاف ستھرے ٹکڑے میں آ کر ٹھٹھک جاتا۔ بادلوں سے باہر آنے کے بعد جو اچانک اس کی روشنی پھیلتی تو برآمدہ، آنگن اور لان سب میں چاندنی پھیلی نظر آتی۔ اس پھیلی چاندنی میں برآمدہ، آنگن اور لان کتنے خالی خالی نظر آتے۔ ہمارے ایک پلنگ اور ایک کھٹیا کے سوا نہ کوئی پلنگ نہ کوئی کھٹیا، نہ پوٹلی کی طرح پڑی ہوئی بڑھیا، نہ گھڑونچی پر رکھے ہوئے وہ گھڑے جن کی گردنوں میں بیلے چنبیلی کے ہار پڑے نظر آیا کرتے تھے۔ نہ وہ لکڑی کے بنے تخت کہ جب عابدہ پھپھی اور ماجدہ پھپھی اٹھ جاتیں اور مہمان بیبیاں رخصت ہو جاتیں اور عزیز رشتہ دار خادمائیں سونے کے لیے چلی جاتیں تو ان پر سے چاندنی، دریاں اور گدے لپیٹ دیئے جاتے۔

آسمان تاریک نظر آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن وہ جو بوندیں پڑنے کے ساتھ پورے گھر میں اچانک کھلبلی پڑ جاتی تھی ویسی کوئی بات اس وقت دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ نہ چیخ و پکار، نہ بھاگ دوڑ، نہ مچھر دانیوں کے ڈنڈوں کی کھٹر پٹر، نہ آنگن اور لان کے برآمدوں میں اور برآمدوں سے کمروں میں پلنگ گھسیٹنے کی آوازیں۔ صرف درختوں کے بیچ آندھی کے جھکڑوں کی سائیں سائیں تھی اور تیز بارش کا شور۔

سلیمن نے بیکل ہو کر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ پھر بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے ایسا لگا جیسے آسمان تڑخ رہا ہے۔ سلیمن نے آہستہ سے پکارا ''بٹیا، بٹیا!''

لیکن میں نے منہ تکیے میں دے لیا۔ سلیمن کی پکار کا کوئی جواب نہیں دیا۔

دوسرا باب

ہمارے ''آشیانہ'' کے گیٹ پر سنگِ مرمر کی ایک نئی تختی لگ گئی تھی جو گھر کے نئے مالک کے نام کا اعلان کر رہی تھی۔ لیکن جس طرح اس گھر کا رنگ بدلا تھا اس کے مقابلے میں یہ اعلان کچھ دبا دبا تھا۔

''آشیانہ'' پر نیا رنگ روغن کرایا گیا تھا۔ یہ رنگ روغن پتھر والے رنگ کا تھا۔ باغیچوں کی دیکھ بھال خود چچی جان کرتی تھیں۔ اپنی نندوں کی طرح وہ زنان خانے میں تو قید ہو کر نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔

نئی آرائش و زیبائش نے کمروں کی ہیئت بدل ڈالی تھی۔ اب یار و احباب کے بجائے یہاں واقف کار آتے نظر آتے تھے۔ ڈرائنگ روم میں جو ایک آسیبی فضا تھی اس کے غائب ہو جانے کا مجھے خاص طور پر احساس تھا۔ اس ڈرائنگ کی اپنی ایک شخصیت تھی۔ ایک عجیب مضحکہ خیز بھدا بھدا نقشہ تھا۔ بابا جان کے جو خبط تھے بس ان کا عکس یہاں بھی نظر آتا تھا۔

بابا جان اور ان کے دوست احباب راجہ امیر پور اور ٹھاکر بلبیر سنگھ خوب شے تھے۔ کسی زمانے میں ان پر شیر چیتے کے شکار کا بھوت سوار ہوا تھا۔ اب کچھ اسی انداز میں نیلامی میں جا جا کر چیزیں خریدنے کا خبط ہو گیا تھا۔ جو خرید کر لاتے تھے سمجھتے تھے کہ ٹرافی جیت کر لائے ہیں یا شکار مار کر لائے ہیں۔ اسی احساسِ فتح مندی کے ساتھ اس کی نمائش کرتے تھے۔ لیکن خیر شکار کے معاملے میں تو ان کے یہاں بہت تمیز تھی۔ شیر، تیندوے، بارہ سنگھے، ان کے درمیان وہ خوب فرق کر سکتے تھے۔ لیکن نیلامی میں سے جو نوادرات خرید کر لاتے تھے، مثلاً چینی اور بلور کے یا ہاتھی دانت کے یا سنگِ مرمر کے یا کسی بھی دھات کے ظروف یا قلمی اور چھپی ہوئی تصویریں، یہ سب اشیا اسی میں گڈمڈ نظر آتی تھیں۔ انہیں آراستہ کرتے وقت ذرا جو ان کی جمالیاتی معنویت کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

لیکن اب وہ کمرہ ننگا نظر آ رہا تھا۔ وہاں آگے جو اشیا رکھی تھیں انہیں اسی طرح ٹھکانے لگایا گیا تھا کہ بعض اشیا کو ردی مال کے ساتھ سمیٹ دیا گیا، بعض کو بخاری میں ڈال دیا گیا اور بعض کو حسن پور بھجوا دیا گیا۔ ہماری چھپھی جان بخاری کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ بات یہ ہے کہ کسی چیز کے بیکار سمجھ کر پھینکنے کا تو ان کے یہاں تصور ہی نہیں تھا۔ ''ارے بی بی کیا پتہ ہے کہ کس چیز کی کب ضرورت پڑ جائے۔'' اور یہ کہہ کر وہ ہر ایسی چیز، جو پھینکنے لائق ہوتی تھی، بخاری میں ڈال دیتی تھیں۔ اس اندھیری کوٹھری میں کنڈم مال اثاث بھرا

پڑا تھا۔ مگر جب کسی چیز کی واقعی ضرورت پیش آتی تھی تو بخاری میں جا کر کتنا ہی ڈھونڈو نہیں ملتی تھی۔

اس کمرے کا فرنیچر بھی بدل گیا تھا۔ سنگِ مرمر اور پینٹنگ والی میزیں، ان کے گرداگرد قرینے سے سجی ہوئی وہ پرانی طرز کی سیدھی پشت والی کرسیاں، جن کی گدے والی نشستوں پر تمامی کے غلاف چڑھے ہوئے تھے، ان سب کو یہاں سے اٹھا کر حسن پور بھیج دیا گیا تھا۔ یہ سارے کمرے اپنی نئی آب و تاب کے ساتھ مجھے ان انگریز گھروں کی یاد دلاتے تھے جہاں میں مسز مارٹن کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ بالکل ویسے ہی، البتہ اصل اور نقل کا فرق موجود تھا۔

پرانے ملازموں میں سے بس چند ایک ہی رہ گئے تھے۔ پرانے باورچی کی جگہ اب ایک خانساماں آ گیا تھا جسے انگریز مالکوں کے دیئے ہوئے سرٹیفکیٹوں پر ایسا ہی ناز تھا جیسا بہادری کے تمغے پانے والوں کو اپنے تمغوں پر ناز ہوتا ہے۔ کرم علی تو جیسے قصہ کہانیوں کا ایک خزانہ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اس کا چہیتا چمٹن جس کی رمضانو سے بہت چھیڑ چھاڑ تھی، اور ہاں سلیمن، اب ان لوگوں کی جگہ لال سنگھ اور غلام علی دندناتے دکھائی دیتے تھے۔ لال سنگھ ہمارے چچا جان کا بہت تربیت یافتہ خدمت گار تھا۔ غلام علی کا ڈائننگ روم اور پینٹری پر راج تھا۔

غلام علی اپنی وردی میں ملبوس، ہاتھوں میں سفید دستانے چڑھا کر، اتنی آب و تاب سے نمودار ہوتا کہ ہر کھانے پر ایک بینکوئٹ کی شان پیدا ہو جاتی تھی۔ شروع شروع میں تو کانٹے چھریوں نے مجھے بہت گڑ بڑایا۔ کھانا کیا ہوتا تھا ایک پوری رسم ادا ہوتی تھی جس میں ان چمکیلے اوزاروں کا بہت عمل دخل تھا۔ کمال ہے کہ مسز مارٹن ویسے تو بہت قاعدے قرینے کی قائل تھیں مگر انہوں نے مجھے کانٹے چھری کا استعمال نہیں سکھایا تھا۔ تو شروع شروع میں بہت گڑبڑاتی اور اُن دنوں کو یاد کرتی جب نوکرانیاں بڑے غیر رسمی انداز میں ہمارے لیے دستر خوان لگایا کرتی تھیں۔ خیر رفتہ رفتہ میں اس نئے طریقے سے مانوس ہو گئی۔

نوکرانیوں کے احاطے کی بھی اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ پہلے تو وہ اپنی جگہ پر ایک دنیا تھی۔ کیا گہما گہمی رہتی تھی۔ جمن بی بی اور استانی جی تو ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر اب گوشہ گیر تھیں۔ راج اب حکیمن بوا کا تھا۔ رمضانو اور سلیمن کو تو وہ اپنی زر خرید لونڈیاں سمجھتی تھیں۔ باقی جو دوسرے نوکروں چاکروں کی گھر والیاں تھیں وہ گویا ان کی دربار نشین تھیں۔

اب صرف سلیمن کو کبھی ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں اس احاطے میں جا نکلتی تھی۔ سلیمن نئی خادماؤں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی "نظامن بوا کی تو گز بھر کی زبان ہے۔ جب وہ ٹرٹراوے ہے تو مجھے تو بالکل ایسا لگت ہے کہ میں نیبوگی نیم کی مسواک دانتوں میں کر رہی ہوں۔ انصاف کی بات ہے حکیمن بوا کا دل بہت بڑا تھا۔ اس نگوڑی کا دل تو جیسے آم کی چوسی ہوئی گٹھلی ہو۔ اور بیگم صاحب کی آیا؟ الٰہی توبہ! میں تو جانوں کہ جن میم صابوں کی وہ چاکری کرتی رہی ہے انہی میں سے کسی کا خون چوس لیا ہے۔ کیسی اتراتی پھرے ہے۔

جانو سفید چمڑی والی فرنگن ہے کہ کوئلے کی کان کی سیر کر کے آ رہی ہے۔"

"کیا ان کا تم سے سلوک اچھا نہیں ہے؟"

"بٹیا، میں انہیں ایسا ویسا موقع دیتی ہی نہیں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ جا کے کانٹوں میں الجھوں اور اپنے سر بلا لوں۔ پھر بھی کبھار تو ان کلموئیوں کی صورت دیکھنی پڑے ہی ہے۔ کم بختیں سانپوں کی طرح سے پھنکاریں ہیں۔ بس دیکھا کرو کہ کون پہلے کس کو ڈسے ہے۔"

نظامن ویسے تو ہڈیوں کی مالا تھی مگر اس کے نقش و نگار بڑے کٹیلے تھے۔ چونکہ وہ اس عورت کی بہن تھی جو سائرہ چچی کی آیا رہ چکی تھی اس لیے کچھ ایسے حق اسے حاصل ہو گئے تھے جو رشتہ داروں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ سمجھتی تھی کہ سب نوکروں چاکروں کو اس کی عزت کرنی چاہیے۔

آیا دکھن سے آئی تھی۔ کالی کلوٹی، ٹھگنا قد۔ نظامن سے تو تکار میں مار کھا جاتی تھی اس لیے کہ نہ تو وہ اردو میں رواں تھی نہ ہندی بول پاتی تھی۔ خیر وہ اس کی کمی ایک تو چیخ چیخ کر پوری کر دیتی تھی، اور پھر کس کس طرح کے منہ بناتی تھی۔ ممانی کی چاکری میں پچھلے پانچ سال سے چلی آ رہی تھی۔ کام میں ایسی منجھ گئی تھی کہ بالکل کسی لیڈی صاحب کی میڈ نظر آتی تھی۔ اسی لیے تو نظامن کا جلاپا اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔

جب نظامن اور آیا میں ٹھنتی تھی تو نظامن توقع کرتی تھی کہ سلیمن اس کا ساتھ دے گی۔ کہتی تھی "اری تجھ میں مجھ میں فرق کیا ہے۔ ایک ہی ہیں۔ تو کوئی باہر سے تھوڑا ہی آئی ہے۔ تو میری دھی کی طرح ہے۔" لیکن سلیمن غیر جانبدار ہی رہتی۔ وہ دونوں ہی کو جوتی پہ رکھتی تھی۔

اونچی دیواروں کی پرلی طرف سے پھیری والوں کی بولیاں سنائی دیتی رہتی تھیں، لیکن سامنے کے بڑے گیٹ سے کسی بیچنے والے کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بلکہ وہ جو کمال شاہ ہمارے واہموں سے فائدہ اٹھا کر خیرات وصول کر کے لے جاتا تھا اب تو اس کا آنا بھی بند تھا۔ اور وہ جو رشتہ دار اور رشتہ داروں کے رشتہ دار تھے کہ جب منہ اٹھایا چلے آئے اور جب تک جی چاہا ڈیرہ ڈالے پڑے رہے اب ان کا آنا جانا بھی موقوف تھا۔ بلکہ اب تو ماجدہ پھپھی اور عابدہ پھپھی بھی بہت کوئی خاص وجہ ہو تب ہی آتی تھیں اور زیادہ نہیں ٹھہرتی تھیں۔

عابدہ پھپھی کی آمد کا مجھ پر عجیب و غریب اثر ہوتا تھا۔ لگتا تھا کہ اندھیرے اجالے کا ایک جنگل ہے اور میں اس میں بھٹک رہی ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اور میرے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ان کی آمد پر مجھے یہ فاصلہ عبور کرنا ہوتا تھا۔ اصل میں میرے یہاں یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ پھپھی جان نے جو نئی زندگی شروع کی ہے اس کی وجہ سے ان کے اپنے بہت سے مسائل ہیں۔ اوپر سے میں اپنے مسائل ان پر لاد رہی ہوں۔

حامد چچا اور سائرہ چچی سے میرا تعلق سیدھا سادھا تھا۔ یہ تعلق ظاہری رکھ رکھاؤ تک ہی محدود تھا۔

مطلب یہ کہ کوئی گہرا تعلق نہیں تھا۔ وہ میرے سرپرست تھے۔ میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایسی کوئی بات نہ کروں جو انہیں بری لگے۔

ان کے اپنے مشاغل تھے۔ میرے لیے ان کے پاس بھلا کہاں وقت تھا۔ ہمارے چچا جان کتنے سارے سکولوں کی انتظامی کمیٹیوں میں شامل تھے۔ یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل کے بھی ممبر تھے۔ جن کارخانوں اور کمپنیوں میں تعلقہ داروں کی ایسوسی ایشن حصہ دار تھی، ان کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں وہ تعلقہ داروں کی نمائندگی کرتے تھے۔

ہاں یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ باباجان کی جو جانی مانی وراثت ہے اسے بچانے کے لیے جدوجہد ہو رہی ہے۔ حامد چچا تو بس ایک ہی ذکر کرتے نظر آتے تھے۔ اقتدار کی روز افزوں جدوجہد میں کون سی پارٹیاں اور شخصیتیں شامل ہیں، کہاں ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں، کیا سیاسی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ مخالف کون ہے، روڑے کون اٹکا رہا ہے۔ بس چچا جان انہی قصوں قضیوں کو نبھاتے رہتے تھے۔

چچا جان نے زندگی کا جو طور اپنایا تھا اس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ چچی سماجی بہبود کے کاموں میں حصہ لیں، اور مختلف نسوانی جماعتوں کے معاملات میں شامل رہیں۔

خدمت خلق کے سلسلے میں اپنی قابل قدر سرگرمیوں کے باوجود ہمارے چچا اور چچی کی سوشل مصروفیات بھی بہت تھیں۔ جاڑوں کے موسم میں گھر میں بھی بہت پارٹیاں ہوتی تھیں اور باہر بھی۔ استقبالیے، ریسیں، پریڈیں، ٹورنامنٹ، ان ساری سرگرمیوں کا نقطۂ عروج اُس وقت آتا تھا جب گورنمنٹ ہاؤس میں گارڈن پارٹی ہوتی تھی اور پھر بال کی تقریب۔ گرمیوں میں یہی سب کچھ ان پہاڑی مقامات پر ہوتا تھا جہاں حکومت پورے موسم کے لیے منتقل ہو جایا کرتی تھی۔

میری ابھی یہ عمر نہیں تھی کہ ان سرگرمیوں میں حصہ لیتی۔ ہماری ملاقات کھانے پر ہوتی تھی یا ان اتفاقیہ موقعوں پر جب چچا چچی گھر ہی پر خاموشی سے شام گزارتے تھے۔ ان کی باتیں بہت اوپری ہوتی تھیں۔ اُن چلتاؤ معاملات پر جنہیں ذہن میں محفوظ رکھنا ضروری نہیں ہوتا تھا۔ ادھر بات کی اُدھر بھول گئے۔ میری تربیت کے سلسلے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ میں بظاہر بہت تابعدار اور سعادت مند قسم کی لڑکی تھی۔

تیسرا باب

مجھے لگتا تھا کہ میں دو دنیاؤں میں بٹی ہوئی ہوں۔ ایک تو خارجی دنیا ہے جس میں میری حیثیت تماشائی کی ہے۔ ایک میری اپنی اندر کی دنیا ہے۔ یہاں میں تنہائی کی اسیر ہوں۔ اس تنہائی سے نجات مجھے ان اوقات میں میسر آتی ہے جب میں اپنی کالج کی سہیلیوں کی صحبت میں ہوتی ہوں۔ زندگی کی یہ تصویر جو دھندلی دھندلی اور پریشان کن تھی اور دو غلے پن کا شکار تھی رفتہ رفتہ دو غلے پن سے نکلی، جیسے دو دنیائیں مکمل مل کر ایک ہوتی جا رہی ہوں۔

میری کالج کی ساتھیوں میں سب سے زوردار لڑکی نیما چڑجی تھی۔ ٹھگنا قد، موٹی بھجس، ہمیشہ عجلت میں نظر آتی جیسے وقت بھاگا جا رہا ہو اور وہ اسے پکڑنے کے لیے گرتی پڑتی دوڑی چلی جا رہی ہو۔ بڑی بڑی آنکھیں کچھ ایسی جیسے کسی دباؤ میں آ کر ابلی پڑ رہی ہوں۔ کھلے کھلے مضبوط دانت، ان پر بھنچا ہوا دہانہ۔ بال اس کے بہت گھنے تھے۔ چہرے سے الگ پیچھے لے جا کر لاپروائی سے اس طرح لپیٹے جاتے کہ ایک چوڑی ٹکیا بن جاتی۔ بالوں کی یہ شکل بہت خوبصورت لگتی تھی لیکن وہ جان کر اس سے تغافل برتتی۔ نسوانی ناز نخروں سے اسے سخت بیر تھا۔ کہتی تھی "جب میں جیل جاؤں گی تو اس کمبخت گچھے کو قینچی سے کاٹ ڈالوں گی۔"

"تو کیا تم جیل جانے کا منصوبہ باندھ رہی ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ میں جذباتیت زدہ احمقوں میں سے نہیں ہوں۔ لیکن قصہ یہ ہے کہ میں نے جو طے کیا ہوا ہے اس کے مطابق جب میں کام کروں گی تو انگریز مجھے زود یا بدیر پکڑ کر ضرور جیل میں ڈالیں گے۔ میری کوشش ہوگی کہ یہ واقعہ ہو تو زود نہیں بدیر ہو۔ میں اپنے گدھے لڑن کی طرح کی نہیں ہوں جس نے ایک ظالم انگریز افسر کو گولی مارنے کی کوشش کی اور موصوف پھانسی چڑھنے سے بال بال بچے۔ یہ جو دہشت پسند ہوتے ہیں، بیچارے یوں سمجھو کہ سیاست میں طفل مکتب ہوتے ہیں۔ ہوتے تو ہیں بہادر مگر گمراہ ہوتے ہیں۔ انگریز سامراج سے لڑنے کے لیے ہمیں منظم ہونا چاہیے اور ہم میں ڈسپلن ہونا چاہیے اور ہتھیار وہ استعمال کریں جن کا نشانہ خطا نہ جائے۔"

جب میں اسے کہتی کہ تم بہت برخود غلط ہو تو وہ کہتی کہ "تمہارے ساتھ دقت یہ ہے کہ تم کولہو کے بیل کی طرح دائرے میں گھومتی رہتی ہو۔ تمہارے یہاں سمت کا کوئی احساس نہیں ہے۔ تم ذو لٹے لگتی ہو اور پیچھے کی

طرف جھکتی ہو۔ تمہیں گمان یہ ہوتا ہے کہ تم میں ٹھیک ہے اور تم انصاف پسندی سے کام لے رہی ہو مگر اصل بات یہ ہے کہ تم بے یقینی کا شکار ہو۔"

میں اور نیناً دونوں انگلش کی ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ ہماری آپس میں دوستی ہوگئی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم مستقل لڑتے رہتے تھے۔

ملاقات کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ مجھ سے پوچھنے لگی" کالج چھوڑنے کے بعد تم کیا کرو گی؟"

"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔"

"تم نے اپنے طبقے کے کردار کے عین مطابق بات کی ہے۔ تم لوگوں کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ ڈگری بھی کوئی زیور ہے۔ جہیز میں جہاں اور زیور چڑھتے ہیں ان میں ایک زیور یہ بھی سہی۔"

"بکواس، میں سمجھتی ہوں کہ تعلیم پا کر میں بہتر انسان بنوں گی۔"

"میں اس طرح کے ہوائی آدرشوں کو نہیں مانتی۔ تعلیم سے مجھے اپنے لیے روٹی کمانے میں مدد ملنی چاہیے اس لیے مجھے کوئی ٹھوس پروگرام بنانا ہے۔ رہے تم لوگ تو سب ایک سے ہو۔ زندگی کے مقابلے میں پیسے کو اپنے گرد اس طرح لپیٹتے ہو جیسے یہ کوئی سوتی اونی کپڑا ہو۔ اور ہاں نادرہ نے مذہب کی افیون میں پناہ لے رکھی ہے۔ تم نے لونس ایٹروں والی انسانیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ پھر بھی تم مجھے پسند ہو اس لیے کہ تم اصلاً ایماندار ہو، یہ الگ بات ہے کہ تمہارا جو پس منظر ہے اس میں ہر چیز ہر بات سے منافقت کی بو آتی ہے۔"

"پتہ نہیں مجھے تم کیوں اچھی لگتی ہو۔ باتیں تو ہمیشہ ایسی ہی کرتی ہو جیسی کر رہی ہو۔"

"اس لیے کہ میرے قول و فعل میں تضاد نہیں ہے۔ جو بات تمہارا ضمیر تمہارے کان میں کہتا ہے وہی بات میں اونچی آواز سے کہہ دیتی ہوں اور اس طرح اس کا ڈنک نکال لیتی ہوں۔ پھر تم اپنی صفائی میں اس طرح لگتی ہو کہ اور کسی کام کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتیں۔ تمہارے بزرگ غالبؔ اسی کام کے لیے درباروں میں مسخرے رکھتے تھے۔"

نادرہ جب نیناً سے بحث کرتی تھی تو بڑے یقین کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد کا دفاع کرتی تھی۔ اتنے یقین کے ساتھ تو میں بھی اپنے طبقے کا دفاع نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی شک میں گرفتار نہیں تھی۔ اس کے تصور میں تو عالمِ اسلام کی گزشتہ عظمت جگمگا رہی تھی۔ مگر میرے یہاں موجودہ زوال کے احساس نے اس تصور کو دھندلا دیا تھا۔

نادرہ میری چچی کی سہیلی بیگم وحید کی بیٹی تھی۔ ماں کی طرح اس کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ مسلمانوں پر اپنے ورثے کی حفاظت واجب ہے۔ نادرہ کا خاندان اس شہر میں نسبتاً نو وارد تھا۔ یہ لوگ ابھی کوئی بیس سال پہلے پنجاب سے یہاں وارد ہوئے تھے۔ نادرہ کا باپ ڈاکٹر تھا۔ ویسے تو لائق مانا جاتا تھا مگر لوگ کہتے تھے کہ لالچی بہت ہے۔ اس حد تک لالچی تھا کہ علاج شروع کرانے سے پہلے آدمی سوچتا تھا کہ بیماری سے مرنا بہتر

رہے گا یا قلاش ہو کر زندہ رہنا۔

جب ڈاکٹری چل پڑی تو شہر کے غریب علاقے میں جو ان لوگوں کا چھوٹا سا مکان تھا اسے چھوڑ کر مال پر ایک بڑا سا مکان لے کر رہنے لگے۔ بیگم وحید نے پردہ توڑ دیا اور اپنے آپ کو بیگم کہلوانے لگیں۔ نادرہ کو کانونٹ میں داخل کرا دیا۔

اس کے سیاسی عقائد کی وجہ سے میری اور نادرہ کی اکثر لڑائی رہتی تھی۔ اس کے سیاسی عقائد کا اس کے مذہبی جوش وخروش سے بھی تو رشتہ ملا ہوا تھا۔ خیر ہماری دوسری دلچسپیاں مشترک تھیں۔ مثلاً کتابیں، موسیقی اور شاعری۔ ہماری بہت آرزو تھی کہ مغربی موسیقی کو سمجھا جائے۔ یہی آرزو جون ڈیوس سے ہماری دوستی کا سبب بنی۔

جون ڈیوس ہمارے کالج کے آرکسٹرا میں قائدانہ رول انجام دیتی تھی۔ اس کی ماں بیوہ تھی۔ میڈیکل کالج میں میٹرن تھی۔ جون کو ایک سکالرشپ بھی ملا تھا۔ ساتھ میں فرض شناس اور دل کی بچی تھی۔ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ اس کا چھوٹا سا گھر تھا جس میں کوئی فوں فاں نہیں تھی۔ جب کبھی میں اس کے گھر جاتی اور اسے اس کی ماں کے ساتھ دیکھتی تو مجھے بہت محرومی کا احساس ہوتا تھا۔ ان میں آپس میں جو محبت تھی، جو افہام وتفہیم تھی وہ کسی ضرورت کی پیداوار نہیں تھی۔ اس میں ایک سچائی تھی۔ ویسے تو ماں اور زمانے کی عورت تھی۔ جون ایسے زمانے میں سانس لے رہی تھی جب نئے خیالات کا دور دورہ تھا، مگر یہاں ماں بیٹی کی دنیا کسی تفریق کا شکار نہیں ہوئی تھی۔

جب جون ہمارے گروپ میں شامل ہوئی تو وہ اکیلی ہی اپنے عقائد کے لیے لڑتی تھی۔ وہ سلطنتِ برطانیہ کی عظمت اور صداقت کی بڑی شدت سے قائل تھی۔ جب نینا جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی نیت ظاہر کرتی تو جون بڑے خلوص سے کہتی "میں تو انگریزوں کی بہت قائل ہوں، اس وجہ سے نہیں کہ میں اینگلو انڈین ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ انہوں نے یہاں امن اور انصاف کا بول بالا کیا ہے اور اتحاد اور یگانگت پیدا کی ہے۔"

"ہاں ہاں انہوں نے تو بڑے کام کیے ہیں۔ سڑکیں بنائی ہیں، سکول قائم کیے ہیں، ہسپتال کھولے ہیں۔" نینا طنز بھرے لہجے میں کہے جا رہی تھی "انہوں نے نیک کام بس اپنی نیکی میں کیے ہیں اور ہماری محبت میں کیے ہیں۔ اب اگر اتفاق سے تھوڑی بہت لوٹ کھسوٹ بھی کر لی ہے تو وہ بھی ہمارے بھلے ہی میں کی ہے۔ مگر خیر میں کہتی ہوں کہ باہر سے آنے والوں کے ساتھ آدمی کیسے وفادار رہ سکتا ہے۔"

"مسلمان بھی تو باہر ہی سے آئے تھے۔" جون کہنے لگی۔

میں نے اس کی یاددہانی کی خاطر کہا "مگر وہ تو پھر یہیں کے ہو رہے۔"

"اگر وہ اپنے آپ کو یہاں کا باسی نہیں سمجھتے" نینا بولی "تو پھر شوق سے وہیں چلے جائیں جہاں سے آئے ہیں۔"

''دیکھا؟ یہ ہندو بول رہا ہے۔'' نادرہ کو غصہ آ گیا'' ذرا گہرا کھرچو اور پھر دیکھو کہ ترقی پسند خیالات کی تہہ میں کیا چھپا ہوا ہے۔ وہی فرقہ پرستی جس کا تم مجھے'' الزام دیتی ہو۔''

جب بحث میں نوبت یہاں تک پہنچتی تو ہم اطمینان سے بحث کا رخ بدل دیتے اور اس پر خوش ہوتے۔'' اللہ میاں کے مذاہب کے مقابلے میں خود اللہ میاں بحث کا زیادہ محفوظ موضوع تھے۔''

میں دل لگی میں ہانکنے لگی'' جون بی بی، تمہاری سلطنت پی اینڈ او کے چکر میں ہاتھ سے جا رہی ہے۔ ان کے جہاز جتنے تیز چلتے ہیں اتنا ہی ان کے لیے 'ہوم'' کو واپس جانے کی سہولت ہے۔ یہ ہمارے مہربان، ہمارے سرپرست انگریز انہیں سمجھنے کا ہمیں موقع ہی نہیں ملتا۔

جون زیادہ بحث نہیں کر سکتی۔ بحث میں اس کا بودا پن اس کی اسی صفت کا شاخسانہ تھا جس نے اس کے کردار میں ایک طاقت پیدا کی تھی۔ ہماری طرح وہ نفرت کرنے کی عادی نہیں تھی۔ جس طرح ہم انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اس طرح وہ ہندوستانیوں سے نفرت نہیں کرتی تھی۔ بس یہ سمجھتی تھی کہ یہ کوئی علیحدہ نسل کے لوگ ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ انگریزوں کے ساتھ یگانگت محسوس نہیں کرتی تھی۔

''میں اینگلو انڈین ہوں اور یہی رہوں گی۔ کچھ اور نہیں بن سکتی۔ میرے دادا انگلستان سے یہاں آئے تھے۔ ہم اب بھی انگلستان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ ہمارا وطن ہے۔ ہم ہندوستانیوں کی نسبت انگریزوں سے زیادہ قریب ہیں۔ اس کے باوجود ہم بس اینگلو انڈین ہیں۔ یہ کچھ ان گھڑ سواروں کی سی صورتحال ہے جو سرکس کے رنگ میں دو گھوڑوں پر سوار ہو کر چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں گھوڑوں پر ٹکے ہوتے ہیں اور ان دو گھوڑوں کی تربیت اس طرح کی ہوتی ہے کہ وہ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔ ان گھڑ سواروں کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔''

سلویا کے خلاف جو میرے اندر زہر بھرا ہوا تھا اس کی جون نے تلافی کر دی تھی۔ اس کی دوستی سے میرے تعصب کا دف مر گیا تھا۔ جون کو دیکھ کر عزت و احترام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے اب میں سلویا کو بہانہ بنا کر دل میں نفرت نہیں پال سکتی تھی۔

ہم سہیلیوں کی ٹکڑی میں ایک رومانہ بھی تو تھی۔ وہ ہم سب سے یکسر مختلف تھی۔ ہماری بحثوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم جب لڑتے تھے تو وہ بہت لطف لیتی تھی۔ اصل میں اسے کسی بات پر کبھی کوئی اعتراض ہی نہیں ہوتا تھا۔

رومانہ نادرہ کی رشتہ دار تھی۔ اسی واسطے سے ہماری اس سے واقفیت ہوئی تھی۔ اس کا خاندان ایک چھوٹی سی مسلمان ریاست میں جا بسا تھا۔ وہاں اس کے والد صاحب کوئی چھوٹے موٹے افسر تھے۔ لیکن ان کا اثر و رسوخ بہت تھا، اس لیے کہ ریاست کے ہر انتظامی شعبے میں ان کا کوئی عزیز کوئی دوست موجود تھا۔ چاپلوسی کے زور پر وہ نواب صاحب کے منظور نظر بھی بن گئے تھے۔

رومانہ طرح طرح کے قصے سناتی تھی۔ ایک قصہ اس نے یہ سنایا کہ ایک پہاڑی کی کھوہ میں خزانہ ہے۔ مگر اس میں جانے کا راستہ بالکل بھول بھلیاں ہے۔ اس خزانے کے جدی پشتی محافظوں ہی کو بس اس رستے کا پتہ ہے۔ یہ محافظ دیو قامت حبشی ہیں جن کے رخساروں پر عجب قسم کے نشان پڑے ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ رومانہ نے ایک ہار کا بھی قصہ سنایا۔ یہ کسی داشتہ کے گلے کا ہار تھا۔ صدیوں پہلے کوئی راجہ تھا جس کی یہ داشتہ تھی۔ راجہ کو اس پر شک ہوا۔ اس نے اسی شک میں اسے یہ سزا دی کہ دیوار میں چنوا دیا۔ اس ہار کے بیچ بندھا ہوا ایک لعل ہے جس سے برس کے برس اس کی موت کے دن خون ٹپکنے لگتا ہے اور ہار کے موتیوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے حسیناؤں کے اغوا اور نباہ نہ کرنے والے شوہروں کے غائب ہو جانے کے کتنے ہی قصے سنائے تھے۔

رومانہ خود پریوں کی کہانی کی مخلوق نظر آتی تھی۔ بالکل ایسی لگتی تھی کہ جیسے ہاتھی دانت کی بنی ہوئی گڑیا ہے جس پر بہت نازک و نفیس نقش کاری کی گئی ہے۔ اس کا حسن اس قسم کا نہیں تھا جس سے دیکھنے والے کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ اسے دیکھ کر تو ایک فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ اس حسن کی وہ کیفیت تھی جو جاڑوں کی دھوپ میں ہوتی ہے۔

ہم پانچوں سہیلیاں زیادہ وقت جتنا بھی ممکن ہوتا اکٹھے گزارتی تھیں۔ آپس میں جب ہماری بحث نہیں ہوتی تھی تو پھر ہم زندگی کی گتھی سلجھانے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔ تشکیک کے مارے ہوئے ناپختہ نوجوانوں کے یہاں جو بیک وقت شکوک اور یقین، خوف اور ہمت کا عمل دخل ہوتا ہے بس اسی قسم کا عالم ہمارا تھا۔ اس عالم میں ہم زندگی کے بارے میں سوال اٹھاتے اور اس کی پیچیدگیوں پر غور و فکر کرتے۔ ہماری دنیا پر ہماری کتابیں چھائی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کی معرفت عظیم شخصیتیں، عالی دماغ مفکرین، فلسفی اور شاعر ہم سے ہم کلام ہوتے تھے۔ میں یہ بھول ہی جاتی تھی کہ یہ دنیا اصل میں بہت مختلف چیز ہے۔ جن کا کلام اس دنیا میں چلتا ہے وہ اور ہی لوگ ہیں۔ کسی بھلے وقت میں وہ لوگ ہمارے بابا جان تھے، عابدہ پھپھی تھیں، استانی جی تھیں۔ اب جن کا سکہ چل رہا تھا۔ وہ حامد چچا تھے، سائرہ چچی تھیں، ان کے ملنے والے تھے۔ میں ہمیشہ ہی سے دو دنیاؤں میں بٹی ہوئی رہی اور ایسا ہوا کہ رفتہ رفتہ واقعی دنیا سے مجھے اچھا خاصا بیر ہو گیا۔

چوتھا باب

ایک سہ پہر کا ذکر ہے' کالج سے آئی تو دیکھا کہ میری چچی کی ملنے والیاں آئی ہوئی ہیں۔ شوفروں کو دیکھ کر میں پہچان گئی کہ یہ تو بیگم وحید اور مسز واڈیا کے شوفر ہیں۔ دہلیز پہ بیٹھے اس مزے سے سگریٹ پی رہے تھے اور گپیں ہانک رہے تھے جیسے برس ہا برس سے ٹھالی ٹھسکے یہاں براجے ہوئے ہیں۔

مسز واڈیا مجھے زہر وں بری لگتی تھیں۔ ہمیشہ تیوری پہ بل پڑے رہتے تھے۔ ہر بات میں فی نکالتی تھیں۔ امیر کبیر تھیں۔ بمبئی کے ایک ردی مال کے تاجر کی بیٹی تھیں۔ ان تاجر صاحب کو پہلی جنگِ عظیم کے بعد نائٹ کا خطاب ملا تھا۔ اور شوہر نامدار انڈین سول سروس کے سینئر زمیں سے تھے۔ میاں بیوی دونوں کو انگریزوں کے حلقے میں بہت مقبولیت حاصل تھی۔ ہر انگریز افسر کو اس کے کرسچین نام سے خطاب کرتے تھے۔

کبھی کبھی مسز واڈیا بالکل یوں دکھائی دیتیں جیسے کوئی باز کریز میں آیا ہوا ہو اور کبھی یوں نظر آتیں جیسے کوئی گدھ ہے جسے خوب بنایا سجایا گیا ہے۔ موصوفہ کے لیے عطر پھلیل، جوتے فیتے، چین بنل سب کچھ لندن اور پیرس کے سب سے مہنگی دکانوں سے آتا تھا۔ سال کے سال مغرب کے ملکوں کا سفر کرتی تھیں۔ مغربی تہذیب کے فرزندوں سے زیادہ یہ بی بی اس تہذیب پہ ناز کرتی تھیں۔ اور مشرقی تہذیب کے بارے میں رویہ یہ تھا کہ غیروں سے بڑھ کر یہ اس پر نام دھرتی تھیں۔

چچی نے مجھے بلا بھیجا۔ ابھی تو میں نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مسز واڈیا تو میری سوتی ساڑھی کی ایک ایک سلوٹ کو اپنی نئی نکالنے والی نظروں سے دیکھیں گی۔ بس اس خیال ہی سے مجھے غصہ آنے لگا۔

جب میں وہاں پہنچی ہوں تو بیگم وحید اور مسز واڈیا آپس میں کسی بحث میں الجھی ہوئی تھیں۔ ان کے برابر ہی بالکل شکرے کی طرح کی ایک اجنبی بی بی اکڑی ہوئی بیٹھی تھیں۔ گھنی بھاری پلکیں، بڑی بڑی گھورتی آنکھیں، چوڑی اونچی پیشانی، سفیدی مائل بال جنہیں کس کر چٹیا باندھی گئی تھی۔ شکرے کی چونچ کی طرح کی ناک، پتلے پتلے بھینچے ہوئے ہونٹ، سبز سنہری دھاریوں والے تمامی کے کپڑے کا تنگ پائجامہ پہن رکھا تھا۔ بر میں کرتے پر سبز ریشمی واسکٹ، اس پر ہلکے بادامی رنگ کا دوپٹہ جس پر چھوٹے چھوٹے سنہری

ستارے بنے ہوئے تھے اور کناروں پر سنہری پٹی تھی۔ ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ زرق برق لباس اور یہ بھاری گہنا پاتا ان پر سج نہیں رہا تھا۔ لیکن بی بی صاحبہ میں ایک تمکنت تھی۔

چچی جان مسکرا کر کہنے لگیں "بیگم صاحبہ یہ ہے میری بھتیجی لیلیٰ۔" اسی کے ساتھ انہوں نے میری موٹی جھوٹی دستی کھادی کی ساڑی کو بری سی نظروں سے دیکھا اور ساتھ ہی ٹکڑا لگایا جیسے میرے حلیے کا جواب پیش کر رہی ہوں "ابھی ابھی کالج سے آ رہی ہے۔"

بیگم صاحبہ نے ہلکے سے سر ہلا کر میرے آداب کا جواب دیا۔ ساتھ میں مسکرائیں مگر اللہ تو با اتنی ہلکی مسکراہٹ کہ بس ہونٹوں ہی پہ آ کر رہ گئی۔ آنکھوں تک اس کی کیفیت گئی ہی نہیں۔ زبان سے ایک حرف بھی نہیں نکالا۔

میں چچی کے برابر کرسی کے کنارے پہ ٹکی ہوئی تھی۔ مجھے خوب احساس تھا کہ اس اجنبی بی بی کی آنکھیں مجھ پہ گڑی ہوئی ہیں۔

"بیگم وحید، معاف کرنا مجھے آپ کی بات سے اتفاق نہیں ہے۔" مسز واڈیا کہنے لگیں "جب گورنر کی لیڈی صاحب آئیں تو اس وقت تو ایرے غیرے کو دور پرے ہی رکھنا چاہیے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ داخلے کی فیس رکھنی چاہیے۔ میرے خیال میں چونی سے اٹھنی تک کا ٹکٹ مناسب رہے گا۔"

"اے بہن، یہ ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ آخر یہ پبلک پارک ہے۔ میونسپل بورڈ سے بہت لڑائی کرنی پڑی ہے۔ مت پوچھو کتنی مشکلوں سے انہیں قائل کیا کہ عورتوں کے لیے پارک ہونا چاہیے۔ اب ہم امتیازی سلوک۔۔۔۔۔"

چچی جان معذرت کرنے لگیں "بیگم صاحبہ، معاف کیجیے۔ آپ تشریف رکھتی ہیں اور ہم اپنی جھک کیے جا رہے ہیں۔"

"بیگم صاحبہ، آپ معذرت کر کے کیوں مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ معذرت تو مجھے کرنی چاہیے کہ میں نے پہلے سے آپ سے وقت نہیں لیا اور بلا اجازت منہ اٹھائے بیگم وحید کے ساتھ لگی چلی آئی۔"

"بیگم صاحبہ، آپ تشریف لائیں، یہ تو ہمارے لیے بہت ہی مسرت کی بات ہے۔"

دونوں بڑی رسمی قسم کی خوش اخلاقی سے گفتگو کر رہی تھیں۔ بڑی بور گفتگو تھی۔

"جو حقیقت ہے وہ ہمیں مان لینی چاہیے۔" مسز واڈیا بولیں "پارک کو جتنا استعمال میں آنا چاہیے کیا وہ استعمال میں آتا ہے؟ کیا عورتوں کے یہاں اس پارک کے لیے کوئی طلب تھی؟ یا ہم نے ان کی طرف سے اس کا مطالبہ کیا تھا؟"

"عورتوں کو پہلے بھی اس کی ضرورت تھی، اب بھی اس کی ضرورت ہے۔" بیگم وحید اب اس لہجے میں بول رہی تھیں جیسے حملے کے لیے تیار ہوں۔ "رفتہ رفتہ ان کے یہاں اس کی طلب بھی پیدا ہو جائے گی۔"

''بی بی، وہی کلب والا قصہ ہوگا۔ ہمارا خیال تھا کہ خواتین کے لیے ایک کلب کی بہت ضرورت ہے۔ لیکن ویسے تو کوئی بی بی آتی نہیں، انہیں کھینچ کے لانا پڑتا ہے۔ میں تو نئی پارٹیوں اور کھیلوں کا اہتمام کر کر کے پھنس گئی۔ ہر مہینے یہ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ انہیں جمع کرنے کا یہی طریقہ ہے۔''

چچی جان کہنے لگیں ''مسز واڈیا! آپ کو اس بات کا بھی تو لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہماری عورتوں کے لیے کلب کا تصور بالکل نئی چیز ہے۔ ہمیں انہیں یہ سکھانا ہے کہ ملنے جلنے کے نئے طور طریقے کیا ہیں۔ ہمیں تھوڑے تحمل سے کام لینا چاہیے۔''

مسز واڈیا کی ناک اور آنکھیں ان کے احساس برتری کی چغلی کھا رہی تھی ''صاف بات ہے، مجھ سے تو اب زیادہ برداشت نہیں ہوتا۔ آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم بیسویں صدی کی نہیں بلکہ اٹھارویں، اُنیسویں صدی کی تیسری دہائی میں سانس لے رہے ہیں۔''

بیگم وحید اس کے لیے مطلق تیار نہیں تھیں کہ اصل بات بیچ میں رہ جائے اور غیر متعلق باتیں شروع ہو جائیں۔ اس وقت تو پہلے سے بھی کہیں زیادہ ایسی لگ رہی تھیں کہ جیسے کوئی چتری کبوتر کڑکڑاتی مرغی کی طرح کڑکڑ کر رہا ہو ''صاف بات ہے، مسز خواتین کے لیے کلب ہو یا نہ ہو پردے والی بیبیوں کے لیے پارک ضرور ہونا چاہیے۔ مغل بادشاہوں اور ان کے باغوں کا ذرا تصور کرو کہ۔۔۔۔۔''

''میں تو آج کے معاملوں سے غرض رکھتی ہوں۔'' مسز واڈیا نے تڑپ کر بات کاٹتے ہوئے کہا ''پچھلی پبلک میٹنگ میں عورتوں کی بھیڑ کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے جانور پنجرے میں بند ہوں۔ ہم سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ اور پھر ہمیں ایسوں کی ضرورت ہے جو پیسہ دھیلا خرچ کرنے پہ آمادہ ہوں۔''

چچی جان نو وارد بی بی کو سمجھانے لگیں۔ ان کے لہجے سے کتنی شرافت ٹپک رہی تھی ''کیسا ہی نیک کام ہو، پیسے کے بغیر کام چلتا نہیں۔ لیکن جو بھی حالات ہوں کیسی ہی مشکلات ہوں، خدمت خلق کا کام تو جاری رکھنا ہی پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری بیٹیوں کے لیے حالات زیادہ سازگار ہوں گے۔ اُس وقت تک تو تعلیم بھی پھیل جائے گی۔ اس سے انہیں سہولت ہو جائے گی۔ اسی لیے تو میں عورتوں کی تعلیم کی قائل ہوں۔ انہیں تعلیم دلائی جائے اور خدمتِ خلق کے لیے تیار کیا جائے۔''

نو وارد خاتون نے اس پر ٹکڑا لگایا ''ہاں اگر تعلیم سے ان کا دماغ خراب نہ ہو جائے۔''

''بیگم صاحب! میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ اس کا انحصار گھر کے ماحول پر ہے۔ اب یہ میری بھتیجی لیلیٰ ہے۔ ہم اسے تعلیم یہ سوچ کر دلا رہے ہیں کہ آخر اسے نئے زمانے میں گزارا کرنا ہے لیکن اپنی پرانی روایتوں اور تہذیب کا بہر حال لحاظ رکھا جاتا ہے۔''

عقابی آنکھوں نے مجھے گھور کے دیکھا۔

''بیگم صاحب!'' مسز واڈیا بڑے میٹھے لہجے میں بولیں ''میرا خیال ہے کہ آپ کے شوہر نامدار

لڑکیوں کو نئی تعلیم دلانے کے قائل نہیں ہیں۔''

بیگم صاحبہ مخصوص رسمی انداز میں گویا ہوئیں ''سرمائی میں ہم لڑکیوں کو اچھی مائیں اور اچھی بیویاں بننے کی تربیت دیتے ہیں۔''

''سرمائی؟'' یہ نام میرے حافظے میں گونجنے لگا۔ نادرہ نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ وہاں کے نواب صاحب کے ایک رشتہ دار کو اپنے دوسرے فرزند ارجمند کے لیے ایک عدد دلہن کی تلاش تھی۔ اس تلاش میں وہ بہت مارے مارے پھرے۔ جو گھر ان کے مرتبے کے لائق تھے ان گھروں میں گئے اور لڑکیوں کے سارے سکولوں کو چھان مارا۔

ہم نے اس پر بہت لطیفہ بازی کی۔ ایک دوسرے کو ہم نے اس طرح نمبر دیے جیسے کسی میلہ مویشیاں میں مویشیوں کا مقابلہ ہو رہا ہو۔ نادرہ کو یہ یقین تھا کہ امیدواروں کی فہرست سے اس کا نام قلمزد کر دیا گیا ہے۔ وجہ اس نے یہ بتائی کہ اس نے بیگم صاحبہ کے حضور سیاست پر بحث شروع کر دی تھی اور یہ اعلان کر ڈالا کہ ہمارے یہاں شادیاں اسلامی نصب العین سے ہٹ چکی ہیں۔ اب شادی کیا ہوتی ہے، قیدی کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جاتا ہے اور اس طرح سنایا جاتا ہے کہ اسے اپنی صفائی کا حق بھی نہیں دیا جاتا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ یہ عورت مجھے گھور گھور کے کیوں دیکھ رہی ہے۔ اپنی چچی پہ مجھے جو غصہ آیا ہے بس پوچھو مت۔ انہوں نے کس چالاکی سے مجھے گھیر کے اس عقابی مخلوق کے سامنے ڈال دیا تھا۔ میں بے چین ہو کر پہلو بدلنے لگی۔ میرے پاس رکھی چھوٹی سی میز سے میرا پاؤں جا ٹکرایا۔ سموسوں، سینڈوچوں اور تلی ہوئی مسالے دار مٹر کی پلیٹ الٹ پلٹ گئی۔ اچانک ایسی آوازیں آئیں جیسے ہراس کے عالم میں مرغیاں دفعتاً کڑکڑانے لگتی ہیں۔

''خیر کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔'' مسز واڈیا نے ایرانی قالین پر ایک جائزے والی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مجھے کچھ اس قسم کا احساس دلانے کی کوشش کی جیسے میں کوئی ہاتھی ہوں جس کے پاؤں تلے آ کر بلور کے ظروف چکنا چور ہو گئے ہوں۔

نووارد بی بی پوچھنے لگیں ''آپ کی بھتیجی اسی کالج میں پڑھتی ہے نا جس میں نادرہ پڑھ رہی ہے۔''

''جی بیگم صاحبہ!''

''تو آپ کی بھتیجی پردہ نہیں کرتی؟''

''ہم تو اصل میں قرآنی احکامات کی روح کو دیکھتے ہیں۔ اس کو دیکھتے ہوئے ہم اس بات کے قائل ہیں کہ آزادی دی جائے مگر اتنی نہیں کہ شرم وحیا کی حدود سے تجاوز کر جائے۔''

مسز واڈیا نے کچھ سرپرستانہ سے لہجے میں کہا ''ہم پارسی لوگ تو پردے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ آخر پردہ بے حیائی کے خلاف کوئی ضمانت تو نہیں ہے۔ دور کیوں جاتی ہو، انہی دنوں جو لیلیٰ کے کالج میں سکنڈل

ہوا ہے اس کی مثال لے لو۔''

میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ہم سے تو یہ کہا گیا تھا کہ دیکھو اس واقعے کا کسی سے ذکر مت کرنا اور میں نے چچی جان کے سامنے ایسا ظاہر کیا جیسے مجھے اس واقعے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔

''وہ کیسا سکنڈل ہے؟'' مقابی بیگم نے شکاری پرندے کے سے انداز میں نظریں اٹھا کر پوچھا۔

بیگم وحید اور ہماری چچی دونوں ہی ہچکچا رہی تھیں۔ لیکن مسز واڈیا بلا تکلف بولیں ''ایک سخت پردے والے گھرانے کی مسلمان لڑکی پاس والے لڑکوں کے کالج کے ایک ہندو لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔''

''آخر لڑکوں کے سکولوں کے قریب ہی لڑکیوں کے سکول کیوں کھولے جاتے ہیں۔'' بیگم صاحب نے معترضانہ انداز میں سوال کیا اور ہماری چچی کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہی اس صورتحال کی ذمہ دار ہیں۔

لیکن مسز واڈیا نے ابھی داستان پوری نہیں سنائی تھی ''لڑکے کے والدین درگزر کرنے پہ بالکل آمادہ نہیں تھے۔ جب اس احمق لڑکے کی گرہ میں دام نہیں رہے تو آخر کو بہک گیا اور لڑکی کو چھوڑ بھاگا۔ ادھر لڑکی کے والدین نے لڑکی کو پھر گھر میں نہیں گھسنے دیا۔''

''ٹھیک کیا۔'' بیگم صاحب بڑبڑائیں ''اس نے خاندان کے نام کو بٹا جو لگایا تھا۔''

''اسنے مذہب کے احکامات سے سرکشی کی۔'' بیگم وحید نے ٹکڑا لگایا۔

''جس مقصد کے لیے ہم کام کر رہے ہیں اس نے اس مقصد سے غداری کی'' یہ ٹکڑا ہماری چچی جان نے لگایا۔

مسز واڈیا پھر رواں ہو گئیں ''اخباروں نے فرقہ وارانہ جذبات کو اتنا بھڑکا دیا کہ ہماری تنظیم اس لڑکی کی کوئی مدد نہیں کر سکی ورنہ ہم تو ایسی عورتوں کی جنہیں یوں بے آسرا چھوڑ دیا جاتا ہے بہت مدد کرتے ہیں۔ لڑکی نے آخر کو خودکشی کر لی۔''

بیگم صاحب بہت نیک پاک بن کر کہنے لگیں ''گناہ گاری کی سزا ضرور ملتی ہے۔''

''وہ گناہ گار نہیں تھی۔ میں پھٹ پڑی۔

''لیلیٰ'' چچی جان نے بہت غصے کے لہجے میں کہا اور باقی بیبیاں حیران و ششدر مجھے تکنے لگیں۔ وہ ایسے لگ رہی تھیں جیسے کاغذی پتلے ہوں، اندر سے کھوکھلے جیسے ان کی باتیں کھوکھلی تھیں۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور یہ پتلے ہوا میں اڑنے لگے۔ ان میں کون سی ایسی بات تھی جو میں ان سے ڈرتی۔

بوڑھی خرانٹ بیگم نے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پوچھا ''یہ لڑکی کہیں تمہاری سہیلی تو نہیں تھی؟''

میں تو اس عورت سے جلی بیٹھی تھی۔ مجھے ایسے دیکھتی تھی جیسے دکان پر سجے مال کو لوگ دیکھتے بھالتے ہیں۔ میں نے کہا ''نہیں۔ ویسے کتنا اچھا ہوتا کہ وہ میری سہیلی ہوتی۔ وہ ضرور ہمت والی لڑکی ہوگی اور یقینا

ہوشیار ہوگی جب ہی تو اس نے ایک غریب اور فرسودہ خیالات والے گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود تعلیم حاصل کی اور وظیفہ لیا۔ اس غریب لڑکی کو بہت سخت مصیبت برداشت کرنی پڑی ہوگی۔''

مسز واڈیا کو دل لگی سوجھی۔ کہنے لگیں ''اس لڑکی کے تو بہت نرالے خیالات ہیں۔ اے بی سائرہ اسے سنبھالو۔ لڑکی کہیں سوشلسٹ نہ بن جائے۔''

چچی جان بہت پریشان دکھائی دے رہی تھیں ''لیلیٰ یہ کیا مذاق ہے۔ گناہ کے فعل کی طرفداری کر رہی ہو!''

''میں گناہ کے فعل کی طرفداری نہیں کر رہی۔ اس نے کوئی چوری نہیں کی تھی، کوئی قتل نہیں کیا تھا۔ آخر ناولوں، ڈراموں میں اسی قسم کے کردار ہیرو، ہیروئن بنتے ہیں۔ ایسی ہی محبت کے بارے میں نظمیں غزلیں لکھی جاتی ہیں۔''

محبت کا لفظ تو ان پر بم بن کر گرا۔

''لیلیٰ'' چچی جان چلا اٹھیں ''تمہارے ہوش ٹھکانے ہیں؟'' پھر وہ بیگم صاحبہ سے مخاطب ہوئیں اور بیگم صاحبہ کا حال اس وقت یہ تھا کہ جیسے چہرہ سونت گیا ہو۔ بہت بیزار نظر آ رہی تھیں'' پتا نہیں اس لڑکی کو اس وقت کیا ہو گیا ہے۔ میں تو حیران ہوں۔ یہ تو اس کا مزاج ہی نہیں ہے۔ بہت ہی خاموش لڑکی ہے۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں اور کرخت لہجے میں بولیں ''میرا خیال ہے یہاں سے اٹھو، اپنے کمرے میں جاؤ۔''

کمرے سے نکلنے سے پہلے، جہاں دم بھر کے لیے ایک سناٹا چھا گیا تھا، میں نے ایک ایک کو بہت قاعدے قرینے سے آداب کیا۔

پانچواں باب

میں اپنے بستر میں لیٹی تھی اور میرا ازواں زواں کانپ رہا تھا۔ لیکن میرے اندر غصے کے جو شعلے لپک رہے تھے ان سے پرے اس لڑکی کا چہرہ میرے تصور میں ابھر آیا، درد میں ڈوبا چہرہ۔ سادہ سا چہرہ جس پر بڑی بڑی اذیت بھری آنکھیں نمایاں تھیں۔ آخر اس کے اندر کون سے ایسے عوامل کام کر رہے تھے جنہوں نے اس میں وہ طاقت پیدا کر دی جس کا اس کے پتلے دبلے جسم اور سہمی سہمی آنکھوں سے کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ تو اس طاقت کی نفی کرتے نظر آتے تھے۔ آخر کیسے وہ ان پتھر کی دیواروں کو اور خاردار تار کی باڑھوں کو بلکہ ان سے بھی کہیں بڑھ کر روایت اور خوف کی سرحدوں کو پھلانگ گئی۔ کیوں اپنی عمر کے سترہ برسوں میں مجھے ان سوالوں کا جواب نہیں آیا۔

''لیلیٰ بٹیا، لیلیٰ بٹیا، جُمن دھوبی تم سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ بڑی ضروری بات ہے۔''

جُمن اندر والے صحن میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ آنکھوں سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ ہاتھ التجا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔

''اے بٹیا، ننھی کی اماں کی حالت بہت خراب ہے۔ چل کر اسے قرآن شریف کی ہوا دو۔ دعائے توبہ پڑھو۔ بیگم صاحبہ تو بہت مصروف ہیں۔ اب تمہارے سوا کون ہمارا پوچھنے والا ہے۔ عابدہ بٹیا تو اب یاں پہ ہیں نہیں۔''

ننھی کا نام عادتاً اس کے منہ سے نکل گیا کیونکہ اپنی بیوی کو ہمیشہ وہ ننھی کی اماں ہی کہتا تھا۔ ننھی تو اس کے لیے ابھی تک مری برابر تھی۔

''میں آ رہی ہوں۔''

ابھی چند دن پہلے اس کی بیوی کے یہاں مردہ بچہ پیدا ہوا تھا۔

''جیتی رہو! لمبی عمر پاؤ!'' یہ کہا اور چلا گیا۔ میں نے اپنا قرآن اٹھایا۔ جب میں نے تمامی کے کپڑے کے جزدان کی سنہری ڈوری کھول کر قرآن نکالا تو بے ساختہ اسے بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا۔

سلیمن کہنے لگی'' کہتے ہیں کہ اس پہ جن آئے ہوئے ہیں۔ دو دفعہ اسے لال مرچوں کی دھونی دی

گئی ہے۔ اور بھی کتنے یہ ٹونے ٹونکے کیے ہیں۔ دائی تو بہت سے ٹونے ٹونکے جانتی ہے۔ پر کسی ٹونکے کسی گنڈے تعویذ کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔ اب وہ کہتے ہیں کہ بنیاد عا کرے۔''

میں نے کہا ''اگر یہ لوگ اسے ہسپتال لے جاتے تو۔۔۔۔۔''

سلیمن نے فوراً بات کاٹی'' ہے بٹیا! تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ شفا خانے لے جا کے بچہ جنواتے۔ چاروں طرف تو نگوڑے مردوے کھڑے رہتے ہیں۔ اتنی بھی بے شرمی کیا کہ سب ڈاکٹر اور کمپونڈر کھڑے دیکھ رہے ہوں۔ ایسی بے حیائی سے گھر پہ پڑے پڑے مر جانا اچھا۔ اور ویسے تو وہ اچھی بھلی تھی، پر جب سے کلموئے جنوں نے یہ گھر دیکھا ہے۔۔۔۔۔''

''اف! سلیمن چپ ہو جاؤ۔''

چھپر والے دالان کے پیچھے ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ ہاں اسی دالان میں تو میں نندی کے ساتھ کھیلا کودا کرتی تھی۔ اس وقت اس کوٹھری میں بہت ٹھنڈک تھی۔ اس کوٹھری سے پیچھے کی کوٹھری بہت گرم ہو رہی تھی۔ اثاث بھری ہوئی اور اندھیرا۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس پہ چق کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لٹکا ہوا تھا۔ بچے کی پیدائش سے پہلے جو آگ سلگائی گئی تھی وہ ابھی تک جل رہی تھی۔

مجھے بہت مشکل سے کچھ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ جُمن دروازے کے برابر کھڑا تھا۔ عورتوں نے جو پلنگ کے گرد ہجوم کیے کھڑی تھیں نندی کی اماں کو اٹھایا، اس کے سر اور کاندھوں کو سہارا دے کر میری طرف کیا۔ میں نے دیکھا کہ پلنگ کے سرہانے کسی جانور کی کھوپڑی رکھی ہے۔ پھر میں نے اس کے چہرے، اس کے منہ کو دیکھا۔ کچھ عجب تشنج نظر آ رہا تھا۔ میرے تو جیسے لب سل گئے۔ میں نے قرآن کھول کر کانپتی انگلیوں سے ورق الٹے پلٹے اور اسے ہوا دی۔

نظامن بوا اونچی آواز میں کہہ رہی تھیں'' یا اللہ! یا رحیم!''

جُمن ایسے سانس لے رہا تھا جیسے کوئی سسکی بھرتا ہے۔ عورت کا چہرہ اور سارا جسم اینٹھا جا رہا تھا۔ اس کے گرد کھڑی عورتیں سسک کر رو رہی تھیں۔

میں وہاں سے دھوپ میں نکل آئی اور اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے جون کی ماں کو ایک رقعہ لکھا۔ سلیمن کو بلایا اور کہا کہ'' یہ رقعہ جُمن کو دو۔ اس سے کہو کہ بیوی کو لے کر جلدی سے ہسپتال جائے اور یہ روپے اسے دے دو کہ تانگہ کر لے۔''

میں پلنگ پہ لیٹ گئی۔ روشنی کی طرف پیٹھ کر لی اور رونا شروع کر دیا۔

جب نندی کی ماں جنات کے اثر سے مر گئی۔ جنات کی وجہ سے کہاں، وہ ٹیٹنس سے مری تھی۔ ہاں تو جب نندی کی ماں گزر گئی تو نندی آن پہنچی۔ جُمن کو اب اس کی ضرورت تھی۔ معافی تلافی کے لیے راہ ہموار ہو چکی تھی۔

نندی جس دن آئی اسی رات میرے پاس آئی۔ میرے پیر پکڑ لیے اور رو رو کے کہنے لگی "اے بٹیا! میں تو جہنم میں تھی۔ اب میں واپس گھر آ گئی ہوں۔"

میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ کام کر کر کے ہاتھ کیسے کھردرے ہو گئے تھے۔ اب بھی وہ پیاری لگ رہی تھی اور وہی بچپن۔ لیکن اس کے منہ پہ اور آنکھوں میں ایک سختی آ گئی تھی۔

میں نے کہا "نندی! میں بہت خوش ہوں کہ تو آ گئی۔" اور سلیمن کھڑی سسک سسک کے رو رہی تھی۔ یہ خوشی کا رونا تھا۔ وہ خوش تھی کہ ہمارے لڑکپن کا جو ایک حصہ گم ہو گیا تھا وہ ہمیں واپس مل گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

چھٹا باب

کچھ دنوں تک میرے اور چچی جان کے بیچ ایک غیریت سی رہی۔ چچا جان نے میری بدتمیزی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا مگر ساتھ ہی عقاب بیگم صاحب جس مقصد سے تشریف لائی تھیں اس پر بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان بیگم صاحب کے بھائی جان بدنام آدمی تھے۔ آدمی کی حیثیت سے بھی اور حکمران کی حیثیت سے بھی۔ مگر چچا جان کے اس ردعمل سے بھی چچی جان کی برہمی کم نہیں ہوئی۔ چچی جان کے غرور و تمکنت کو جو ٹھیس لگی تھی اس کی ٹیس وقت گزرنے کے ساتھ کم ہوتی گئی۔ موسم بدل رہا تھا۔ گلابی جاڑے آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی چچی جان کا سوشل سیزن شروع ہو گیا۔ اس کی مصروفیت میں وہ بہت کچھ بھول گئیں۔

لیکن میرے اندر ایک مزاحمت کا جذبہ پل رہا تھا۔ چچی جان اور ان کی ملنے والیاں ترقی اور عالی ظرفی کی پرچارک بنی ہوئی تھیں۔ ان کے خیالات کے کھوکھلے پن کے خلاف میری قوتِ برداشت کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میرے اندر بغاوت کا مادہ پک رہا تھا۔ مگر اسے نکاسی کا رستہ نہیں مل رہا تھا۔

زہرا شوہر کے ساتھ یورپ میں چھٹیاں گزار کر واپس آ گئی تھی۔ واپس آ کر وہ یہاں آ کر ٹھہری۔ اس کی اماں اور عابدہ پھپھی بھی آن پہنچیں اور ان کے ساتھ استانی جی اور حکیمن بوا بھی آ گئیں۔ لیجیے خاندان کا بکھرا دائرہ مکمل ہو گیا۔ لگتا تھا کہ بیتے دن ہمارے آج کے دنوں میں آن ملے ہیں۔ لیکن اس ملاپ کی حیثیت کچھ ایسی تھی جیسے تیز ہوا سے بنتی بکھرتی لہروں پر کوئی پرچھائیں پڑ رہی ہو۔

اندر کے صحن کی پرلی طرف والے کمروں میں اب خاموشی کا ڈیرا نہیں تھا۔ لیکن گھر کے مرکزی حصے میں زندگی کا طور جوں کا توں تھا۔

عابدہ پھپھی اب کچھ زیادہ ہی جھنک گئی تھیں۔ خاموش بھی زیادہ رہنے لگی تھیں۔ چہرے کی ہڈیاں جو لگتا تھا کہ سانچے میں ڈھالی گئی ہیں اب کچھ زیادہ نمایاں ہو گئی تھیں، اور اس پُرسکون پیشانی پر اب لکیریں ابھر آئی تھیں۔ سکون اور خاموشی کے لمحوں میں یوں نظر آتیں جیسے اپنے آپ میں سمٹ گئی ہیں۔ لیکن ان کا ہر کام بامقصد ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ انہوں نے اپنی قوتِ ارادی سے دوسروں کی خاطر فرائض کا ایک سانچہ وضع کر لیا ہے۔

دو دن تو پھپھی جان کے میاں کا قیام رہا۔ ان دو دنوں میں ان کی ساری توجہ میاں پر مرکوز رہی۔ ہر

وقت انہی کے آرام کا خیال جیسے باقی ہر آدمی اور ہر بات کی ثانوی حیثیت ہے۔
میں اس خیال سے کہ پھپھی جان کے ساتھ وقت گزارنا ہے، لپک جھپک واپس گھر آتی، مگر یہاں دیکھتی کہ پھپھی جان کی ساری توجہ میاں پر ہے۔ میں پھوپھا جان سے جلنے لگی تھی۔ ویسے تو پھپھی جان اور پھوپھا کے باہمی تعلق میں احترام اور آرام کا خیال رکھنے کا بہت عمل دخل تھا لیکن اس میں گرمجوشی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

میاں کے چلے جانے کے بعد جب وہ فارغ نظر آئیں اور اسی رات کو جب باقی سب لوگ بھی اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے تو میں ان کے کمرے میں گئی۔ وہ غالب کا دیوان کھولے بیٹھی تھیں۔ دیوانِ غالب ان کی محبوب کتاب تھی۔ ہماری پھپھیوں چچیوں میں ایک وہی تھیں جن کے ہاتھ میں مجھے کتاب نظر آتی تھی۔

''میں نے جو کتابیں دی تھیں کبھی انہیں کھول کر دیکھتی ہو؟''

''پھپھی جان، بہت شرمندہ ہوں۔ میں۔۔۔۔۔''

''میں بھی شرمندہ ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں یہ سمجھ آ جائے گی کہ مانگے تانگے کے خیالات کے زور پر زندگی پورے طریقے سے بسر نہیں کی جا سکتی۔ اپنی زبان اپنے ورثے سے انس ہونا چاہیے۔''

''مجھے وقت اتنا کم ملتا ہے۔ اس میں مَیں کیسے کروں۔''

''اگر تم کام اپنا فرض سمجھ کر کرو تو کوئی کام ایسا نہیں ہے کہ تم نہ کر سکو۔ میں نے تمہیں یہی سکھانے کی کوشش کی تھی۔'' پھر اچانک کمرے کی اس خاموش فضا میں انہوں نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا ''کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں بہت سختی برت رہی ہوں۔ لیکن یہ کرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں جو سختیاں پیش آتی ہیں میں ان کے لیے تمہیں تیار کر رہی تھی۔ ہم پہ جو گزرتی ہے اس پہ ہمارا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن اپنے طرزِ عمل پر تو ہمارا کوئی اختیار ہونا چاہیے۔ آدمی کا احساس فرض کبھی کند نہیں ہونا چاہیے۔''

میں نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ ان کی باتیں اس احساس کے ساتھ سن رہی تھی کہ جیسے اس وقت میں بہت محفوظ ہوں۔ مجھے پتہ نہیں چلا کہ کب میری آنکھ لگ گئی۔ جب میں جاگی تو وہ بہت سکون سے ساکت بیٹھی تھیں۔ صرف ان کی انگلیاں میرے بالوں میں گردش کر رہی تھیں۔ اب آدھی رات کا وقت تھا۔

زہرا نے اپنی واپسی کی تاریخیں اس طرح رکھی تھیں کہ وائسرائے کے دورے کے ہفتے کے ساتھ ان کا تال میل ہو جائے۔

جن راستوں سے وائسرائے صاحب کو گزرنا تھا اور گزرتے ہوئے جن عمارتوں پر صاحب بہادر کی نظر پڑنی تھی انہیں اس تقریب کے پیش نظر بہت سجایا گیا تھا۔ جھنڈے، رنگ برنگی جھنڈیاں، روغن پھری لکڑی کے سجے بنے گیٹ اور محرابیں اس شان سے سڑکیں مزین کی گئی تھیں۔ عمارتوں پر مرمت کے بعد تازہ

رنگ روغن کیا گیا تھا۔ شہر دلہن بنا ہوا تھا۔ ایسی دلہن جس نے ویسے تو بھاری پوشاک پہن رکھی ہو لیکن ان کے نیچے والے چھوٹے کپڑے پرانے دھرانے میلے کچیلے ہوں۔

ہر شخص جس کی تھوڑی بہت حیثیت بھی تھی اس دورے کے معاملات میں کسی نہ کسی حیثیت سے شامل تھا، سرکاری طور پر یا سوشل حیثیت میں، یہ شمولیت شخصی اہمیت کا پیمانہ تھی۔ جو شخص جس حد تک ان امور میں شریک تھا اسی حساب سے وہ شخصی اہمیت کا مالک تھا۔ اسی وجہ سے مختلف تقاریب میں شرکت کے دعوت ناموں کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ تقاریب میں شرکت کے سلسلے میں جو ضابطہ بنایا گیا تھا وہ بہت اونچ نیچ والا تھا۔ اور اتنی سخت گیری تو ذات پات کے نظام میں بھی نہیں ہے جو اس ضابطے میں تھی۔ اس ضابطے کے تحت طے کیا گیا تھا کہ کسے کس تقریب میں مدعو کیا جائے گا۔ ایسے لوگ تو بس گنے چنے تھے جنہیں ساری تقاریب کے دعوت نامے بھیجے جاتے تھے۔ ہمارے چچا چچی، زہرا اور ان کے میاں بھی اُن گنے چنے لوگوں میں شامل تھے۔

زہرا اپنے ظاہر میں بہت بدل گئی تھی۔ اس کے ہنسنے بولنے، اٹھنے بیٹھنے، سارے ہی طور طریقوں میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ مگر مجھے پتہ تھا کہ وہ اندر سے بالکل نہیں بدلی۔ جس طرح ایک وقت میں اس نے ایک سعادت مند پردے دار لڑکی کا پارٹ ادا کیا تھا اسی طرح اب ایک مکمل طور پر ماڈرن بیگم صاحب کا پارٹ ادا کر رہی تھی۔ اس زمانے کا اس کا شرمیلا پن اس وقت کے رول کے عین مطابق تھا اور اب جو اس کے یہاں ایک رکھ رکھاؤ تھا، وہ بھی اس وقت کے رول کے عین مطابق تھا۔ اُس زمانے میں وہ دن میں پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھتی تھی۔ اب اسی پابندی سے صبح وشام اور شب کی سوشل تقریبوں میں شرکت کرتی تھی۔

چھ مہینے کے غیر ملکی دورے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ مغربی زندگی کا ملمع اس پر اس خوبصورتی سے چڑھا تھا کہ اب جو اس کی زندگی کا نیا طور تھا اس کے ساتھ اس کا پورا تال میل ہو گیا تھا۔ فریضہ تو اسے نباہنا ہوتا ہی تھا مگر یوں بھی جس رنگ کی یہ زندگی تھی اس میں اسے بہت مزہ آ رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی اماں کے سامنے وہ منہ سے کچھ اور کہتی تھی۔ ماشاءاللہ اب اس کی صورت شکل نکل آئی تھی اور اب ذرا اترانے بھی زیادہ لگی تھی۔ میاں نے جس سانچے میں ڈھالنا چاہا تھا اس سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ یعنی بالکل ایک انڈین سول سروس کے جاہ طلب افسر کی بیگم بن گئی تھی۔

نصیر کے یہاں جاہ کی جو طلب تھی اس سے اس کی زندگی ایک سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ ہر قدم نپا تلا، ہر کام باون تولے پاؤ رتی درست، ہر فعل میں ایک توازن، ایک رکھ رکھاؤ۔ بظاہر اوصاف حمیدہ کی ایک پوٹ مگر ذرا کھرچئے تو چھلکے سے اترتے چلے جائیں۔ اندر حرص جاہ کے سوا کچھ نہیں۔ بس یہی اس کی اصل ذات تھی۔

روز چند منٹ کے لیے ماجدہ پھپھی کی خدمت میں حاضر ہونا، صحت کے بارے میں استفسار کرنا،

رکھ رکھاؤ کے ساتھ تھوڑی گفتگو کرنا، دعائیں لے کر رخصت ہونا اور خوش دامن صاحبہ کا پھولے نہ سمانا کہ بیٹی کے نصیب سنور گئے کہ اسے ایسا شوہر ملا ہے۔

نصیر دوسروں کی نسبت چچا جان سے مل کر زیادہ خوش نظر آتا تھا۔ ادھر زہرا کا معاملہ بھی یہی تھا کہ وہ اپنی اماں کی نسبت سائرہ چچی کے ساتھ زیادہ یگانگت محسوس کرتی تھی۔ ان کے مشاغل اور دلچسپیاں تو مشترک تھیں ہی مگر اس نے چچی جان سے ایک اور بہت پکے قسم کا تعلق پیدا کر لیا تھا۔ وہ اس طرح کہ جب وہ انگلستان گئی تھی تو وہاں کمال اور سلیم سے بھی ملتی ملاتی رہی تھی۔

ساتواں باب

زہرا میرے کمرے میں آئی اور آتے ہی پلنگ پہ ڈھیر ہو گئی۔ لیٹے لیٹے اس نے جوتے اتارے اور کہنے لگی "میں تو تھک کے چور ہو گئی۔ ویسے ریس میں مجھے یہ اونچی ایڑی والی جوتی پہن کر نہیں جانا چاہیے تھا۔"

مشق کی کاپی میں نوٹس لکھتے لکھتے میں نے اسے بند کر کے ایک طرف رکھا "زہرا سناؤ، تم جیتیں یا نہیں۔ تم نے میرے دو روپے اس واہیات نام والے گھوڑے پہ لگائے تھے۔"

"وہ گھوڑا تو پھسڈی نکلا۔"

میں ہنس پڑی "اس سے مجھے یہ سبق ملا کہ جوا نہیں کھیلنا چاہیے۔ ویسے میں نے سلیمن سے وعدہ کیا تھا کہ اگر جیت گئی تو تمہیں نئی چوڑیاں پہنواؤں گی۔"

"تم خود جانا شروع کر دو تو اچھی رہو گی۔ ویسے بھی اب وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔ اب تو ایک سال کی بات ہے۔ اس کے بعد تمہاری پڑھائی پوری ہو جائے گی۔ پھر تمہارا بیاہ ہو جائے گا اور پھر تم سب جگہ جایا کرو گی۔ کیا منڈیا ہلا رہی ہو۔ آخر ہمیشہ کنواری تو نہیں بیٹھی رہو گی۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔" اس نے ایک زور کی انگڑائی لی۔ بلاوز اس نے چھاتیوں پہ بہت کس کے باندھا ہوا تھا۔ اب وہ ڈھیلے ڈھالے کپڑے نہیں پہنتی تھی۔ نہ جھک کر چلتی تھی۔ پہلے تو بدن چھپانے کے چکر میں کمر اور شانے جھکا کر چلا کرتی تھی۔ "واہ واہ!" اس نے اطمینان بھرا لمبا سانس لیا۔ "بہت خوبصورت سماں تھا۔ کتنے پیارے پیارے لباس تھے۔ اور باڈی گارڈوں کی کس شان کی وردیاں تھیں۔ دھوپ میں چمکتے ہوئے ان کے بھالے، اور ان کے گھوڑے، بینڈ، گل پھول، بس ہر چیز ہی خوبصورت تھی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تم کیسی کیسی چیز دیکھنے سے محروم رہ گئیں۔" ایک دم سے اٹھ کے بیٹھ گئی "بس میں نے سوچ لیا ہے۔ کل میں تمہیں بارہ دری کے استقبالیے میں لے کر جاؤں گی۔"

"میں کیسے جا سکتی ہوں۔ مجھے تو نہیں بلایا گیا۔ اور ایک بات اور بھی ہے۔ حامد چچا اور سائرہ چچی مجھے ساتھ لے کر جانا کب پسند کریں گے۔ تمہاری بات اور ہے، تم خیر سے بیاہی عورت ہو۔"

"میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں گی۔ مجھے پکا یقین ہے کہ وہ اس پہ اعتراض نہیں کریں گے۔ وہ دقیانوسی لوگ تو نہیں ہیں۔ اگر میرا بس چلتا تو میں تمہیں سب جگہ لیے لیے پھرتی۔ تمہیں کچھ پتہ تو چلے کہ کتابیں جو سبق سکھاتی ہیں اس کے علاوہ بھی زندگی میں بہت کچھ ہے۔"

''زہرا!'' میں ہنسنے لگی'' تم نانیوں دادیوں کی طرح باتیں کرنے لگی ہو۔ ارے کیا بیاہ سے بڑھاپا آ جاتا ہے؟ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ بی بی، مجھے دعوت نامہ نہیں آیا ہے۔''

''کیا فضول بات ہے۔ بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو ہماراری سپشن ہے۔ تعلقہ داروں کی طرف سے دیا گیا ہے۔ میں آگے کوئی بات نہیں سنوں گی۔ تمہیں چلنا ہے۔''

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔''

''تمہیں تو اپنے بھلے برے کی پتہ ہی نہیں ہے۔''

''زہرا! تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم تھک کے چور ہو گئی ہو۔ پھر بھی تم بحث کرنے پہ تلی نظر آتی ہو۔''

''لیلیٰ! میں ایسے باز آنے والی نہیں۔ ایک دن آئے گا جب میں تم سے بدلہ لوں گی۔ وہ دن جب تم کتابوں کے بیچ سے نکل کر دنیا میں قدم رکھو گی۔''

''زہرا! تم کونسی دنیا کی بات کر رہی ہو؟ تمہاری پچھلی دنیا یا آج والی تمہاری دنیا؟''

''تھوڑا انتظار کرو۔ پتہ چل جائے گا۔ لے دے کے ایک ہی تو دنیا ہے جس میں آدمی رہتا ہے۔۔۔۔۔ بس وہی دنیا ہے۔''

''کیا حکیمانہ بات کہی ہے۔'' پردوں کی پرلی طرف سے آواز آئی اور زن سے اسد کمرے میں داخل ہو گیا۔ لیکن زہرا کو دیکھ کر اس کے چہرے سے مسکراہٹ رفو چکر ہو گئی۔

''زہرا!'' اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا'' دور سے تمہاری آواز یوں لگ رہی تھی جیسے لیلیٰ کی آواز ہو۔''

''ہلو اسد!'' زہرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کی آواز میں جو اعتماد کی ایک کھنک تھی وہ جاتی رہی۔

''اسد!'' میں خوش ہو کر اٹھی کہ اسے گلے سے لگاؤں۔'' تم کب آئے؟ ارے بتایا تو ہوتا کہ تم آ رہے ہو۔''

''بس لپک جھپک میں نے طے کیا کہ چلنا ہے۔ ادھر سر پہ کام کا بھی بوجھ تھا اور جی بھی للچا رہا تھا کہ عابدہ پھپھی آئی ہوئی ہیں۔ چل کر ان سے ملنا چاہیے۔''

وہ اب اور لمبا ہو گیا تھا۔ لیکن اسی طرح دبلا پتلا اور اسی طرح چہرے پہ زردی کھنڈی ہوئی۔ لیکن بولنے، بات کرنے میں ایک متانت آ گئی تھی۔ ویسے ناک کان ہاتھ پیر کو الگ الگ دیکھو تو یونہی سا لگتا تھا لیکن اس متانت کی وجہ سے وہ پہلے سے بہت بہتر نظر آ رہا تھا۔

''خوشی کی بات ہے کہ اس موقع پر اتفاق سے میں بھی یہاں ہوں۔'' زہرا بظاہر بڑی معصومانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر پیارے سے انداز میں کچھ پیچھے ڈھلک گیا تھا۔'' کتنے برسوں سے میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ اسد! تم تو بہت بدل گئے ہو۔''

مجھے محسوس ہوا کہ اس کی انگلیوں نے میری انگلیوں کو جکڑ لیا ہے اور پھر اس نے اپنا ہاتھ پرے کر لیا۔ دریچے کے برابر کونے میں جو رائٹنگ ڈیسک رکھا تھا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور سادہ سے لہجے میں کہا

"مجھے پتہ تھا کہ تم آئی ہوئی ہو۔ تم بھی تو بدل گئی ہو۔"

"قدرتی بات ہے۔ بدلنا ہی تھا۔" ہنسی اور بولی "اب میں کوئی لڑکی تو نہیں ہوں۔ بیاہتا عورت ہوں۔"

"ہاں، ظاہر ہے۔"

"زاہد کیسا ہے؟" میں نے پوچھا "کتنے دنوں سے وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا۔"

"اچھا ہے۔ میرے خیال میں ان دنوں وہ پڑھائی میں زیادہ لگا رہا۔ پچھلے امتحان میں اس کے نمبر اچھے نہیں آئے تھے۔ اس سے وہ پریشان تھا۔"

زہرا پوچھنے لگی "رنگائی سے لے کر اسلام کی نشاۃ الثانیہ تک جس موضوع پر دیکھو موصوف کے خیالات نرالے ہی تھے۔ ان کا وہ نرالا پن ابھی باقی ہے یا رخصت ہو گیا؟"

"وہ سب نرالے خیالات جوں کے توں ہیں۔ مگر ان حضرت کا خیال میرے بارے میں ہے کہ میرے خیالات ان سے زیادہ نرالے ہیں۔ مجھے تو موصوف منحرفین میں شمار کرتے ہیں۔" اسد ہنسنے لگا۔

"تم دونوں سے زیادہ میں اسے سمجھتی ہوں۔ مذہب کو وہ جس رنگ میں بھی مانتا ہو، کم از کم ان لوگوں سے تو بہتر ہے جو مذہب کو بالکل مانتے ہی نہیں۔ بس اسے ایک احتیاط برتنی چاہیے کہ سیاست میں ٹانگ نہ اڑائے۔ اسے اپنے مستقبل کا خیال رکھنا چاہیے۔" زہرا نے جس اعتماد سے یہ بات کہی اس طرح کا اعتماد صرف اہل اقتدار کے خاص الخاص حلقوں کو حاصل ہوتا ہے۔ "ویسے اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب وقت آئے گا تو اللہ نے چاہا تو نصیر اسے کسی اچھی جگہ لگوا دیں گے۔"

اسد جواب میں کچھ کہنے لگا تھا کہ اس کے میاں نصیر کمرے میں داخل ہوئے۔ سوٹ بوٹ سے درست، کلف لگا کالر۔

"زہرا! میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ بس اب تیار ہونا شروع ہو جاؤ۔ ہز ایکسیلینسی کی آمد سے کم از کم آدھ گھنٹہ پہلے ہمیں سرجان کلب پہنچ جانا چاہیے۔"

"میں کبھی لیٹ ہوئی ہوں؟ پریشان کیوں ہو رہے ہو۔" اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسد تمہیں یاد ہیں یا بھول گئے؟"

"بالکل یاد ہیں۔ کیسے مزاج ہیں؟"

"سلام علیکم" اسد بولا۔

زہرا جاتے جاتے دروازے پر دم بھر کے لیے رکی "نیلی رو پہلی ٹشو والی ساڑھی پہنوں جس پہ روپہلی بنارسی کناری بنی ہے یا سرخ فرنچ بروکیڈ والی جس پہ سنہری کام بنا ہے؟ باقی ساڑھیاں تو پہلے بہت پہن چکی ہوں۔"

نصیر نے ہونٹوں کو سوچنے والے انداز میں بھینچتے ہوئے کہا "سنہری کام والی ٹھیک رہے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں ابھی آئی۔" زہرا نے جاتے جاتے کہا اور دروازے سے نکل گئی۔ اس کے چلنے

جانے کے بعد بھی کمرے میں فرنچ پرفیوم کی مہک بسی ہوئی تھی۔ اب وہ فرنچ پرفیوم ہی استعمال کرتی تھی۔ پہلے جو عطر اسے پسند تھا اس کے مقابلے میں یہ پرفیوم زیادہ لطیف چیز تھی۔

''آپ دلّی میں پڑھ رہے ہیں نا؟'' نصیر نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

''جی، میں وہاں تین سال سے ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ۔۔۔۔۔''

''خوب! بہت خوب۔ جب ہماری پوسٹنگ ہو تو آپ آئیں، ہم سے ملیں۔'' نصیر نے کچھ بے توجہی کے لہجے میں کہا۔ پھر اپنی مسکراہٹ کا رخ میری طرف کر دیا ''لیلیٰ! ہم تم سے گڈ نائٹ نہ کر لیں۔ بات یہ ہے کہ ہمیں کسی کاک ٹیل پارٹی میں جانا ہے۔''

''گڈ نائٹ نصیر بھائی!''

''گڈ نائٹ، لیلیٰ! گڈ نائٹ اسد صاحب! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

''خدا حافظ!'' اسد نے یہ کہہ کر بہت لمبا سانس کھینچا اور پھر آہستہ آہستہ سانس باہر کی طرف لینا شروع کیا۔ ''حیرت ہوتی ہے، کس طرح یہ لوگ اترا اترا کر اپنی افسرانہ شان اور اہمیت جتاتے ہیں اور کس طرح دوسرے کو احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ خیر میں تو ایسی باتوں کی پروا کرتا نہیں۔ ان باتوں کی اہمیت ہی کیا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت میں زہرا کے شوہر نامدار سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا اور زہرا کو دیکھا تو کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے جھولا جھولتے ہوئے لمبا جھونٹا لے کر اوپر سے تیزی سے نیچے آ رہا ہوں۔ پھر اچانک یوں محسوس ہوا کہ مجھے رہائی مل گئی ہے اور میں حیران ہونے لگا کہ آخر اس کیفیت کے برخلاف کیفیت مجھ پر کیوں طاری رہی تھی۔ خیر میں اپنے بارے میں باتیں کیے جا رہا ہوں۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ کیسی گزر رہی ہے۔''

''ارے بتانے والی کوئی بات ہو تو بتائیں۔ بس یہ ہے کہ شاید اب میں کچھ زیادہ کنفیوز رہنے لگی ہوں۔'' میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔

''یہی میرا حال ہے۔ ہم سب ہی کا یہ حال ہے۔ لیکن میں تو ایسا صرف اس وقت محسوس کرتا ہوں جب مجھے کوئی کام دھام نہیں ہوتا۔ بیٹھا سوچ رہا ہوتا ہوں کہ کیا کام کیا جائے۔ لیکن جب میں کام میں مصروف ہوتا ہوں، یعنی خالی پڑھائی نہیں بلکہ بے پڑھوں کو پڑھانے میں مشغول ہوتا ہوں، یا ایسے ہی اور کام۔ غریبوں کے درمیان گھومنا پھرنا، دیہات میں جا کر کام کرنا، جلسوں کا انتظام کرنا، ایسے کام کرتے ہوئے مسائل اٹل پہاڑ نہیں لگتے۔ مجرد تصورات پر بحث کرتے رہیے، کرتے چلے جائیے۔ اس کا تو کوئی انت ہی نہیں ہے۔ لیکن جب آپ کوئی کام کر رہے ہوں تو پھر صورتحال مختلف ہوتی ہے۔ اس صورت میں تو نتائج سامنے آتے ہیں۔ ٹھوس نتائج تو خیر سامنے آتے ہی ہیں۔ اس سے ہٹ کر ایک چیز اور ہے، آپ کو ایک طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔''

اسد کے لہجے میں اب ایک نیا اعتماد جھلک رہا تھا۔ اگرچہ اس کی آنکھوں میں اب بھی وہی خواب دیکھنے والوں کی سی کیفیت تھی۔

''اسد! ایک بات تمہیں بتاؤں۔ میں تمہیں اس نئے روپ میں دیکھوں گی، یہ بات میرے تصور میں نہیں آ پا رہی۔ میں تو تمہیں ایک خواب دیکھنے والے شرمیلے نوجوان کے روپ میں دیکھتی رہی ہوں۔ کیا واقعی کبھی اس سے مختلف روپ میں تمہیں دیکھنا پڑے گا۔ ہاں تم یہاں کس کام سے آئے ہو؟ ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ تم یہاں آنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' وہ ہنسا ''لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہاں مجھے ایک کام بھی تھا۔ اس وقت طلبا میں بہت اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ یہ جو وائسرائے صاحب بہادر سرکس لگا رہے ہیں اور جس سے زہرا بی بی اتنا لطف اندوز ہو رہی ہیں وہ ہے اس اضطراب کا محرک۔ بعض طلبا کی نیت یہ ہے کہ اس موقع پر کوئی مظاہرہ کیا جائے اور اس طرح یہ بتایا جائے کہ بینڈ باجے اور جھنڈیوں پر چموں سے جو اس دورے کی مقبولیت ثابت کی جارہی ہے اصل میں اسے یہ مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ اس موقع پر حکام کے دماغ تو عرش پہ ہوں گے۔ ان کی نخوت کے سبب تصادم کا سخت اندیشہ ہے۔ اور میں کسی بھی ایسے اقدام کے خلاف ہوں جس سے تشدد کی کوئی صورت پیدا ہو۔''

''ارے اسد! جی چاہتا ہے کہ تم ہماری سہیلی نیتا سے ملو۔ وہ تشدد کی قائل ہے، البتہ کچھ شرطوں کے ساتھ۔ جب بحث کرتے کرتے اسے بہت جوش آتا ہے تو میں اسے اس رنگ سے دھیان میں لاتی ہوں کہ جیسے کوئی گول مٹول سنڈی مسنڈی ہے، ہتھیاروں سے لیس۔ ہاتھ میں لمبی سی تلوار ہے۔ تلوار گھما رہی ہے اور دیوؤں راکشسوں کے سر قلم کرتی چلی جا رہی ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ جب تم دونوں کی ملاقات ہوگی تو ہوگا کیا۔''

''جو کچھ ہوگا برا ہی ہوگا۔'' اسد ہنسنے لگا۔ ''مار دھاڑ کرنے والی عورتوں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ ہاں، لو اس سے مجھے یاد آیا کہ حکیمن بوا نے تمہیں یہ بتانے کے لیے مجھے بھیجا تھا کہ کھانا تیار ہے۔''

ہم دونوں اٹھ کر چلے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لان سے گزرے۔ صحن کے پرلی طرف کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ ہم نے اس طرف نظر ڈالی تو اس روشن کمرے میں یہ منظر دیکھا کہ ماجدہ پھپھی سامنے ایک ڈلیا رکھے چھالیاں کتر رہی ہیں اور عابدہ پھپھی پان لگا رہی ہیں۔ ان کے قریب ہی فرش پہ حکیمن بوا بیٹھی انتظار کر رہی ہیں کہ انہیں حکم ملے تو کھانے کے خوان لے کر آئیں۔

ہم دم بھر کے لیے رک کر کھڑے ہو گئے۔ بالکل ساکت۔

''لگتا ہے کہ کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔''

''جیسے ہمارے بیتے دن لوٹ آئے ہوں۔''

''وہ دن جب ہم اپنے آنے والے دنوں کے انتظار میں تڑپا کرتے تھے۔''

آٹھواں باب

زہرا اب جس سوسائٹی میں سانس لے رہی تھی اس سے مجھے متعارف کرانے کے لیے اس سے زیادہ شاندار موقع اس کے ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ تعلقہ داران اودھ کی طرف سے وائسرائے بہادر کو ریسیپشن دیا جا رہا تھا۔ صوبے بھر کے امرا اور رؤسا میزبان بنے ہوئے تھے۔ سب صاحب حیثیت لوگ ان کے مہمان تھے۔

مہینوں پہلے تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ ایسے سارے استقبالیوں کا اہتمام بارہ دری میں ہوا کرتا تھا۔ تو بارہ دری کی صفائی ستھرائی ہو رہی تھی۔ نیا پینٹ کیا جا رہا تھا۔ اردگرد پھیلے ہوئے سبزہ زاروں کے بیچ وہ ایسی لگ رہی تھی جیسے زمرد کی ڈھیری کے بیچ سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی بگھی رکھی ہو۔

سبزہ زاروں اور باغوں کے اردگرد جو بالا خانے بنے ہوئے تھے، ان پر بھی نیا پینٹ کیا گیا تھا۔ پوری عمارت پر صندلی رنگ، لیکن ستونوں اور گولوں پر سفید پینٹ کیا گیا تھا۔ ان بالا خانوں کے گرد اب بھی رومانس کا ایک ہالہ منڈلا رہا تھا حالانکہ وہ زمانہ کبھی کا گزر چکا تھا جب یہاں شاہی حرم کی حسینائیں براجتی تھیں۔ اب تو یہ بالا خانے تعلقہ داروں کے ٹاؤن ہاؤس بنے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب شاہ عالی وقار کا ان بالا خانوں کی چھتوں پر گزر ہوتا تھا تو اڑتے کبوتروں کی ٹکڑیاں ان پر سایہ کرتی تھیں۔ وہ جو دو عالی شان دروازے کھڑے ہیں جہاں سے چوکھونٹ کو راستہ جاتا ہے، ان دروازوں پر اب تک شاہانِ اودھ سے وابستہ شاہی نشان آراستہ ہے، محراب کی شکل بناتی ہوئی دو مچھلیاں۔

استقبالیے کے دن مدعوین تو خیر مجسم انتظار بنے ہوئے تھے ہی مگر شہر کی باقی خلقت بھی ایسے انتظار کر رہی تھی جیسے کسی نمائش کا انتظار کیا جاتا ہے۔ دلکشی کے دو پہلو خاص تھے۔۔۔۔۔ چراغاں اور آتش بازی۔ جشن کی اس رات کا روایتی اعتبار سے نقطۂ عروج اسی آتش بازی کو بننا تھا۔

شام ہوتے ہی زہرا میرے کمرے میں آئی اور پلنگ پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر سلیمن کو آواز دی "سلیمن! ذرا میرے پیر تو داب۔ میں تو تھک کے چور ہو گئی۔" اس نے لمبا سانس لیا۔ چہرے پر کوئی میک اپ نہیں تھا۔ بس ہلکی کریم ملی ہوئی تھی اور بال بے پروائی سے پیچھے لپیٹے ہوئے تھے۔ اس عالم میں وہ وہی پرانی سیدھی، سادھی، سادگی پسند زہرا نظر آ رہی تھی۔

اس نے انیمل کی بوتل میز پر رکھ دی تھی۔ میں نے جا کر میز سے بوتل اٹھائی اور وہ ہاتھ پھیلا کر پیارے انداز میں مسکرائی۔

''لیلیٰ! تم چُپ چُپ کیوں ہو۔ سب ہی کچھ چُپ چُپ ہیں۔ آخری کیوں؟ سلیمن کو دیکھو منہ سے کچھ پھوٹتی ہی نہیں اور اس کے ہاتھ کیسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں جیسے کوئی لاش ہو۔ ان میں جان بھی بس اتنی ہی ہے۔ سلیمن! آخر بات کیا ہے۔''

''بٹیا! کچھ بھی بات نہیں ہے۔'' سلیمن نے بیدلی سے کہا۔

میں بولی'' شاید وہ بھی تھک گئی ہے۔ آج کل گھر میں کام بھی تو بہت زیادہ ہے۔''

''بکواس۔ مجھے پکا یقین ہے کہ کوئی بات ہے۔ تم تو اپنی خیالی دنیا میں کھوئی رہتی ہو۔ کسی بات پر دھیان نہیں دیتی ہو۔''

''مجھے اس سے نکلنے کی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔''

''آج شام کے پروگرام کے خیال سے تمہارے دل میں گدگدی نہیں ہو رہی؟''

''نہیں، مجھے تو اس خیال سے وحشت ہو رہی ہے کہ مجھے تم سب کے ساتھ جانا ہے۔'' میں نے ہنس کر یہ جتانے کی کوشش کی کہ میں مذاق کر رہی ہوں۔'' زہرا! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں عابدہ پھپھی کے ساتھ جا کر پردہ گیلری سے سجاوٹ دیکھوں۔ آخر ایک زمانے میں ہم دونوں وہیں سے سارے تماشے دیکھا کرتے تھے اور ہماری طبیعت سیر ہو جاتی تھی۔''

''سیر ہو جاتی تھی؟ میری طبیعت تو سیر نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ان دنوں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ارے تم تو بہت خوش نصیب ہو کہ سیر تماشوں کے لیے تمہیں بیاہ کا انتظار نہیں کرنا پڑ رہا۔ میں تو کنوار پنے کے دنوں میں کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔''

''بیاہ کے بعد سے اب تک تم نے ایک ہی لطف کا کام کیا ہے۔ وہ یہ کہ تم نے سفر کیا ہے۔''

''ارے تم کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ ہاں انگلستان کے سفر میں ایک بات تھی جو میں نے سیکھی۔ تم بھی یہ بات گرہ میں باندھ لو۔ میں نے وہاں رہ کر اپنی تہذیب اور تربیت پر فخر کرنا سیکھا۔ وہ سب خطاب یافتہ لوگ جن کا بہت ڈھول پیٹا جاتا ہے، ہم سے کسی صورت بہتر نہیں ہیں۔ بس مشکل یہ ہے کہ آج کل یہاں ہر ایرا غیرا بی بی اپنے آپ کو بیگم کہتی ہے۔ لیلیٰ تمہیں پتہ ہے کہ تعلقہ داروں کو کنگ کے دربار میں حاضر ہونے کا استحقاق ملا ہوا ہے۔''

''اس معلومات کا شکریہ۔ مگر اس معلومات سے میری اس حیثیت میں کیا فرق پڑتا ہے کہ کنگ کے سالیس کی پوتی سکول میں مجھے کالا لوگ کہہ کر پکارتی تھی اور میرے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیتی تھی۔''

''لیلیٰ، تمہارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ تم خود رائے ہو۔''

''اور تمہارے ساتھ یہ مشکل ہے کہ تمہاری اپنی کوئی رائے ہی نہیں ہوتی۔ کیا تم کبھی اپنی موجودہ زندگی کو اپنی پچھلی زندگی کے مقابلے میں رکھ کر نہیں دیکھتیں؟ کیا یہ زندگی اس طور سے مختلف نہیں ہے جس طور پر تمہاری تربیت ہوئی تھی؟''

''مجھے تو یہ تربیت دی گئی تھی کہ تمہیں اپنا فرض ادا کرتے رہنا ہے۔''

''اپنا فرض کس کے حساب سے؟ ذرا اپنے ناخنوں کو دیکھو، کتنے سمارٹ اور کتنے لمبے لمبے ہیں۔ تمہاری اماں کے حساب سے یہ نجس ہیں اور دینی تعلیم کے خلاف ہیں۔ تو آؤ اپنا فرض ادا کرو۔'' اور میں نے فوراً قینچی سنبھالی۔

زہرا نے اپنا ہاتھ ایسے کھینچا جیسے اس میں کانٹا چبھ گیا ہو''لیلیٰ یہ کیا کر رہی ہو۔''

میں ہنس پڑی''ارے زہرا! میں تو تمہیں چھیڑ رہی تھی۔''

وہ ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی''کبھی کبھی تو یہ سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ تم اس وقت سیریس ہو یا نہیں ہو۔''

وہ اٹھ کے بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھوں کو کچھ اس طرح سے خود سے ہٹا کر رکھا جیسے ان ہاتھوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سرخی لگے ناخنوں اور نازک ہاتھوں پر ایک نظر ڈالی اور ہنس پڑی۔''لیلیٰ! ایک دن آئے گا کہ یہ تمہارے ہاتھ دلہن کے ہاتھ ہوں گے اور میں ان میں مہندی لگاؤں گی۔''

''نہیں۔ ذرا سامنے آئینے میں دیکھو۔ تمہیں ایک بوڑھی کھوسٹ عورت کا چہرہ نظر نہیں آ رہا۔''

''مجھے تو ایسا چہرہ نظر آ رہا ہے جو عروسی سہرے کا انتظار کر رہا ہے۔ اگر میں دعا کر کے آئینے پہ پھونک ماروں تو مجھے اس شہزادے کا چہرہ نظر آنے لگے گا جو تمہارے چہرے سے اس سہرے کو اٹھائے گا۔''

صاف شفاف آئینے میں دکھائی دیتے چہرے ہم پر ہنس رہے تھے۔ پھر آئینے پر ایک پرچھائیں پڑی اور اسد کا عکس حیران نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

میں نے مڑ کر دیکھا اور سٹپٹا کر کہا''اسد!''

زہرا ہنسی سے دوہری ہو گئی''ارے اسد تم ہو گے، یہ تو میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔''

''مجھے عابدہ پھپھی نے بھیجا تھا کہ سلیمن کو بلا لاؤ۔'' اور یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑا۔

''ارے تھوڑا رک جاؤ نا۔'' زہرا کی آنکھیں جیسے رقص میں ہوں۔

''سوری، مجھے بہت کام کرنا ہے۔ میں تو جا رہا تھا، عابدہ پھپھی نے مجھے ادھر دھکیل دیا۔ ویسے پھر آؤں گا میں۔''

نواں باب

اس شام تو شروع ہی میں میرے ساتھ خرابی ہوگئی۔ سائرہ چچی نے میرے لباس پہ ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ طنز بھرے لہجے میں بولیں" کچھ مجلسی ادب آداب ہوتے ہیں۔ وہ تمہیں سیکھ لینے چاہئیں۔ کسی ریسپشن میں تم ایسے کپڑے تو پہن کر نہیں جا سکتیں جیسے کالج کی سہیلیوں کے ساتھ چائے پر جا رہی ہو۔"

غصے سے میرا برا حال۔ اپنی بیچارگی کا بری طرح احساس ہوا۔ لیکن زہرا نے میرے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بہت جتن کیے۔ کس کس ترکیب سے اور کیسے پیار سے اس نے مجھے رام کیا ہے۔ اس نے میرے سلسلے میں جو پروگرام سوچا تھا اس میں کھنڈت پڑ جائے، یہ تو وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی ایک ساڑھی نکال کر مجھے پہنائی۔ گلابی رنگ، اس پر سنہری ستارے بنے ہوئے۔ میرے بالوں میں کنگھی کی۔ انہیں سنوارنے کے بعد پیچھے لے جا کر گدی پر ایک گچھا بنا دیا۔ ہونٹوں پر ہلکی لپ سٹک لگا دی۔ پھر بڑے فاتحانہ انداز میں مجھے لے جا کر آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ میں تو اپنی شکل کو پہچان ہی نہیں پائی۔ یہ کوئی اور ہی لڑکی تھی جو مجھے گھور کے دیکھ رہی تھی۔

ماجدہ پھپھی، عابدہ پھپھی نے مجھے بلا بھیجا۔ دیکھنا چاہتی تھیں کہ میں زرق برق کپڑوں میں کیسی لگتی ہوں۔ نوکرانیوں نے بھی آ آ کر مجھے دیکھا۔

عابدہ پھپھی کی آنکھوں میں ایک فخر کی کیفیت تھی۔ اسد مجھے دیکھ کر حیرت و استعجاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان دونوں کے ردعمل کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔

حکیمن بوا نے مٹھی بھر مرچیں اور شکر لے کر سات مرتبہ میرے سر سے وار کر انہیں آگ میں جھونک دیا۔ یہ انہوں نے نظر بد کے خلاف دفاع کیا تھا۔

نندی کہنے لگی" بٹیا! ذرا مسکراؤ تو سہی۔ ایسی لگ رہی ہو جیسے بدلی میں چاند۔"

بس سلیمن چپ تھی اور افسردہ۔

سائرہ چچی کہنے لگیں" زہرا، لیلیٰ! ہم لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

کار ابھی چوک کے محراب دروازوں کی طرف مڑی بھی نہیں تھی کہ آسمان روشنیوں کے عکس سے دمکتا دکھائی دینے لگا۔ بارہ دری ایسی چمک دکھا رہی تھی جیسے ہیرے جواہرات سے بھری بلوریں تھچی بنی رکھی ہو

اور اس کے ارد گرد روشنیوں سے آراستہ محل دو محلے اپنی بہار دکھا رہے ہوں۔ ہر درخت میں پتوں میں چھپی روشنیاں اس طرح لو دے رہی تھیں کہ ٹہنیوں سے بنتے نازک نفیس نقش و نگار کا ایک ایک نقش اجل گیا تھا۔

ایک ہجوم اپنے شوق اور تجسس میں اس سڑک کی طرف امنڈا پڑ رہا تھا جو بارہ دری کے گرد اگرد چلی گئی تھی۔ پولیس نے بڑی مشکل سے اس ہجوم کو روکا ہوا تھا۔ سارے چوک میں زندگی کی رو دوڑی ہوئی تھی۔ ساری فضا آوازوں سے بھری ہوئی تھی۔

سفید چونا سیڑھیوں پر اور سنگِ مرمر والے چبوترے پر اس کنارے سے لے کر اس کنارے تک اور وہاں سے لے کر شیشے کے کشادہ دروں تک قالین پٹی کی طرح ایسے بچھا نظر آ رہا تھا جیسے خون کی کوئی دھار بہہ رہی ہو۔

وسیع و عریض ایوان میں روشنیوں کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔ بلوریں فانوسوں سے روشنیاں چھن چھن کر دیواروں پر آویزاں قدِ آدم آئینوں پر پڑ رہی تھیں اور اس سے ایک چکا چوند پیدا ہو رہی تھی۔ ادھر ہیرے موتی چمک دمک رہے تھے۔ ادھر کمخواب اور زربفت کی پوشاکیں اپنی جھلک دکھا رہی تھیں۔

ہماری نشستیں بالکل سامنے تھیں۔ وسط میں جو ایک بغلی رستہ تھا اس کے قریب۔ یہاں سے وہ دو تخت نما کرسیاں صاف نظر آ رہی تھیں جن پر سنہری رو پہلی بیل بوٹے کڑھے ہوئے تھے۔ ڈائس پہ قالین بچھا ہوا تھا۔ اس پر یہ کرسیاں بچھی تھیں۔ ان پر ایک چھتر سایہ کیے ہوئے تھے۔ اس چھتر پر کار چوبی کے سنہری کام والی مخمل منڈھی ہوئی تھی۔ سونے چاندی کے پتلے پتلے ڈنڈوں نے اس چھتر کو سہارا دے رکھا تھا۔

ایک تو وہ شور تھا جو لوگوں کے ہنسنے بولنے سے پیدا ہو رہا تھا، مگر یہ شور بینڈ کی آواز کے نیچے دب گیا تھا۔ یہ بینڈ چبوترے پر بج رہا تھا۔ کسی اوپیرے کے منتخب حصے پیش کیے جا رہے تھے۔ ہال میں رنگ و نور کا وفور تھا، گہما گہمی تھی۔ معززین کا مجمع تھا۔ انہوں نے کمخواب کی، ململ کی اور کار چوبی کے کام والے اونی کپڑے کی اچکنیں پہن رکھی تھیں۔ سر پہ ریشمیں پگڑیاں اور رنگین ٹوپیاں سجی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ اس زمانے کے لوگ نہیں، پرانے زمانے کی تصویروں سے نکل کر یہاں آن موجود ہوئے ہیں۔ اپنے جدی پشتی درباری لباس زیبِ تن کر رکھے ہیں۔ پٹکوں میں جن میں زر و جواہر جڑے ہوئے ہیں، تلواریں اور خنجر سجے ہیں۔ اس شان کے ساتھ وہ یہاں آئے اور ان شخصیتوں کے ساتھ جنہوں نے مغربی لباس پہنے ہوئے ہیں، گفتگو میں مصروف ہیں۔ فرنگی عورتوں نے بھاری پوشاکیں اس شان سے پہنی ہوئی تھیں کہ ان کے شانے اور پیٹھ برہنہ نظر آ رہی تھی۔ انہی میموں میں رلی ملی مٹھی بھر ہندوستانی عورتیں بھی تھیں۔ یہ ہندوستانی افسروں اور تعلقے داروں کی وہ بیگمات تھیں جو پردہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ اپنے سر ڈھانکے بیٹھی تھیں۔ ان کے زرق برق لباسوں کی چھوٹ کمرے میں جا بجا پڑ رہی تھی۔

سارے تعلقہ دارانِ اودھ، کیا امیر کیا غریب، یہاں اکٹھے تھے۔ ان میں مہاراجہ بھگتی پور بھی

تھے جن کے خالی باورچی خانے کا سالانہ خرچ لاکھوں میں تھا۔ اور شیخ قیوم علی بھی تھے جن کی مالی حیثیت بھکیتی پور کے کسی غریب کسان کی آمدنی سے کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی۔ یہ سب تعلقہ دار قریب و دور کے شہروں سے، قصبوں سے، دیہات سے اس تقریب میں میزبان بننے کی غرض سے آئے تھے۔ ایسی تقریبات، جن میں وہ مل جل کر اپنی روایتی شان و شوکت کا اور میزبانی کا مظاہرہ کر سکیں، اب کبھی کبھار ہی ہوتی تھیں۔ اور شان و شوکت کا مظاہرہ کوئی تعلقہ دار انفرادی حیثیت میں تو اب کر نہیں سکتا تھا۔ یہ اظہار اب مل جل کر ہی کیا جا سکتا تھا۔

میں زہرا کے برابر بیٹھی تھی۔ وہ اشارے کر کر کے بتا رہی تھی کہ اس کے کون کون سے جاننے والے، کون کون سی فیملی یہاں آئی ہوئی ہے۔ بیچ بیچ میں انہیں دیکھ کر کبھی مسکرا دیتی، کبھی گردن ہلاتی، کبھی اکا دکا جملہ۔

''وہ صاحب جن کی گنجی چاند ہے اور سرخ و سفید چہرہ ہے وہ ہمارے ڈویژن کے کمشنر ہیں۔ اور وہ خاتون جن کے بھوسا جیسے بال ہیں اور جو اپنے لباس میں پھٹی پڑ رہی ہیں وہ ان کی بیگم ہیں۔ ان کے برابر بیٹھے ہوئے صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل ہیں۔ ان کی بیگم کا ان کے ساتھ چکر ہے۔ انہیں دیکھ کر کوئی اس بات کا یقین کر سکتا ہے؟ تم بتاؤ، تم بتاؤ، تم یقین کرو گی؟ امیر پور والوں کی ٹوپی میں وہ جو نگ چمک رہا ہے، وہ زمرد ہے۔ کتنا بڑا ہے! کبوتر کے انڈے کے برابر کا تو ہو گا۔ مسز واڈیا بھی تو آئی ہیں۔ ان کے ساتھ بیگم وحید بھی ہیں۔ مگر کہیں پیچھے بیٹھی ہوں گی۔ بعض لوگ تو بس کسی نہ کسی طرح گھس آتے ہیں۔ اس چکر میں ساری شرم غیرت طاق میں رکھ دیتے ہیں۔ ارے وہ دیکھو، رانی شاہ پور کا موتیوں کا ہار دیکھ رہی ہو؟ کیسے پیارے موتی ہیں۔ یہ تو ان کے جہیز میں آئے ہوں گے۔ شاہ پور والوں کی شادی نیپال میں ہوئی تھی۔ نیپال والیاں جہیز ایسا بھاری لے کر آتی ہیں کہ اس کا ہم آپ تو تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی یہ بی بی سی کلاس والی ہیں۔ رانا کی داشتہ کے پیٹ سے ہیں۔ تو ان کے لیے حسب نسب والا بر تو بھاری قیمت ادا کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔

ایک تو زہرا چڑ چڑ بولے چلی جا رہی تھی کہ کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دے رہی تھی۔ پھر مجھے میرے حجاب نے بھی تو مار رکھا تھا۔ پھر بھی میں نے ادھر ادھر تھوڑی نظر ڈال ہی لی اور کچھ لوگوں کو پہچان بھی لیا کہ وہ ہمارے دادا جان کے یا چچا جان کے دوست تھے یا دوستوں کے بیٹے۔ اب تو وہ دوست ہمارے یہاں تصویروں ہی میں رہ گئے تھے۔ ان کی کہانیاں رہ گئی تھیں۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یہاں آ کر ایسا لگا کہ وہ تصویروں اور کہانیوں سے نکل کر یہاں آن موجود ہوئے ہیں۔ کنور دیورائی اور پانی گڑھ والے سید علی عباس، دونوں یک جان دو قالب تھے۔ دونوں کے باپ مل کر انگریزوں سے لڑے تھے۔ اس کی سزا انہیں یہ ملی کہ غدر کے بعد ان کی ریاستوں کا بہت بڑا حصہ ضبط کر لیا گیا۔ یہ دونوں اس وقت راجہ بلسا سے باتیں کر رہے تھے۔ راجہ بلسا کے دادا دیورائی کی ریاست میں منیم لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کی

مدد کی تھی۔ اس کے انعام میں انہیں ان کے آقا کی ریاست کا ضبط شدہ حصہ بخش دیا گیا۔ مہاراجکمار و بے سنگھ تو دیوتاؤں کی سنتان تھے۔ ان کے پرکھے وہ سورما تھے جن کا ذکر دیومالا اور قصہ کہانیوں میں آتا ہے۔ یہ خود بمبئی اور کلکتہ میں سیل سپاٹے کرتے پھرتے تھے۔ اینگلوانڈین لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے یا پھر ریس میں جا کر گھوڑوں پہ شرطیں لگاتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی نیشنلسٹ تھے۔ بر میں کھدر کی اچکن، سر پہ گاندھی کیپ، یہ ان کا مستقل پہناوا تھا۔ اس وقت وہ نوجوان نیشنلسٹ تعلقہ داروں کی ایک ٹولی کے ساتھ کھڑے تھے اور ہروان کے راجکمار سے باتیں کر رہے تھے۔ ہروان کے راجکمار نے ہارو اور بالیل میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اب وہ ایک ممتاز کانگریسی سوشلسٹ کے طور پر جانے جاتے تھے۔ رائے بہادر پشکر ناتھ نواب سبط حیدر کے سامنے کھڑے ہاتھ چلا چلا کے سر ہلا ہلا کے باتیں کر رہے تھے۔ رائے بہادر صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ انہیں پرنس آف ویلز سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل ہو گیا تھا تو اس کے بعد کتنے دنوں تک انہوں نے اپنے ہاتھ ہی نہیں دھوئے۔ نواب سبط حیدر کا حدود اربع یہ تھا کہ ان کے بزرگوں کو نوابانِ اودھ کے درباروں میں اعلیٰ مراتب حاصل رہے تھے۔ ان کے دادا حضور نے آخری تاجدار اودھ کے جلاوطن ہونے کے موقع پر طے کیا تھا کہ وہ بھی ان کے ہمراہ جائیں گے۔ مگر خود نواب سبط حیدر کا شمار برطانوی حکومت کے وفاداروں میں ہوتا تھا۔ آج کل انہیں صوبائی حکومت میں وزیر کا مرتبہ حاصل تھا۔ رانی پھول گنج بھی نظر آ رہی تھیں۔ رانی صاحب ابھی جب نو برس کی تھیں تو ان کی شادی ایک ساٹھ سالہ بیمار آدمی کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ اب ان کے بال سفیدی مائل تھے اور وہ بالکل ملکہ نظر آتی تھیں۔ ان کی رعیت انہیں بہت چاہتی تھی۔ مگر وہ ایسے رشتہ داروں میں گھری ہوئی تھیں جو موقع کی تاک میں تھے کہ اس بے اولاد بیوہ کی آنکھ بند ہو اور وہ اپنے حق کا دعویٰ دائر کر دیں۔ رانی صاحب اس وقت ایک میم صاحب کو دیکھ کر بڑی شائستگی سے مسکرا رہی تھیں۔ میم دراز قد، نک سک سے درست، بالکل ایسی جیسے کوئی اعلیٰ نسل کی ایسی گھوڑی ہو کہ پتا کھڑکا اور وہ بھڑکی۔

کون مجھے دیکھتا کہ میں کیسی لگ رہی تھی۔ روشنیوں کی چکا چوند مجھے پریشان کر رہی تھی اور یہ احساس ستا رہا تھا کہ میں نے مانگے کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اس سے میں کچھ اکڑی ہوئی تھی۔

ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ بینڈ پر ''گاڈ سیو دی کنگ'' کی دھن بجنے لگی۔ ایک جلوس اپنی آب و تاب کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ سب کھڑے ہو گئے اور جب تک ہز ایکسی لینسی اور ان کی لیڈی شاہانہ کرسیوں پر بیٹھ نہیں گئے، یہ لوگ کھڑے رہے۔

ایسوسی ایشن کے صدر نے خطبۂ استقبالیہ پڑھنا شروع کیا: ''ہم تعلقہ دارانِ اودھ اپنی جگہ ایک طبقۂ خاص ہیں جسے خصوصی مراعات حاصل ہیں۔۔۔۔۔'' بیگم وحید بغلی رستے سے پرے والی قطار میں تھیں۔ انہوں نے مسز واڈیا کو ٹہوکا اور مڑ کر ایک تضحیک آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ہماری چچی جان کو دیکھا۔

ہماری چچی جان کی نظریں مقرر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے کہے ہوئے ایک ایک جملے پر وہ تائید میں سر ہلا رہی تھیں۔ اس کی تقریر میں تعلقہ داروں کے سارے معاملات و مسائل کا، ان کے عزائم اور آدرشوں کا، ان کی خدمات و فرائض کا احاطہ کیا گیا تھا۔ یہ ایک طویل خطبہ تھا۔

میرے برابر میں جو ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا اس نے ہلکے ہلکے خراٹے لینے شروع کر دیے تھے۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے معززین نے اسے ٹہوک کر جگایا۔

''ہم اس سے آگاہ ہیں کہ ہمارے کسانوں کی خوشحالی ہماری خوشحالی ہے۔۔۔۔۔'' اس مقام پر پہنچ کر مقرر کی آواز میں ایک لہک پیدا ہو گئی۔

آواز میں یکسانیت کی وجہ سے ایک ریں ریں والی بیرنگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ روشنیوں کی چمک دمک نے عجب اثر کیا۔ دماغ جیسے جہاں تہاں سے خالی ہو گیا ہو۔ خالی گوشوں کا درمیان اس طرح پُر ہوا تھا کہ تالیاں۔ پھر وائسرائے کا جواب۔ مزید تالیاں، مزید لفاظی۔ سونے چاندی کی بنی پٹی جس میں خطبۂ استقبالیہ سجا کر صاحب بہادر کی خدمتِ عالی میں پیش کیا گیا تھا، مزید تالیاں۔ ادھر زہرا بول رہی تھی ''لیلیٰ! تم کہاں کھوئی ہوئی ہو؟ آنکھیں کھلی ہیں اور سو رہی ہو۔ ہم چبوترے پہ چلیں گے۔ وہاں کھائیں پئیں گے اور آتش بازی دیکھیں گے۔ نصیر نے ایسا انتظام کیا ہے کہ ہماری نشستیں خصوصی مہمانوں کی نشستوں کے آس پاس ہی ہوں گی۔ آتش بازی دیکھنے کے لیے یہ بہت اچھی جگہ رہے گی۔ میرے قریب رہنا۔ ہجوم بہت ہے۔''

لیکن ڈائس سے دروازوں کی طرف جاتے ہوئے زہرا میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میری ساڑھی ایک کیل میں پھنس گئی تھی۔ بس اس ایک پل میں زہرا، نصیر، چچا، چچی سب ہی میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دروازوں میں داخل ہونے کے لیے لوگ دھکم پیل کر رہے تھے۔ میں اس دھکم پیل میں دھکے کھاتی بارہ دری کے عقب والے بے سائبان والے ٹیرس کے قریب جا پہنچی۔ یہاں دھکم پیل اس لمبی چوڑی میز تک پہنچنے کے لیے تھی جو ٹیرس کی ایک سمت میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بچھی ہوئی تھی۔ سفید وردیوں میں ملبوس بیرے میز کے عقب میں مستعد کھڑے تھے کہ اگر کسی کا جام خالی ہو جائے تو اسے دوبارہ بھر دیں اور ایک سینڈوچ، مٹھائیاں، پھلوں اور خاص ہندوستانی ڈشوں میں سے کوئی چیز ختم ہو جائے تو اس کی دوبارہ فراہمی کی جائے۔

ایک دراز قد موٹا تازہ شخص جس نے سیاہ اچکن پہنی ہوئی تھی چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ ''قطرہ دو قطرہ سے میرا کیا بھلا ہو گا۔ مجھے جام بھر کر دو۔'' پھر گلاس کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ وہ شخص دڑوک رہا تھا ''گلاس نہیں ہیں تو پھر مجھے بوتل دو۔ حرامزادے، تیری یہ مجال۔ میں نے چندہ دیا ہے۔ یا تو میں یہ ساری بوتلیں ڈکوس لوں گا یا پھر انہیں چکنا چور کر دوں گا۔'' اور پھر چھنا چھن بوتلیں ٹوٹنے لگیں۔

اس لمبے تڑنگے شخص کو دو آدمی پکڑ دھکڑ کر کے میز سے پرے لے جانے کی کوشش کر رہے تھے، مگر وہ ان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔

مجھے کوئی جاننے والا دکھائی نہیں پڑ رہا تھا۔ ڈر کے مارے میری تو جان نکل گئی۔ جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دوں۔ میں بھیڑ میں دھکے مارتی ہوئی ہال کی طرف چلی۔ میں پردہ گیلری کی طرف جانے کی کوشش میں تھی۔

ایک ہوائی سَن سے اُڑ کر ہوا میں جا کر پھٹ گئی۔ پھر دوسری ہوائی چلی۔ پھر تیسری۔ ان کے پھٹنے سے آسمان میں رنگ برنگے ستاروں نے خم دار شکلیں اختیار کر لی تھیں۔ میں چیخ مارنا چاہتی تھی مگر چیخ میرے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ میں اندھا دھند سب سے دور والے دروازے کی طرف دوڑنے لگی۔ اس دروازے سے کوئی نکل رہا تھا۔ میں اس سے جا ٹکرائی۔ بس لحظہ بھر کے لیے میں اس کے بازوؤں میں تھی۔

''آئی ایم سوری!''

''سوری!''

ایک ہی وقت میں ہم دونوں کی زبان سے وہی ایک کلمہ نکلا۔

''ارے آپ تو رو رہی ہیں۔ بات کیا ہے؟ میں کوئی مدد کر سکتا ہوں؟''

''وہ آدمی۔۔۔۔۔۔ نشے میں دھت تھا۔'' میں نے نشے میں دھت آدمی پہلے کبھی کا ہے کو دیکھا تھا۔

''وہ بڈھا جو پھول کے کپا بنا ہوا ہے۔'' وہ ہنسنے لگا ''وہ بیچارہ بے ضرر آدمی ہے۔ اتنا ہی بے ضرر جتنے اس کے ہاتھی بے ضرر ہیں۔''

''میں تو ڈر گئی۔ میں اصل میں اپنی کزن کو ڈھونڈ رہی تھی۔'' میری کوشش یہ تھی کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ چلا جائے۔

''میں آپ کی مدد کروں؟''

''شکریہ!'' میں اس بھیڑ میں اس کا بازو تھام کر چلنے لگی۔ وہ بازو تھام کر میں کتنا محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ گھورتے لوگوں کی اب مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔

روشنی کا ایک درخت رنگ برنگی ٹہنیوں اور دہکتے پھلوں سے لدا پھندا اکھڑا بھڑک رہا تھا۔ ستارے بڑے بڑے پہیوں کی شکل میں گردش کر رہے تھے۔ ہوائیاں سن سن کرتی اڑتیں اور آسمان کی بلندیوں میں پہنچ کر رنگ برنگے ستاروں کی صورت بکھر جاتیں۔

''دیکھو کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔'' وہ دھکم پیل کرتا ٹیرس کے اس کنارے پر جا پہنچا جہاں شہتیروں پہ بیلیں چڑھی ہوئی تھیں ''یہاں سے اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ دیکھ لو۔ پھر چل کر تمہاری کزن کو

تلاش کرتے ہیں۔"

"جہاں خصوصی مہمان بیٹھے ہیں بس انہی کے آس پاس کہیں ہوگی۔ کوئی وقت نہیں ہوگی، آسانی سے مل جائے گی۔"

آمنے سامنے آتش بازی سے لیس دو مورچے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے پر رنگ برنگے ستاروں سے بھرے ناشپال پھینکے۔ ان کے چھوٹنے سے پہلے روشنی ہوئی، پھر اندھیرے میں کچھ چنگاریاں لرزتی نظر آئیں اور سارے سبزہ زار میں دھواں بھر گیا۔ پٹاخے چھوٹتے، چرخ کھاتے اور پھر پھٹ جاتے۔

میں نے اپنے بازو پر اس کے حرارت بھرے ہاتھ کو محسوس کیا اور ہم اپنے دائیں ٹیرس کے تنگ راستے پر مڑ گئے۔

ایک بڑا سا خدنگا بلندی پر جا کر پھٹا اور سارا ٹیرس اس کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔

"لیلیٰ!" نصیر کی آواز سنائی دی "لیلیٰ۔"

میں نے ارد گرد نظر ڈالتے ہوئے وضاحت کے طور پر کہا "یہ میری کزن کے میاں مجھے پکار رہے ہیں۔"

خدنگے کی روشنی ماند پڑ چکی تھی۔ میں کسی قدر تامل کے ساتھ اس آواز کی طرف چلی۔ ایک دوسرا خدنگا بلندی پر جا کر پھٹا اور چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔

"تمہیں وہ نظر آ رہے ہیں؟"

"جی! آپ نے میری بہت مدد کی۔ شکریہ!"

"میرے لیے تو یہ خوشی کا باعث تھا۔"

پہلی مرتبہ ہم نے ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

پھر روشنی ماند پڑ گئی۔

"گڈ نائٹ اور بہت بہت شکریہ!"

"گڈ نائٹ!"

اس کے بعد جب میں زہرا کے پاس بیٹھی آتش بازی دیکھ رہی تھی تو ایک نوجوان مسکراتا چہرہ میرے تصور میں گھوم رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ بال جن پہ ٹوپی ترچھی لگی ہوئی تھی۔

موجود لمحے کھسکتے چلے جا رہے تھے، اسی طرح جس طرح پٹاخوں کی روشنی ماند پڑتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن کچھ لمحے تک گئے تھے۔ وہ ان سب لمحوں پر چھا گئے تھے جو جگمگا اٹھتے اور پھر تاریکی میں ڈوب جاتے۔

دسواں باب

استقبالیے کے دوسرے دن وائسرائے کو یونیورسٹی جا کر نئے ہوسٹل کا سنگِ بنیاد رکھنا تھا۔ یہ آخری سرکاری تقریب تھی۔ اس کے بعد وائسرائے کو واپس دلی جانا تھا۔

اس تقریب کو تو جشن کے ہفتے کا نقطۂ عروج بننا تھا۔ زہرا اس تقریب میں شرکت کے لیے دن گن رہی تھی۔ اس کے بعد تو پھر اسے اسی بے رنگ قصبے میں جا کر رہنا تھا جہاں اس کا میاں ضلع مجسٹریٹ لگا ہوا تھا۔ جب اس نے یہ سنا کہ اس تقریب کے منسوخ ہو جانے کا امکان ہے تو اس پہ تو اوس پڑ گئی۔

وائسرائے کے دورے کے خلاف پبلک میں اور خاص طور پر طلبا میں بہت جذبات بھڑکے ہوئے تھے۔ مخالفت میں کوئی مظاہرہ تو نہیں ہوا تھا۔ پولیس نے پورے شہر میں اتنے سخت حفاظتی انتظامات جو کر رکھے تھے تو مظاہرہ بیشک نہ ہوا ہو لیکن پبلک میں کوئی جوش و خروش بھی نہیں تھا۔ وائسرائے کی آمد کے دن بڑا رنگا رنگ جلوس نکلا۔ فوجی بینڈ بج رہا تھا، سپاہی مارچ کر رہے تھے۔ مارچ کرنے والوں میں پیدل دستہ بھی تھا اور گھڑسوار پولیس بھی تھی۔ شان و شوکت سے سجے ہوئے گھوڑے اور ہاتھی جلوس کی شان کو دوبالا کر رہے تھے۔ جن سڑکوں سے یہ جلوس گزرا ان سڑکوں پر تماشائی قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ متجسس لیکن بالکل خاموش۔ بس اینگلو انڈین سکولوں کے بچے تالیاں بجا رہے تھے اور جو یونین جیک ان کے ہاتھوں میں تھما دیئے گئے تھے۔ انہیں لہرا رہے تھے۔ اور ہاں کرائے کے ٹٹو جنہیں ان راستوں پر کھڑا کیا گیا تھا خیر مقدمی نعرے لگا رہے تھے۔

ہفتے کے شروع ہی میں یہ پتہ چل گیا تھا کہ طلبا کے ایک گروہ نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ جب وائسرائے بہادر سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے یونیورسٹی آئیں تو ان کے خلاف مظاہرہ کیا جائے۔ لیکن پولیس اور یونیورسٹی کی انتظامیہ دونوں کو یقین تھا کہ صورتحال ان کے قابو میں رہے گی۔ لیکن ایک رات پہلے جو تازہ اطلاعات موصول ہوئیں وہ کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔

صبح سارے وقت ہمارے چچا جان میٹنگوں میں مصروف رہے اور بحثیں کرتے رہے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک صورتحال کے سنبھل جانے کا گمان ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی کے اربابِ بست و کشاد کو پکا یقین تھا کہ انہوں نے مختلف طالب علم لیڈروں کو رام کر لیا ہے۔ ساتھ میں حفاظتی انتظامات بھی مزید سخت کر

دیئے گئے۔

زہرا نے اطمینان کا سانس لیا۔شہر کے اکلوتے یورپین ہیئر ڈریسر سے اس نے جو وقت لیا تھا اسے منسوخ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

زہرا گھر سے تو خوش خوش گئی تھی لیکن آئی اس عالم میں کہ خوف سے برا حال تھا۔ ویسے مجھے یہ بتانے کے لیے بہت بیتاب تھی کہ وہاں ہوا کیا۔

سارے کام بخیر وخوبی ہوئے۔ تقریریں ہوئیں، سنگ بنیاد رکھا گیا۔ گجرے تقسیم ہوئے۔ اب وائسرائے کی واپسی کا وقت تھا۔ بینڈ نے '' گاڈ سیو دی کنگ '' کی دھن بجائی۔ لوگ کھڑے ہونے لگے۔ اچانک ان مختلف گوشوں سے جہاں طلبا بیٹھے تھے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔

'' بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔''

'' ٹوڈی بچے ہائے ہائے۔''

دیکھتے دیکھتے چاروں طرف کالے پرچم دکھائی دینے لگے۔

پھر تو ایک کھلبلی مچ گئی اور ہراس پھیل گیا۔ پروفیسر، پروکٹر اور سادہ لباس پہنے ہوئے پولیس والے سب طلبا کی طرف لپکے۔ وائسرائے اور گورنر کو اور ان پارٹیوں کو جو ان کی معیت میں آئی تھیں بڑی پھرتی سے وہاں سے نکالا گیا۔ طلبا گیٹ کی طرف چلے۔ نعرے اب بھی اسی طرح لگا رہے تھے۔

زہرا نے گیٹ سے گزرتے گزرتے کار میں سے یہ منظر دیکھا کہ بھگدڑ مچی ہوئی ہے اور پولیس اور طلبا میں مقابلہ ہو رہا ہے۔

زہرا وہی کہہ رہی تھی جو اس کے میاں کا کہنا تھا کہ جب نیشنلسٹ لیڈر رسول نافرمانی کا پرچار کریں تو امن وامان کیسے برقرار رہے گا اور قانون کی عملداری کیونکر قائم رہے گی۔ ہمارے چچا جان اس خیال سے برہم تھے کہ یونیورسٹی اور صوبائی سیاست کے درمیان، جو کسی نہ کسی طور ایک نازک سا توازن چلا آ رہا تھا، وہ درہم برہم ہو گیا۔ عابدہ پھپھی کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ کوئی زخمی تو نہیں ہوا۔ ماجدہ پھپھی کو اسد اور زاہد کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ادھر میں اس سارے قصے سے لاتعلقی محسوس کر رہی تھی۔ میری تو گویا یہ کیفیت تھی کہ جیسے میں خالی آڈیٹوریم میں کرسی سے بندھی بیٹھی ناٹک دیکھ رہی ہوں۔

اگلے دن اتوار تھا۔ شہر کے چپے چپے میں گھڑسوار اور پیدل پولیس گشت کر رہی تھی۔ پولیس کی نفری آج بہت بڑھا دی گئی تھی۔

پیر کے دن یونیورسٹی کا بڑا حصہ کشیدگی اور بے چینی کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ فضا میں اتنی کشیدگی تھی کہ آس پاس کے کالج اور سکول بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ سننے میں آ رہا تھا کہ بہت سے طلبا کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے، بہت سوں کو گرفتار کر لیا گیا اور یہ کہ پولیس نے یونیورسٹی میں گھس کر طلبا کو مارا پیٹا۔ اور یہ ایسا

فعل تھا جس کا انہیں اختیار حاصل نہیں تھا۔ یہ بھی پتہ چلا تھا کہ یونیورسٹی میں وائسرائے کی آمد کے دن سفید کپڑوں والے آدمیوں نے نیشنلسٹ اور لیفٹ سے تعلق رکھنے والے طالب علم لیڈروں کو اغوا کیا اور شہر سے دور لے جا کر ان راستوں پر چھوڑ دیا جہاں کوئی آمد و رفت نہیں تھی۔

طلبا نے دھمکی دے ڈالی کہ وہ جلوس بنا کر مارچ کرتے ہوئے کونسل چیمبر جائیں گے۔ لوگوں سے انہوں نے تائید و حمایت کی اپیل کی تھی۔ سارے سکولوں اور کالجوں کے گیٹ پر جا کر انہوں نے پکٹنگ کی۔

ہمارے کالج میں ایک خصوصی اجتماع ہوا۔ پرنسپل نے ہمیں ہمارا فرض یاد دلایا۔ یہی کہ حصول علم کے جذبے کو سیاسی جذبات سے اور جماعتی سیاست سے الگ رکھا جائے اور آخر میں یہ بھی جتا دیا کہ جو اس اصول سے روگردانی کرے گا اسے کالج سے خارج کر دیا جائے گا۔

جب ہم اس الٹی میٹم پر تبادلۂ خیال کے لیے اکٹھے ہوئے تو نیتا تو سخت طیش میں آئی ہوئی تھی۔

''ہمیں بزدل اور غدار بننے کی تربیت دی جاتی ہے۔ جو تعلیم آزادیٔ اظہار کو نہیں مانتی وہ تعلیم کس کام کی۔''

نادرہ نے سوال کیا کہ ''جو طالبہ یا طالب علم اخراج کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں اسے غدار کہنے کا آپ کو کیا حق ہے۔''

''بھئی ہماری سمجھ میں تو کچھ آ نہیں رہا۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا ''کیا واقعی یہ کوئی بہت بڑا مقصد ہے؟''

نیتا بھڑک اٹھی ''یہ سیدھا سادھا مسئلہ وفاداری کا ہے۔ ہمیں اپنے ساتھی طلبا کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرنا چاہیے۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو مقصد کو ضعف پہنچاتے ہیں۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو بے یقینی کا شکار ہیں۔ وہ اچھا ہوتا کہ آپ لوگوں نے مکمل کر مخالفت کی ہوتی۔''

''میں کرتی ہوں۔'' جون بولی ''میں بالکل تمہارے خلاف ہوں۔ مجھے تو یہ سارا قصہ بہت بھونڈا نظر آتا ہے۔ قومی ترانے کی توہین کرنا ایسا ہی ہے جیسے بچے کسی کا منہ چڑانے لگیں اور زبان نکال کر دکھائیں۔''

''بھئی یہ کس کا قومی ترانہ ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کوئی دوسرا قومی ترانہ ہے تمہارے ذہن میں؟'' جون نے طنز بھرے لہجے میں کہا ''تم تو آپس میں مل کر اس بارے میں فیصلہ کرنے کی پوزیشن ہی میں نہیں ہو۔ قومی پرچم اور قومی ترانے کے سلسلے میں نادرہ اور نیتا میں مستقل ٹھنی رہتی ہے۔

''لیکن تمہارے قومی ترانے کے سلسلے میں ہمارا موقف مشترکہ ہے۔'' نادرہ نے جواب دیا۔

جون بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ کہنے لگی ''میں نے تو تمہیں یہ کہتے سنا ہے کہ ہندو جیسی حکمرانی کریں گے اس سے تو انگریز بہتر حکمران ہیں۔''

''میں نے یہ نہیں کہا تھا۔'' نادرہ پھٹ پڑی ''تم جان بوجھ کر میرے لفظوں کو توڑ مروڑ کے

چیش کر رہی ہو۔"

میں نے دخل دیتے ہوئے کہا "حکمرانوں کے درمیان انتخاب کرنے کا نام تو آزادی نہیں ہے۔"

"مقابلے میں سامراجی ہوں تو پھر اس انتخاب کو آزادی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔" نیتا نے نکڑا لگایا۔

جون کا غصے سے منہ لال ہو گیا۔ کہنے لگی "یاد رکھو کہ جیسے لوگ ہوتے ہیں ویسے ہی انہیں حکمران ملتے ہیں۔ آپ لوگ متحد کیوں نہیں ہوتے اور کیوں اپنے آپ کو اس قابل نہیں بناتے کہ۔۔۔۔۔"

"بات ختم بھی کرو۔" رومانہ نے بیچ میں ٹانگ اڑائی "تمہیں باتوں کے سوا اور کچھ بھی آتا ہے۔ اگر تمہیں اور کچھ کرنا نہیں ہے اور باتیں ہی کرنی ہیں تو پھر کچھ اچھی اچھی باتیں کرو۔"

نیتا نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چلتے ہوئے بولی "میں کچھ کر کے دکھاؤں گی۔"

گیارہواں باب

اگلے دن میں گھر ہی پر رہی۔ ناشتہ کیے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ چچا جان کی طرف سے میری طلبی ہو گئی۔ اپنے مطالعے کے کمرے میں وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ سامنے چمڑا چڑھی دفتری میز تھی۔ چچا جان نے کرسی پر گھومتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ان کے تیور کچھ بگڑے نظر آ رہے تھے۔ ڈر کے مارے میری کچھ ایسی کیفیت ہو گئی جیسے میرا جوڑ جوڑ بکھر گیا ہے۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ آج تم کالج نہیں گئیں، کوئی خاص مشکل تھی یا ڈے سکالروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ کالج نہ آئیں؟''

''جی نہیں۔ اصل میں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' میں بات ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تمہارے کالج میں طالبات کی کیا کیفیت ہے؟''

''ہمیں خبردار کیا گیا تھا کہ تحریک میں حصہ نہیں لینا ہے۔۔۔۔۔''

''تحریک؟'' چچا جان بیچ میں بول اٹھے۔ انہیں غصہ آ گیا تھا ''کیسی تحریک؟ یہ تو نری غنڈہ گردی تھی۔ لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ طلبا اس وقت کیا محسوس کر رہے ہیں۔''

اب میں نے ذرا مضبوطی سے بات شروع کی ''بہت سوں کی کیفیت تو یہ ہے کہ انہیں جس طرح سوچنے کا حکم دیا گیا ہے اس کے خلاف کوئی بات کرنے سے ڈرتے ہیں۔''

''س بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''سوری! مجھے اپنے سلسلے میں تو اس سوال کی تکمی نظر نہیں آتی۔''

''کیوں؟ تمہیں کیا آزادیٔ فکر حاصل نہیں ہے۔'' انہوں نے طنز بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''مجھے اصل میں آزادیٔ فعل و عمل میسر نہیں ہے۔''

انہوں نے گہرا سانس لیا اور مجھے ایسے دیکھا جیسے مجھے ٹٹول رہے ہوں۔ ''تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جب تک ذہن پختہ نہیں ہو جاتا اور قوتِ فیصلہ کی پوری طرح نشوونما نہیں ہو جاتی اُس وقت تک آزادیٔ فعل و عمل پر نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''مگر میری آزادیٔ عمل تو کچھ ٹھٹھر کے رہ گئی ہے۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ میرا جذبۂ بغاوت

میرے خوف پر غالب آتا جا رہا تھا۔

انہوں نے تیز لہجے میں کہا" آزاد ذہن کا میرے دل میں بہت احترام ہے لیکن جب تک تم میری سرپرستی میں ہو اور جب تک میں تمہیں اس لائق نہیں سمجھتا اس وقت تک تمہیں میری ہدایات پر چلنا ہوگا۔ میں کسی ایسے فعل کی اجازت نہیں دے سکتا جسے میں درست نہیں سمجھتا۔"

"حامد چچا، مجھے اپنی پوزیشن کا اچھی طرح احساس ہے۔ مجھے اس کام کے لیے بہت اچھی طرح سدھایا گیا ہے۔"

لحظہ بھر کے لیے ان کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ پھر وہ میز پر رکھی فائلوں پہ جھک گئے اور میری طرف دیکھے بغیر بولے" اب تم جا سکتی ہو۔"

میرے قدم نادانستہ عابدہ پھپھی کے کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ میرے اندر جو سوال پک رہے تھے ان سے نجات مجھے وہیں جا کر مل سکتی تھی۔ آخر آدمی کیا مانے کیا نہ مانے۔ آخر میں زہرا سے مختلف کیوں ہوں۔ میرے ساتھ آخر گڑبڑ کیا ہے۔

میں نے سارا دن سب سے الگ تھلگ اپنی دنیا میں گزارا۔ ان دیواروں کے بیچ جن پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور نارنجی رنگ کا بوگن بیلیا اور لال گلاب اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ زردی مائل سبز لان جاڑے کی دھوپ میں دمک رہا تھا۔ اس دھوپ کے اثر سے ٹھنڈی صاف ہوا میں، جس میں ہلکی سی نیلاہٹ بھی تھی تھوڑی گرمائی آ گئی تھی۔

اچانک دور سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں اور اس پرسکون غنودہ فضا میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ یہ آوازیں ایک تند و تیز آہنگ میں ڈھلی محسوس ہو رہی تھیں۔ جوں جوں وہ قریب آئیں توں توں ایسا لگا کہ ایک ہی توانا غصیلی اعتماد سے معمور جوان آواز ہے جو بہت سے گلوں سے نکل کر بلند ہو رہی ہے۔

یہاں برآمدے میں کوئی بولا تو کچھ نہیں لیکن سب چونک پڑے تھے۔ میں اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف دوڑی اور چھت پہ جا پہنچی۔ سلیمن میرے پیچھے پیچھے آئی۔

"بٹیا! بات کیا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟"

ہم جھانک کر نیچے سڑک پہ دیکھنے لگے جیسے ہمیشہ یہاں سے گزرتے جلوسوں اور پریڈوں کو دیکھا کرتے تھے۔ کوؤں میں بھی کھلبلی مچ گئی تھی۔ ایک غول کا غول کائیں کائیں کرتا اوپر اٹھا اور اشوک کے اونچے پیڑوں کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ بانسوں سے بنی ایک آرائشی محراب سڑک پہ گری پڑی تھی۔ اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے تھے اور دور تک جھنڈیاں، جن پر خوش آمدید لکھا ہوا تھا، ہوا میں اڑتی پھر رہی تھیں۔

سب مل کر ایک لَے کے ساتھ آوازیں بلند کر رہے تھے اور گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہے

تھے: ''انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد۔ فرنگی راج مردہ باد، فرنگی راج مردہ باد۔ آزادی کی جے۔ آزادی کی جے۔''

سڑک جیسے جی اٹھی ہو، ان نوجوانوں کے طفیل جو مکر لینے پہ تلے نظر آتے تھے۔ ان کے مارچ کرتے قدم اور احتجاجی نعرے، بس یوں لگتا تھا کہ کوئی اُمنڈتا ہوا سمندر ہے یا گرجتا طوفان ہے۔ آگے آگے لڑکیوں کی ایک ٹولی تھی۔ کیا ان میں نینا بھی ہوگی؟ یہ لوگ مارچ کرتے ہوئے ہماری نظروں کے سامنے سے گزرے اور پھر نظروں سے اوجھل ہوتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ ان کی آوازیں بھی فضا میں تحلیل ہوتی چلی گئیں۔

اسد کہاں ہے؟ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' سلیمن پوچھنے لگی۔

''کیا ہو رہا تھا؟'' میرے واپس آنے پر عابدہ پھپھی نے سوال کیا۔

''طلبا کا جلوس تھا۔ کونسل چیمبر کی طرف جا رہا تھا''

ماجدہ پھپھی بڑے درد کے ساتھ کہنے لگیں ''آج کل نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کیوں مصیبت مول لینے پہ تلے رہتے ہیں۔''

''ارے یہ نگوڑے جلے پاؤں کی بلی ہیں۔ نچلے بیٹھ ہی نہیں سکتے۔'' حکیمن بوا اٹھتے اٹھتے بولیں ''چائے کا وقت ہو رہا ہے۔ سلیمن اٹھ۔ باتیں بگھانے کا یہ وقت نہیں ہے۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔ وقت جیسے رینگ رہا ہو۔ میں نے جو دیکھا تھا اور جو سنا تھا اس سے میرے اندر ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کبھی نینا اور اسد کا خیال آتا۔ کبھی اپنی بے عملی کا احساس ستانے لگتا۔ میں آج اسد کا اسی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی جس بے چینی سے اب سے کئی برس پہلے اس موقع پر انتظار کیا تھا جب شہر میں فساد ہو گیا تھا اور وہ کئی گھنٹوں تک واپس نہیں آیا تھا۔

آخر زاہدا اسد کو سہارا دے کر لایا اور اسی، عابدہ پھپھی والے کمرے میں لے کر آیا جہاں ہم چائے پینے کے بعد آ کر بیٹھ گئے تھے۔ اسد کو اس حال میں دیکھ کر مجھے ایسا کوئی تعجب بھی نہیں ہوا۔

''اسد!'' عابدہ پھپھی کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔

''اللہ رحم کرے۔'' ماجدہ پھپھی بھی چیخ پڑیں۔

''اسد بھیا!'' حکیمن بوا رقت بھرے لہجے میں بولیں ''ارے یہ کیا افتاد پڑ گئی۔''

''اسد!'' میری تو چیخ نکل گئی۔ اب جب میں اسے سہارا دے کر بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اسد کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ اس کے سر کے گرد جو رومال بندھا ہوا تھا اس سے خون رس رہا تھا۔

''آئی ایم سوری۔ پلیز مجھے معاف کر دیجئے۔ میں ہمیشہ آپ لوگوں کے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دیتا ہوں۔'' اسد کی مسکراہٹ میں ایک ملال کا رنگ جھلک رہا تھا۔ اس وقت اس کی کیفیت اُس بچے کی سی تھی جس کے لہجے میں اس ڈر سے لجاجت آ گئی ہو کہ کہیں اس کی پٹائی نہ ہو جائے۔

''جلیمن بوا!'' عابدہ پھپھی احکامات دینے لگیں ''تھوڑا گرم پانی اور روئی کا پھویا لے کر آؤ۔ اور پٹی باندھنے کے لیے کوئی چھوٹا سا کپڑا بھی۔''

''مجھے پتہ تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔'' زاہد بولا ''اسی لیے میں ان کے پیچھے لگا رہا۔۔۔۔''

''بیٹا! کس کلموئے نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔'' ماجدہ پھپھی رقت بھرے لہجے میں بولیں۔

اسد مسکرایا۔ بولا ''میرا سر ایک پولیس والے کی لاٹھی کی زد میں آ گیا۔''

ماجدہ پھپھی نے سرزنش کے لہجے میں کہا ''تم کیوں اپنے سر مصیبت لیتے پھرتے ہو۔ آخر تم اتنے سرکش کیوں ہو؟''

''میں تو کوئی سرکش ورکش نہیں ہوں۔'' وہ شرارتی لہجے میں کہنے لگا۔

''غلط سلط مقاصد پر سردھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔'' زاہد پھٹ پڑا ''ذرا یہ بھی غور کریں کہ جناب کا عدم تشدد کتنا موثر ہے۔ موثر کیسے ہو، وہ تو انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ پولیس نے تو خیر تشدد کیا ہی، مگر ان پر جو اینٹیں برسائی گئیں، کیا وہ عدم تشدد تھا؟''

''بیچ میں ہمیشہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا ایمان بہت زیادہ پختہ نہیں ہوتا۔ ان کے شکوک وشبہات سے ان کے یہاں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔'' اسد نے بہت سکون کے ساتھ جواب دیا۔

''جی، میں نے آپ کو ایک پولیس والے سے ہاتھا پائی کرتے دیکھا تھا۔'' زاہد بھی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''تم یہ بھول رہے ہو کہ وہاں لڑکیاں بھی تھیں اور ان کی حفاظت کرنا بہت ضروری تھا۔''

میں بے چین ہو کر بیچ میں بول اٹھی ''ان لڑکیوں میں کہیں نیتا تو نہیں تھی؟''

''آپ نے جو اس کا حلیہ مجھے بتایا تھا اگر وہ درست ہے تو آپ کی سہیلی ہی کی یہ عنایت ہے'' اور اس کے ساتھ اس نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا ''موٹی سی لڑکی تھی۔ بہت سرپھری تھی۔ لگتا تھا کہ اس پر جن سوار ہے۔ پولیس سے جا بھڑی۔ میں اس کی ڈھال بننے کا مطلق اہل نہیں تھا۔'' وہ مسکرایا۔

''کیا اسے بھی چوٹیں آئی ہیں۔۔۔۔۔ جیسے تمہیں آئی ہیں؟''

''اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ اس کے بھی خون نکلا ہے یا نہیں تو خون وون تو مجھے نظر آیا نہیں۔ لیکن پولیس نے کوئی ایسی شرافت بھی نہیں دکھلائی۔ آخر ان کے ڈنڈے سونٹے چڑیوں کے پروں کے بنے ہوئے تو نہیں ہوتے۔''

میرا جی ڈوبنے لگا۔

''بہت بول چکے۔'' عابدہ پھپھی بولیں ''ادھر میری طرف آؤ۔''

سر اور چہرے پر جو گھاؤ آ گئے تھے انہیں پونچھ کر پٹی باندھ دی۔ خون بہنے سے تو یہی احساس ہوتا تھا کہ گھاؤ گہرے ہیں۔ مگر وہ ایسے گہرے تھے نہیں۔ ویسے اسد پر نقاہت طاری تھی۔ صورت پیلی پڑ گئی تھی۔

ماجدہ پھپھی اور حکیمن بوا نے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ اے اللہ ان نئی تانتی والوں کو سرکشی کے گناہ سے بچا کے رکھ۔

''اسد! اب تم آرام کرو۔'' عابدہ پھپھی بولیں ''میں اپنے ڈریسنگ روم میں تمہارے لیے بستر بچھوائے دیتی ہوں۔''

اسد نے بہت عذر کیے مگر انہوں نے اس کے عذر ایک کان سے سنے دوسرے کان سے اڑا دیے۔ بولیں ''میرے خیال میں ہم تمہیں اکیلا چھوڑ دیں اور آرام کرنے دیں۔''

جب سائرہ چچی اور زہرا مسز واڈیا کی چائے اور برج کی پارٹی سے واپس آ گئیں اور اسد کے بارے میں خبر سنی تو سائرہ چچی عابدہ پھپھی سے کہنے لگیں ''آپ کے بھائی جان کو پتہ چلے گا تو وہ تو بہت ناراض ہوں گے۔''

''انہیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' عابدہ پھپھی نے آہستگی سے اپنی تجویز پیش کر دی۔

''اسد نے پھر وہی حرکت کی۔'' زہرا کسمساتے ہوئے بولی۔ لیکن جب اسے احساس ہوا کہ میں اسے تک رہی ہوں تو وہ اور طرف دیکھنے لگی اور بولی۔ ''چوٹ زیادہ تو نہیں آئی۔''

رات ہوتے ہوتے فساد اور پھیل گیا۔ حکم یہ تھا کہ گلیوں سڑکوں پر پانچ سے زیادہ لوگ جمع نظر نہ آئیں۔ طلبا اور ان ہمدردوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ پھر سیاسی گروپ بھی ان کے ساتھ اس نافرمانی میں شامل ہو گئے۔ دس بجے تک دو مختلف علاقوں میں فائرنگ ہوئی۔ اس کے بعد شہر میں چوبیس گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا۔ صرف سول لائنز اور کنٹونمنٹ کے علاقے اس سے آزاد تھے۔

کرفیوں کی وجہ سے لوگوں کو جو دقتیں پیش آئیں ان سے رائے عامہ حکام کے خلاف اور زیادہ ہو گئی۔ اس خیال سے کہ فساد کی آگ بڑے پیمانے پر نہ بھڑک اٹھے، لازم ہو گیا تھا کہ سمجھوتے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ سارے دن کشیدگی رہی۔ شام ہوتے ہوتے تصفیہ ہو گیا۔

پولیس پر ہلہ بولنے والوں کی قیادت جن دو طلبا نے کی تھی ان کا تو یونیورسٹی سے اخراج ہو گیا۔ باقیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ فائرنگ کے خلاف جس میں کچھ بے گناہ تماشائی بھی زخمی ہوئے تھے تحقیقات کا حکم دیا گیا۔

ویسے تو حامد چچا فائرنگ کے اقدام پر حکومت کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے لیکن جن کارروائیوں کی وجہ سے فساد کی صورت پیدا ہوئی وہ اس کے اتنے خلاف تھے کہ اپنی مخالفت میں کوئی لچک پیدا کرنے کے

لیے تیار نہیں تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ انہوں نے سائرہ چچی کو ہسپتال بھیجا کہ وہاں جا کر زخمیوں کی عیادت کرو۔ آنے والی آئینی تبدیلیوں کی پرچھائیاں پڑنی شروع ہو گئی تھیں اور انتخابات کی سیاست کی تو ویسے بھی بہت نزاکتیں اور پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔

جب ہم ان واقعات پر آپس میں باتیں کر رہے تھے تو میں نے اسد سے پوچھا "نیتا تو میری بے عملی پر مجھے بہت طعنے دیتی ہے۔ تم کیوں طعنہ نہیں دیتے۔"

"اس لیے کہ عمل کی تحریک آپ کے اندر سے شروع ہونی چاہیے۔ طعن و تشنیع سے تو کسی کو عمل پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

"اسد! تم اپنی عمر سے بڑھ کر سوچتے نظر آتے ہو۔ جوانی اور ایسی باتیں؟"

وہ ہنسا "میں کیا کبھی جوان بھی تھا؟"

"میں تمہیں دیکھ کے بہت خوش ہوتی ہوں۔ اسد تم مجھے پسند ہو۔"

"آپ بھی مجھے بہت پسند ہیں۔"

اس نے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی دوستی میں مجھے بہت سکون مل رہا تھا اور محفوظ ہونے کا ایک احساس۔ اسی وقت زاہد آن دھمکا۔ اس کے آنے سے وہ ساری کیفیت ہی تتر بتر ہو گئی۔

"امیر آپ سے ملنے آیا ہے۔"

"اسے اندر بلا لو۔" اسد نے خوش ہو کر کہا۔

میں چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیلیٰ، آپ کیوں جا رہی ہیں۔ آپ کون سا پردہ کرتی ہیں۔" اسد کہنے لگا۔

"اگر میں یہاں رکی رہی تو عابدہ پھپھی کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی۔"

میں اندر جانے والے دروازے کا پردہ اٹھانے لگی تھی کہ میرے کان میں ایک آواز پڑی "ہیلو اسد! یار بڑے مرد میدان ہو۔" میں نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا۔ بس پل بھر کے لیے ہماری آنکھیں ملیں، چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا، اور میں بچ بچ بھاگ کھڑی ہوئی اور اندر صحن میں نکل آئی۔

وہ چہرہ، وہ آواز، خاموش رات میں اڑتے ستاروں کے صورت چھنتے بکھرتے خد گئے۔ اور اب میرے کان ایک نام سے شناسا ہو گئے تھے اور اسد کے واسطے سے ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

لیکن اسد کو ابھی اس بات کا پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ اس لیے کہ میرے وجود سے باہر اس بات کے کوئی معنی نہیں تھے، نہ میرے وجود سے باہر اس کی کوئی توضیح ہو سکتی تھی۔ جیسے کوئی برہنگی کی صورت ہو کہ اس پر پردہ پڑا رہنا چاہیے۔ میری ذات کے عناصر سے بھی اسے چھپا رہنا چاہیے۔

بارھواں باب

نیتا کے گھر جانے سے پہلے میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کے گھر واپس جانے کا انتظام بہت چپ چپاتے کیا گیا۔ ایسا اہتمام کیا گیا کہ کالج میں اس کا چرچا نہ ہو۔ رومانہ اور جون نے جو اسی ہوسٹل میں رہتی تھیں اس کے ساتھ مل کر سامان بندھوایا۔ وہ بتاتی تھیں کہ جاتے وقت وہ بہت ہشاش بشاش دکھائی دے رہی تھی۔ کسی طرح کی ندامت کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

جاتے ہوئے وہ میرے لیے ایک رقعہ لکھ کر چھوڑ گئی جسے رخصتی رقعہ کہنا چاہیے۔ اس رقعے کی آخری سطریں تھیں "تم مجھے بہت یاد آؤ گی۔ اختلاف کرنے کا اپنا ایک لطف ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ نادرہ سے کہنا کہ میں ابھی تک پُرامید ہوں کہ اس کے خیالات میں تبدیلی آئے گی۔ یا کم از کم اتنا ضرور ہوگا کہ وہ ان خیالات کو اپنے فعل و عمل کی بنیاد نہیں بنائے گی۔ تمہارے متعلق مجھے امید ہے کہ ایک دن آئے گا جب تمہارے یہاں فکر و عمل کا جو تضاد ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ رومانہ کے متعلق میں سمجھتی ہوں کہ جیسی پیاری اب ہے ویسی ہی رہے گی اور اب کی طرح آئندہ بھی کوئی غم نہیں پالے گی۔ میں تم سب کی ممنون ہوں۔ تمہارے سنگ رہ کر میری سمجھ میں آیا کہ دوستی کیا ہوتی ہے۔"

نیتا کی کمی ہمیں بہت کھٹکتی تھی۔ اب بحثوں میں ہماری کیفیت یہ تھی کہ جیسے اب ہم کسی ایسی جگہ قدم رکھنے والے ہیں جو وہاں نہیں ہے اور ہم لڑکھڑا جاتے۔

گھر واپس جانے کے دو دن بعد نیتا زخموں کی تاب نہ لا کر اچانک چل بسی۔ پولیس کے لاٹھی چارج میں اس کے دماغ پر چوٹیں آئی تھیں۔ ان چوٹوں نے اس کی جان لے لی۔ اس کی موت میرے نزدیک شہادت کا مرتبہ رکھتی تھی۔

پھر رومانہ ہمیں چھوڑ کر چلتی بنی۔ جس بات کا اسے مدت سے کھٹکا لگا ہوا تھا آخر وہ ہو کر رہی۔ اس کے گھر سے شادی کے لیے اس کا بلاوا آ گیا۔ وہ جو عقاب صفت بیگم صاحبہ اپنے بھتیجے کے لیے دلہن ڈھونڈتی پھرتی تھیں ان کی نظرِ انتخاب بالآخر رومانہ پر پڑی اور رومانہ کے ماں باپ کو انکار کی جرأت نہیں ہوئی۔ انکار کا مطلب تو یہ ہوتا کہ وہ اپنے حاکم کی حکم عدولی کر رہے ہیں۔ رومانہ کے نصیب میں عیش و عشرت کی زندگی کی سزائے قید لکھی گئی۔

پھر ہماری پھپھیوں اور زہرا کے رخصت ہونے کا وقت سر پہ آن کھڑا ہوا۔ میں نے کوشش کی کہ یہ سوچوں ہی مت کہ عابدہ پھپھی سے جدائی ہونے والی ہے۔ اس سے تو مفارقت کی گھڑی کل کے آتے آج سے سر پہ سوار ہو جائے گی۔

سائرہ چچی نے بہت اصرار کیا کہ ابھی بھی کیا جلدی ہے، تھوڑے دن اور ٹھہرو، مگر ان کا اصرار بھی رسمی قسم کا تھا۔ ان کی تو زندگی کا طور ہی ایسا تھا کہ اس کے حساب سے رشتہ داروں کے مقابلے میں دوستوں واقف کاروں کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

ہمارے چچا، چچی کے برخلاف اپنی پسند ناپسند کو چھپانے کے قائل نہیں تھے۔ مشترکہ خاندانی زندگی انہیں پسند نہیں تھی، اور اپنے اس احساس کو انہوں نے چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس زندگی کے جھمیلے، خلاف عقل پابندیاں، نامعقول قسم کے تقاضے، اور نج کی زندگی کا فقدان، ان باتوں کا ان پر ردعمل یہ ہوا کہ وہ مغربی طرز زندگی کے مداح بن گئے جس میں بہت نظم و ضبط ہوتا ہے اور آدمی کی نجی زندگی کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ نہ صرف مداح ہوئے بلکہ انہوں نے زندگی کا وہی طور اپنا لیا۔ یوں انہوں نے رشتوں ناتوں کے بندھن میں جکڑے ہوئے اپنے کنبہ کو اپنا مخالف بنا لیا تھا اور اس باعث اس سرداری اور اس مقتدر حیثیت سے محروم ہو گئے جو ان کے ابا جان کو حاصل تھی۔ لیکن اس محرومی کی تلافی کہیں اور جا کر ہوئی۔ سرداری کے شوق نے اس مختلف قسم کے شوق قیادت کا روپ اختیار کر لیا تھا جو قبیلے اور خاندان کی تنگنائے کو عبور کر کے ایک وسیع تر دنیا میں اپنی تکمیل کے لیے کوشاں تھا۔ تو خاندان کے اندر جوان کی مخالفت تھی اس کی تو انہیں پروا نہیں تھی، لیکن خاندان سے باہر کی دنیا میں جوان کی مخالفت ہو رہی تھی اس کے بارے میں انہیں بہت تردد تھا۔ اس وقت جب ان کی بہنیں رخصت ہو رہی تھیں تو ان کی جدائی کے خیال سے زیادہ کچھ اور اہم معاملات تھے جن کا خیال انہیں پریشان کر رہا تھا۔ طلبا کے پیدا کردہ مسائل ابھی پوری طرح طے نہیں ہو پائے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ ہمارے برابر والا مکان فروخت ہو گیا ہے۔

یہ مکان پچھلی دو پیڑھیوں سے اپنے دوستوں کی ملکیت چلا آ رہا تھا اور اس کے وسیع و عریض احاطے ہمارے گھر کی پردہ داری کی ضمانت بنے ہوئے تھے لیکن اب راجہ بھیم نگر نے اس حویلی کو بیچ ڈالا تھا۔ وہ ایک عرصے سے مقروض چلے آ رہے تھے۔ لیکن ان سے پہلے ان کے پتا بھی تو مقروض چلے آتے تھے۔ اور ایسا بھی نہیں تھا کہ ان کے قرض خواہوں نے ان کے گلے پر چھری رکھی ہو۔ وہ سود کی ادائیگی سے زیادہ کا تو تقاضا نہیں کر رہے تھے۔ مگر سود کی ان ادائیگیوں ہی نے تو انہیں کھوکھلا کر دیا تھا اور ان کے قرض خواہوں کا گھر دولت سے بھر دیا تھا۔ تو اب راجہ صاحب کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ اپنا گھر ہریش پرشاد اگروال کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔ اگروال جی نے راجہ صاحب کے دوسرے قرض خواہوں سے بھی معاملے کر کے ان کے دیے قرض اپنے حساب میں سمیٹ لیے تھے۔

اگروال میری سہیلی سیتا کے پتاجی تھے اب وہ اپنے پتاجی کی طرح خالی قرضے نہیں دیتے تھے۔ اب تو وہ بہت بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ ایک سوتی کپڑے کے کارخانے کی سیلنگ ایجنسی، ایک کاغذ کے کارخانے کی فیجنگ ایجنسی اور اینٹوں کے کتنے ہی بھٹے خرید لیے تھے۔ جانے کتنے تعلقہ داروں کی شان و شوکت ان کے قرضوں کے مرہونِ منت تھی۔ کانگریس کے فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیتے تھے لیکن حکومت کے حامیوں میں بھی شامل تھے۔

بہنیں جب رخصت ہونے لگیں تو ہمارے چچا جان بہت افسردہ نظر آ رہے تھے۔ اور ہماری ماجدہ پھپھی اس خیال ہی سے آبدیدہ ہو گئیں کہ ان کے بھائی بہنوں کی جدائی پر غمگین ہو گئے ہیں۔

تیرہواں باب

جس روز یہ لوگ رخصت ہو رہے تھے اُس روز مجھے بتایا گیا کہ سلیمن بھی ان کے ساتھ جا رہی ہے۔ میں نے بہت احتجاج کیا اور سلیمن بہت روئی دھوئی لیکن نہ میرے احتجاج کا کوئی اثر ہوا نہ سلیمن کے رونے دھونے کا۔

جب وہ سب چلے گئے تو میں خالی کمروں اور ویران آنگن میں ایسے بھٹکتی پھرتی تھی جیسے کوئی سزا کاٹ رہی ہوں۔ یہ خاموشی بے آباد گھروں والا مردہ سکوت نہیں تھا۔ اس خاموشی میں سونے بن کی کیفیت بھی تھی اور ان آوازوں کی تھرتھراہٹوں کا بھی رنگ بھرا ہوا تھا جو ابھی ذرا دیر پہلے تھم گئی تھیں۔

نندی میرے کمرے میں پھسکڑا مارے بیٹھی تھی اور میری راہ تک رہی تھی۔

''وہ لوگ سلیمن کو لے گئے۔ بھلا کون انہیں روک سکتا تھا۔ آپ کے ارادے نیک ہوا کریں اور آپ کے دل میں ہمدردی ہوا کرے، اس سے تو وہ رکنے والے نہیں تھے۔ بس اللہ کسی کو غریب نہ بنائے اور عورت نہ بنائے۔ اس سے تو کہیں اچھا یہ ہے کہ میرے باپو کا جو اڑیل ٹٹو ہے انسان وہ بن جائے۔ اس ٹٹو کو کوئی اپنی جگہ سے ہلا کے تو دیکھے۔ ایسا اڑتا ہے کہ اسے مار مار کے ادھ موا کر دو، مجال ہے کہ اپنی جگہ سے ہل جائے۔ ہاں کبھی کبھی اپنے کھروں سے زمین کو کھرچنا شروع کر دیتا ہے۔''

''انہوں نے مجھے کوئی وجہ بھی نہیں بتائی۔''

''بٹیا! یہ ایسی باتیں ہیں جو آپ کے جاننے کی نہیں ہیں۔ ہم غریب غربا کو تو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ کوئی ہمیں بتائے۔ ایسی باتوں سے ہمیں بچا کر کون رکھے گا؟ کوئی بھی نہیں۔ ہم تو خود ہی اپنے پہریدار ہیں۔ بھلا اپنا پہریدار بھی کوئی ہوا ہے؟''

''جب میں اس سے پوچھتی تھی کہ اری تجھے چپ کیوں لگ گئی تو وہ کچھ بولتی بتاتی ہی نہیں تھی۔''

''گدھی کہیں کی۔ سمجھ رہی تھی کہ وہ سوئرا اس سے بیاہ کر لے گا۔ اس صاحب کے بچے کو میز پر برتن لگانے تو آتے نہیں ہیں، لیکن یہ خوب آتا ہے کہ کسی لڑکی کو کیسے خراب کیا جاتا ہے۔ اب وہ پیٹ میں اس کا بچہ لیے پھر رہی ہے۔''

''اچھا!؟ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی ۔۔۔۔۔ کتنی خوفناک بات ہے۔ تمہارا مطلب ہے کہ غلام

علی۔ لیکن اسے تو کسی نے کچھ بھی نہیں کہا۔''

''اسے کوئی کچھ کیوں کہتا۔ صاحب سے کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا تھا کہ آپ کے لاڈلے نے کیا کرتوت کیا ہے۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ وہ تو صاف مکر جاتا۔ اگر میں کہتی کہ یہ کیسا مردوا ہے یا سلیمن بتاتی تو کوئی مجھ پہ یا اس پہ اعتبار کرتا؟''

''تو بھی۔۔۔۔۔''

''لیلیٰ بٹیا! آپ کو کیا پتہ ہے کہ ہمیں زندگی میں کیا کیا بھگتنا پڑتا ہے۔ ہم تو ہر مردوے کی ہوس کا نشانہ بنتے ہیں۔ اس عقل کی اندھی نے میری بات کان دھر کے سنی ہوتی تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ میں اسے بتاتی کہ کوئی مرد اس لائق نہیں ہوتا کہ عورت اس سے پیار کرے اور اس پہ اعتبار۔ بٹیا! یقین جانو میرا ابا جو میرے لیے کوئی بھی بڈھا ٹھڈا بر لے آئے، میں اس سے جھٹ پٹ دو بول پڑھا لوں گی۔ بس شرط اتنی ہوگی کہ وہ مجھے آرام سے رکھے۔''

''بیچاری سلیمن۔۔۔۔۔ میرے تو سان گمان میں بھی نہیں۔۔۔۔۔''

''اس بیچاری کی عقل پہ تو پتھر پڑ گئے تھے۔ لیکن آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ وہ اسے کسی نہ کسی کے پلے باندھ ہی دیں گے۔ کوئی بھی بوڑھا کھوسٹ مل جائے گا جسے جوان باندی کی ضرورت ہوگی کہ اس کے لیے ہنڈیا پکائے اور اس کے پاؤں دابے۔ لیکن پہلے اسے اس کی سزا تو مل لے۔ میں تو خوب سمجھتی ہوں۔ اسے بھی بتا دیتی۔ لیکن آپ کا کیا خیال ہے، وہ بھلا میری سنتی؟ میں نے کسی کی سنی تھی؟ کوئی بھی کسی کی سنتا ہے؟ نہیں بٹیا نہیں۔ قسمت کا لکھا پورا ہو کے رہتا ہے۔ اور ہمارے اندر جو شیطان بیٹھا ہوا ہے اس سے بھاگ کے کہاں جائیں گے۔ اف بٹیا! میرا جی بیٹھا جا رہا ہے۔''

''نندی! میرے دل کا بھی یہی حال ہے۔ آج رات تو میرے پاس رہ جا۔ اور دیکھ رو ئیو مت، اس لیے کہ اگر کہیں میں نے رونا شروع کر دیا تو عمر گزر جائے گی اور آنسو نہیں تھمیں گے۔''

خواب کا اتھاہ اندھیرا، جیسے میں اکیلی کسی ریگستان میں چلی جا رہی ہوں جس کا کوئی انت نہیں ہے۔ جیسے ٹھنڈی یخ ہوا چل رہی ہے اور ریت اُڑ اُڑ کر میرے چہرے پہ آ رہی ہے۔ اور جیسے عابدہ پھپھی کی آواز ہے۔ مجھے پکار رہی ہیں۔ پھر جیسے سلیمن نے اپنا بچہ میری گود میں دے دیا۔ لیکن وہ تو کپڑوں کی پوٹلی تھی جسے نندی نے بغل میں داب رکھا تھا۔ میں بہت تھک گئی تھی اور پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ پھر اسد میری طرف بڑھا۔ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ لیکن میں اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ تک پہنچ ہی نہیں سکی۔ پھر اس کا چہرہ بدل گیا اور میں پکارنے لگی ''امیر!'' اور آسمان پر سورج ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔

نندی مجھ پہ جھکی ہوئی تھی ''بٹیا! روؤ مت۔ تم اکیلی نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

تیسرا حصّہ

پہلا باب

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ میرے چچیرے بھائی انہی دنوں وطن واپس آئے تھے۔ ان دونوں میں کمال بڑا تھا۔ مجھ سے وہ پانچ سال بڑا تھا۔ سلیم اس سے ایک سال چھوٹا تھا۔ میں اب اُنیس کی ہو رہی تھی۔

کمال۔۔۔۔۔ اونچا قد، دبلا پتلا، ڈھیلا ڈھالا، بدن لچکیلا۔۔۔۔۔ ماں پر پڑا تھا کہ ان کی طرح ان کا رنگ بھی زرد مائل تھا اور بڑی بڑی ہلکی بھوری رنگت والی آنکھیں تھیں۔ جب بحث کرتا تو ایک گھبرائے سے انداز میں آنکھیں مچکانے لگتا۔ جب انگلستان میں تھا تو وہاں جو نسلی تعصب کے مظاہر دیکھے اس سے وہ اس معاملے میں بہت حساس ہو گیا تھا۔ لیے دیے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اسی لیے دبے پن نے بڑھتے بڑھتے ایسی شکل اختیار کر لی کہ اس کے یہاں ایک جھجک پیدا ہو گئی تھی۔ سکول میں بھی اور جب کیمبرج میں پہنچا تو وہاں بھی جو بھی اس سے ملتا اسے اس سے اُنس ہو جاتا۔ اس وجہ سے کہ ایک تو وہ کھیلوں میں بہت اچھا تھا، دوسرے یہ کہ طبیعت کا سخی تھا۔ کچھ دنوں تک وہ ڈھلمل یقین رہا کہ وکیل بنے یا نہ بنے، آخر کو وکالت کا خیال چھوڑ کر باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انڈین سول سروس میں چلا گیا۔

سلیم ناٹے قد کا تھا۔ تھوڑا موٹا بھی تھا اور ست الوجود بھی۔ وہ باپ پر پڑا تھا۔ انہی کی طرح گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئیں اور چوڑا دہانا۔ ذہن متجسس پایا تھا۔ رایوں میں مضبوطی تھی۔ طبیعت کا کھلا ڈلا تھا۔ کھل کر ہنستا تھا، ڈٹ کر کھاتا تھا۔ کھیلوں میں پھسڈی تھا اس لیے کیمبرج میں پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ وہ تو بس اوسط درجے کا طالب علم بن کر رہ جائے گا۔ اس سے بچنے کی صورت یہ نکالی کہ موصوف دانش ور بن گئے۔ کتابیں پڑھ کر مارکسیت بگھارنی شروع کر دی۔ بال بڑھا لیے، ڈاڑھی رکھ لی، روسی قمیص، اس پہ سرخ ٹائی، یہ پہناوا تھا۔ کمرے کو سرخ پرچموں اور مارکس اور لینن کے مجسموں سے سجا لیا۔ ہیپر ویٹ سٹالن کی ایک مورتی تھی۔ پھر حضرت ایک حسین مہ جبین ایرانی لڑکی پہ ریجھ گئے۔ پکے مسلمان بن گئے۔ بحثیں کرنے لگے کہ اسلام اشتراکیت ہی کی ایک سنوری ہوئی روحانی شکل ہے۔ ایرانی لڑکی نے ایک امریکی کروڑ پتی سے بیاہ رچا لیا اور یہ حضرت اب نیشنلسٹ بن گئے۔ پیشہ چننے کا وقت آیا تو بغیر کسی ہچر مچر کے بیرسٹر بن گئے۔

ویسے تو دونوں بھائی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے لیکن چونکہ دونوں گھر سے دور رہے تھے اس لیے ان میں کچھ باتیں مشترک بھی تھیں۔ انگلستان کی زندگی سے انہوں نے ایک بات یہ سیکھی تھی کہ جذباتی

معاملات میں لیے دیئے رہتے تھے۔ والدہ صاحبہ اپنے مدت سے دبے ہوئے مادرانہ جذبات کی نکاسی اس طور کرتیں کہ ان پر خوب صدقے واری ہوتیں۔ ادھر سے سرد مہری دکھائی جاتی۔ بیٹوں کی اس روش سے وہ سخت نالاں تھیں۔

ہم جلدی آپس میں گھل مل گئے۔ میری زندگی کا طور بدل گیا۔ میری پھپھیوں نے تو خیر زنان خانے میں ایک مقید زندگی بسر کی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ میں بھی اتنی ہی سخت پابندیوں میں زندگی گزار رہی تھی۔ بس فرق اتنا تھا کہ میرے گرداگرد جو فصیلیں کھڑی تھیں وہ نظر نہیں آتی تھیں۔ ہاں پھر یوں ہوا کہ کوئی ایک کھڑکی یہاں کھل گئی، پھر کوئی ایک دروازہ وہاں وا ہو گیا، پھر کبھی کوئی ایک پردہ سرک گیا۔ لیکن باہر پوری ایک دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ بس ہماری کوتاہ نظری نے اسے کوتاہ بنا دیا تھا۔ ہمارے دادا کے انتقال کے بعد کچھ مزید کھڑکیاں کھل گئیں اور پہلے کی طرح آدھی پونی نہیں بلکہ پوری کھل گئیں۔ لیکن میرے باہر اب بھی دنیا بہت وسیع نظر آتی تھی۔ میں نے تو اپنے اردگرد اپنی چھوٹی سی ایک دنیا خود تخلیق کر لی تھی۔

بہر حال اب مجھے کھینچ کر باہر لایا جا رہا تھا۔ زور دیا جا رہا تھا کہ تماشائی بن کر ایک طرف مت کھڑی رہو۔ اس کھلی دنیا میں شرکت کرو۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ جو میں نے ایک نجی پناہ گاہ بنائی تھی وہ جوں کی توں تھی کہ اگر کبھی پسپا ہو کر پناہ لینے کی ضرورت پیش آ جائے تو یہاں پناہ لی جا سکے۔

گرمی کا زور بڑھتا چلا جا رہا تھا جو جوڑ جوڑ میں اتر رہی تھی۔ آنکھیں جیسے جلنے لگی ہوں۔ گرمی انتڑیوں تک میں سرایت کر گئی تھی۔ آسمان یوں دکھائی دیتا جیسے سیسے کی بھاری سل ہو۔ درختوں کے لیے ان کے پتے بوجھ بن گئے تھے۔ کبھی کبھی لُو کا جھکڑ چلتا تو ان پتوں میں مرے مرے سے انداز میں ایک ہلچل پیدا ہوتی۔ اور اسی کے ساتھ وہ گرد میں بری طرح اٹ جاتے۔ ہر کونے کھدرے میں، ہر درز میں گرد اٹی نظر آتی۔ ہر چیز کے اوپر گرد کا ایک غلاف سا چڑھا دکھائی پڑتا۔ دن میں کمروں کو بند کر لیا جاتا کہ اندھیرا ہو جاتا۔ گھومتے ہوئے پنکھوں سے جو ہوا نکلتی وہ بھی جلتی بلتی ہوتی۔ دیواروں پہ چپکی چھپکلیاں اپنی تکتی آنکھوں کے ساتھ بالکل ساکت نظر آتیں اور اچانک یوں اوجھل ہو جاتیں جیسے کسی سازش کے تحت غائب ہوئی ہیں۔

شام پڑے لوگ گھروں سے نکل پڑتے کہ اس وقت تو گھروں کمروں کوٹھریوں کی دیواریں تندور کی طرح تپنے لگتی تھیں۔ گھروں سے نکل کر کھلی جگہوں کی طرف لپکتے۔ گلیوں میں، سڑکوں پر، سبزہ زاروں میں۔ اس وقت تو انہیں مقامات میں وہ پناہ ڈھونڈتے تھے۔ غروب آفتاب اور طلوع آفتاب کے درمیان کے اوقات میں تھوڑا سا چین میسر آ جاتا۔ مگر پھر یہ اوقات بھی مختصر ہوتے چلے گئے اس لیے کہ گرمی ان اوقات میں بھی سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔

یہ وقت پہاڑی مقامات پہ جانے کا تھا۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے کمال اور سلیم کو حسن پور سے بھی تو متعارف کرانا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ چلی۔ حسن پور کا ایک پھیرا اور ہو گیا۔ لیکن اب کے پھیرے میں میں

نے یہ محسوس کیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ حسن پور سے میرا رشتہ بدل گیا ہے۔ اب میں آہستہ آہستہ اپنی محصور دنیا سے باہر رہی تھی۔ بہت سی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ بہت سے لوگوں سے مل جل لی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حسن پور کے بارے میں میرے محسوسات میں فرق آ گیا۔ اب ان پر ایک احساسِ جرم کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب سے پہلے تو میری آنکھوں پر جذبات کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس پردے کے پیچھے سے ہی یہاں کی چیزوں کو دیکھتی تھی۔ اب میں نے یہاں مفلسی اور نجاست دیکھی، دکھ بیماری دیکھی، یہ دیکھا کہ انسانی جانیں کس طرح برباد ہو رہی ہیں۔

وہاں پہنچنے کے دن شام کو غروب آفتاب کے بعد کمال اور سلیم کو بڑے والے برآمدے میں لا کر جائیداد کی دیکھ بھال کرنے والوں کے بیچ بٹھایا گیا۔ فوراً ہی دو بوڑھے سپاہی ان کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔ باقی دوسرے سپاہی ان سپاہیوں کے پیچھے قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ان سب نے لمبے لمبے نوکدار بھالے سنبھالے ہوئے تھے۔ مٹی کے تیل والے لیمپ جل رہے تھے جن کی روشنی منتظر کسانوں کے محنتی جسموں اور ہاتھوں پر یا آندھیوں اور دھوپ سے جھلسے ہوئے چہروں اور ہاتھ پیروں پہ پڑ رہی تھی۔ ایک ایک کر کے بوڑھے جوان آتے، جھک کر سلام کرتے اور ہاتھ بڑھا کر مٹھی میں دبا چاندی کا روپیہ نذر کرتے۔ سلامی کا یہ طریقہ ہمارے دادا جان کے وقتوں سے چلا آ رہا تھا۔ کمال اور سلیم روپے کو ہاتھ لگاتے اور سپاہی اسے اپنا مال جان کر رکھ لیتے۔

زنان خانے کے اندر باہر مرد عورتیں بچے بھرے ہوئے تھے۔ دور پرے کے عزیز رشتہ دار بھی حسن پور سے، حسن پور کی قریبی بستیوں گاؤں سے کھنچ کھنچ کر آئے تھے۔ اس موقع پر یہاں آنا ایک فرض بھی تھا اور ساتھ میں تجسس بھی تھا کہ بابا جان کے گھرانے کے جو دو نونہال سمندر پار گئے تھے اور اب اپنے لوگوں میں واپس آئے ہیں انہیں چل کر دیکھیں تو سہی۔

جب میلاد شریف ہو چکا اور دعا پڑھی جا چکی تو میراسنوں نے آمد کی خوشی کے گیت گانے شروع کر دیئے۔ جب مردوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا تو شریفن نے اپنے نوخیز انگریزی آقاؤں کی تفریحِ طبع کی غرض سے انگریزی گانوں کی نقلیں شروع کر دیں۔ عورتوں اور بچوں نے کمال اور سلیم کے گرد ہجوم کر رکھا تھا۔ خوش ہوتے، ہنستے اور انہیں تکنے لگتے۔ پھر ہنستے اور پھر انہیں تکنے لگتے۔

دس برسوں کی جدائی بھی کوئی جدائی ہے۔ صدیوں سے جو رشتہ ناتا چلا آ رہا تھا اس نے گھڑیوں میں اس جدائی کو چاٹ لیا۔

سارے دن اور کوئی کام نہیں تھا۔ بس کھانا پینا اور سونا۔ قیامت کی گرمی تھی۔ دھوپ اور لُو میں باہر کیسے نکلتے۔ اندر اندھیرے کمروں میں بند بیٹھے رہتے۔ پانی میں تر بتر خس کی ٹٹیاں لگی ہیں۔ خس کی مہک، ساتھ میں سونے جیسی رنگت والے پکے پکے آموں اور پیلے پیلے خربوزوں کی خوشبو کہ قریب ہی ڈھیر سارے

رکھے نظر آتے۔

سلیم اپنے ریکارڈ بجاتا رہتا۔ کمرے کی غنودآمیز فضا میں جاز کی اجنبی آواز گھل مل جاتی۔

میں ان مرحوموں کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہوتی جن کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لیے ہم یہاں آئے تھے اور جن کا خون ہماری رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ ان کے بعد آنے والی نسلوں نے کہ روایات کی امین تھیں انہیں اپنی یادوں میں زندہ رکھا۔ کیا ہمارے اجنبی خیالات اور اجنبی طور طریقے انہیں قعر گمانی میں دھکیل دیں گے؟ یا اس بہانے انہیں اپنی زندہ نسل سے نجات حاصل ہو جائے گی اور زندوں کو ان کے شکنجے سے رہائی مل جائے گی؟

اس عمر میں میرے لیے ہر بات ایک سوالیہ نشان پر آ کر ختم ہوتی تھی۔

دوسرا باب

پہاڑیوں کے بیچ جو ہمارا گھر تھا اب کی گرمیوں میں وہ مجھے زیادہ حسین دکھائی دیا۔ بات یہ تھی کہ اب کے میں اسے کمال اور سلیم کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں تو اس گھر کی عادی چلی آتی تھی، لیکن کمال اور سلیم تو ابھی اس کے عادی نہیں ہوئے تھے۔ وہ تو ایک زمانے کے بعد یہاں آئے تھے۔ یادیں ان کے یہاں اس رنگ سے پھوٹ رہی تھیں جیسے پٹاخے چھوٹ رہے ہوں اور ایسے ظہور کر رہی تھیں جیسے دھوپ میں پھول کھل رہے ہوں۔ کسی پل انہیں دیکھ کر گمان ہوتا کہ دو بچے ہیں جو اپنے پرانے ٹھکانوں کو ڈھونڈ نکالنے پر خوشی سے پھولے نہیں سمارہے اور کسی گھڑی احساس ہوتا کہ یہ دو ایسے نوجوان ہیں جو اپنی موروثی روایت سے پیوست ہونے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔

روز صبح کو ہم سواری کرتے اور اردگرد پھیلے ہوئے پہاڑیوں کے سلسلے کی طرف نکل جاتے۔ آسمان، سورج، جھیل پر اور پہاڑیوں پر پھیلی ہوئی روشنی، پہاڑی سلسلوں کی ہیئت، درختوں میں سرسراتی اور پانی سے اٹکھیلیاں کرتی ہوا، ان سب کو ہم دیکھتے، محسوس کرتے اور گھنٹوں ایک حسیاتی قسم کی مسرت سے سرشار رہتے۔

باقی دن گھر والوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ ان کے ماں باپ نے اپنی طرف سے ان پر کوئی ضابطۂ حیات تو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی، ہاں گرمیوں کے موسم میں یہ جو پہاڑی مقام پر فراغت کے دن گزارے جارہے تھے تو اس میں یہ تقاضا شامل تھا کہ کسی نہ کسی سماجی سانچے کو اپنانا چاہیے۔ سائرہ چچی اس پر زور دیتی تھیں کہ سماجی آداب اور فرائض کو بجالانا چاہیے۔ حامد چچا کے لیے یہ موسمی سیر محض کوئی سوشل ہولی ڈے قسم کی چیز نہیں تھی۔ جو پارٹیاں ہوتیں، جو کھانا پینا ہوتا، جو برج کی بازیاں ہوتیں، ان سب پر آنے والے الیکشن کی پرچھائیاں پڑتی نظر آتیں۔

چونکہ کمال صرف ایک مہینے کی چھٹی پر آیا تھا اس لیے اس کے اماں ابا نے یہ طے کیا کہ بیٹوں کی خاطر موسمی سیر و تفریح معمول سے تھوڑا پہلے شروع کر دی جائے۔

بعد میں جب بھی مجھے وہ دن یاد آئے جو میں نے چچا چچی کے ساتھ گزارے تھے تو مجھے ایک طنز کا احساس ہوا، ان معنوں میں کہ وہ دن اس ماحول کے آئینے کی حیثیت رکھتے تھے جس میں میں بسر کر رہی تھی۔

اس ماحول کو اقدار کے تصادم کی عکاسی کے لیے بڑے مسائل کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ کتنی چھوٹی چھوٹی بے وقعت باتوں میں یہ عکاسی ہوتی تھی۔ کسی پارٹی کا انتظام سائرہ چچی کے حساب سے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جس شان سے حامد چچا کسی سیاسی مہم کی منصوبہ بندی کرتے تھے اسی شان سے ہماری چچی پارٹی کی منصوبہ بندی کرتی تھیں۔ ایسی بات نہیں تھی کہ تین سو مہمانوں کے کھانے پینے اور تفریح کا انتظام مشکل نظر آتا ہو۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ یاد کیسے رکھا جائے کہ مجلسی ادب آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسے مدعو کرنا اور کسے مدعو نہیں کرنا۔ یہ سوچ سوچ کر ہی ان کی بھوک غائب ہو جاتی تھی اور مزاج چڑچڑا ہو جاتا تھا۔ اتنی شدت سے اس مسئلے پر سوچتیں کہ آخر بھنا جاتیں۔ بہت یاد کرنے کے بعد انہیں کچھ نام یاد آتے اور وہ پریشان ہو کر کہنے لگتیں "بھیم نگر والوں کا کیا کیا جائے۔ کلکتے کی کسی چلتی پھرتی سے بیاہ رچا کے بیٹھ گئے ہیں اور اب ان کی ضد یہ ہوتی ہے کہ دونوں بیویوں کو ساتھ لے کر پارٹی میں آئیں گے۔ اب اس کا کیا علاج ہے۔ اس طرح کے طرزِ عمل کو کیسے درگزر کیا جائے۔"

"تم نے ولی الدین شیخ کا نام بھی لکھا ہے۔ نہیں لکھا ہے تو لکھ لو۔" حامد چچا نے ٹکڑا لگایا۔

ولی الدین ویسے تو وکیل تھے، مگر انہیں اپنی وکالت کے مقابلے میں سیاست زیادہ منافع بخش کاروبار نظر آتی تھی۔ جدھر اقتدار کے امکانات نظر آتے تھے، ادھر ہی ان کے سیاسی خیالات ڈھلک جاتے تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہی جماعتوں کے لیڈروں سے یارانہ گانٹھ رکھا تھا۔ اثر و رسوخ والی شخصیتوں کی چاپلوسی اور چاکری کر کر کے انہیں شیشے میں اتار لیتے۔ پھر ان کے وسیلے سے اپنے حامی پیدا کرتے۔

"وہ آدمی" سائرہ چچی چونکیں "وہ آدمی جس نے لیڈر بننے کے چکر میں شیعہ سنی فساد کرایا تھا۔ سب کو پتہ ہے کہ اس شخص نے پہلے تو خفیہ طور پر لوگوں کو فساد پر اکسایا اور پھر فساد رکوانے کے لیے میدان میں آیا اور ہیرو بن گیا۔"

حامد چچا روکھے لہجے میں بولے "اس کے کیا طور طریقے ہیں، اس سے مجھے غرض نہیں ہے۔ میں تو نتائج سے غرض رکھتا ہوں۔ ہاں یاد آیا، اگروال کو مت بھول جانا۔"

"اگروال؟" سلیم نے یہ نام ایسے دہرایا جیسے کچھ ٹٹول رہا ہو۔

"اس کی بیٹی سکول میں میرے ساتھ پڑھتی تھی۔۔۔۔۔۔ سیتا اگروال۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔

"سیتا؟" کمال چونک پڑا۔

"تم اسے جانتے ہو؟"

"ہاں واجبی واجبی۔ لندن میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"تم نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا؟"

''کوئی موقع ہوتا تو ذکر کرتا۔'' کمال نے تڑاک سے جواب دیا۔

''کہتے ہیں کہ یہ دنیا بہت چھوٹی جگہ ہے۔'' سلیم مسکرایا ''لندن تک میں یہ صورت ہے کہ اگر ایک ہندوستانی یہ طے کرے کہ فلاں ہندوستانی سے اسے آنکھ بچا کر نکل جانا چاہیے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ لندن اتنی چھوٹی جگہ ہے کہ وہاں یہ کام بہت مشکل ہے۔''

''مجھے امیر پور والوں کے یہاں برج پارٹی میں جانا ہے۔'' حامد چچا بولے۔

''لو اچھا یاد آیا۔'' سائرہ چچی بولیں ''ڈاکٹر اور مسز لال کا کیا کیا جائے۔ امیر پور والے تو اس عورت کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ بہت شرمناک بات ہے۔''

''لغو بات ہے۔ خواہ مخواہ کی تہمت۔'' حامد چچا نے کمرے سے نکلتے نکلتے کہا ''مسز لال بہت اچھی خاتون ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مردوں کو اس میں کیا نظر آتا ہے۔ یہی کہ دیدہ دلیر ہے۔'' سائرہ چچی نے اونچی آواز سے کہا کہ چچا حامد جو باہر نکل رہے تھے سن لیں ''مرد بس اپنا تماشہ بناتے ہیں۔ سارے وزیر اس کے پیچھے گھن چکر بنے ہوئے ہیں۔''

''چالاک عورت ہے۔'' کمال بولا ''عام طور پر عورتوں کا جو مقصد ہوتا ہے اسے حاصل کرنے کا اسے گر آتا ہے۔''

''کیسے کیسے خوفناک لوگوں سے پالا پڑتا ہے۔'' ٹھنڈا سانس بھر کر بولیں ''زمانہ کتنا بدل گیا ہے، لیکن یہ بات تو سمجھنی چاہیے کہ آپ کی سوسائٹی میں پوزیشن کیا ہے اور کس خاندان سے آپ کا تعلق ہے۔''

''انگلینڈ میں رہ کر ہمیں خوب پتہ چل گیا کہ ہماری اوقات کیا ہے۔ ہم نسلی اعتبار سے رنگ دار لوگ ہیں نا۔'' کمال کہتے کہتے مسکرایا۔

''زندگی میں جو میری پوزیشن ہے اس پر میں تو بہت خوش ہوں۔'' سلیم ہنسنے لگا ''اس میں بہت آرام ہے۔ نوعمری میں میرا خیال کچھ اور تھا مگر وہ تو نابالغی کے زمانے کی ایذا پسندی تھی۔ اسے میں مارکسیت سمجھ بیٹھا تھا۔ ملحوظ رہے کہ مجھے اب تک مارکسیت کے اصول بہت عزیز ہیں۔ لیکن میں لینن نہیں ہوں۔ کسی سوویٹ ریاست کا قیام میرے بس کی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔''

''کیا کہا، Linen Serviettes۔ لنن کے نیپکن؟'' سائرہ چچی بولیں ''یہ کیا باتیں کررہے ہو۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔''

''امی آپ کتنی خوش قسمت ہیں۔ پرانی دنیا بھی خوب ہے۔'' سلیم نے ہنستے ہنستے ماں کو چوم لیا۔

وہ بھی خوش ہو کے ہنسنے لگیں اور دونوں بیٹوں کو باری باری چوما ''میں تو اب تھوڑا آرام کروں گی۔

بچو! تم دعوت نامے تیار کر لو گے نا۔ کارڈ اور لفافے نیچے تمہارے پاپا کے آفس میں رکھے ہیں۔"

"میں لے کے آتا ہوں۔" سلیم یہ کہہ کے ماں کے ساتھ نیچے سیڑھیاں اتر گیا۔

کمال بیٹھا دریچے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کی امی جب اسے سمجھانے لگتیں کہ اپنی تہذیب اور اپنے ورثے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے تو وہ ان سے کبھی بحث نہیں کرتا تھا۔ لیکن مجھے اس کے متعلق پتہ تھا۔ اس نے مجھے بتا رکھا تھا کہ سلیم نے تو سہولت سے یہاں کی فضا سے مفاہمت پیدا کر لی ہے مگر میرے لیے مفاہمت کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ بڑے سکون سے کہنے لگا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو" جب میں چھوٹا تھا تو یہیں اسی دریچے کے قریب آن کر بیٹھ جاتا تھا اور پہاڑیوں کو اور جھیل کو تکتا رہتا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے۔ وہ جو چوٹی نظر آ رہی ہے، ان دنوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ یہ چوٹی نہیں کوئی آدمی کھڑا ہے۔ اب بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ نیچے جو بازار ہے اس سے بھی ویسی ہی آوازیں آ رہی ہیں جیسی اس زمانے میں آیا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی اس بازار میں چلتے ہوئے لوگ ایسے نظر آتے تھے جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ اب بھی وہی نقشہ ہے۔ کھلونے جیسے چھوٹے چھوٹے بجرے اب بھی جھیل کی سطح پر اسی سکون کے ساتھ تیر رہے ہیں۔ جب میں بچہ تھا تو انہوں نے ریس شروع کی تھی۔ لگتا ہے کہ وہ ریس ابھی تک جاری ہے۔ یہ گھر بھی نہیں بدلا ہے۔ نہ باغ بدلا ہے نہ باغبان بدلا ہے۔ یہ پہاڑی لوگ ابھی تک بوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی تک وہ مجھے بچہ سمجھ رہے ہیں۔ قلی بھی اُسی طرح ہیں۔ اُسی طرح پھٹے حالوں۔ وہی ان کی مسکراہٹ، وہی ان کی بُو باس۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں یہاں سے کہیں گیا ہی نہیں تھا۔ مگر جب میں اپنے پاپا اور امی سے اور ان کے ملنے والوں سے باتیں کرتا ہوں تو پھر مجھے پتہ چلتا ہے کہ میں نے ایک دہائی سے زیادہ کا عرصہ باہر گزارا ہے۔ ہم باتیں کرتے ہیں مگر ہمیں مطلق پتہ نہیں کہ اس دس برس کے عرصے میں ہم میں سے کون کس کس مرحلے سے گزرا ہے۔ خارجی سطح پر بھی تبدیلی کا احساس نہیں ہے۔ باطنی اعتبار سے ہم میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان سے بے خبری تو اور بھی زیادہ ہے۔ یہ ایسی تبدیلیاں ہیں جنہیں محسوس ہی کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ اگر ساتھ ساتھ گزر بسر کر رہے ہوں تو انہیں ایک دوسرے میں تبدیلی پیدا ہونے کا تھوڑا بہت تو اندازہ ہوتا ہی ہے۔۔۔۔۔ اس کے باوجود مجھ سے توقع یہ کی جا رہی ہے کہ میری سوچ اور میرا طرزِ عمل دونوں اس طرح کے ہوں جیسے میں یہاں سے کہیں گیا ہی نہیں تھا، جیسے میرے سوچنے کا انداز ان لوگوں کے لیے جانا بوجھا ہونا چاہیے جو یہاں سے کبھی باہر نکلے ہی نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو۔"

"ہاں سمجھ رہی ہوں۔ اور پتہ ہے کیوں سمجھ رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ جسمانی اعتبار سے تو میں یہاں سے کہیں باہر کبھی نہیں گئی جیسے تم گئے تھے، لیکن یہاں رہتے ہوئے بھی میں کبھی ان لوگوں کے ساتھ پوری طرح رچ بس نہیں سکی۔"

''میں نے اس صورتحال کو بہت جلدی بھانپ لیا تھا۔ اسی لیے تو میں صرف تم ہی سے بات کر سکتا ہوں، اور کسی سے نہیں۔ اور اب ایک بات سنو۔'' وہ مسکرایا'' میں ایک ایسی بات کہنے لگا ہوں جس سے امی کے متعلق میرا پوائنٹ ثابت ہوتا ہے، یہ پوائنٹ کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پا رہے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے مشکل سے ایک ہفتہ ہوا ہوگا کہ امی نے میرے سامنے ایک سوال ڈال دیا۔ یہ کہ میں تم سے شادی کرلوں۔''

''اچھا انہوں نے تم سے یہ کہا کہ مجھ سے شادی کرلو؟''

''کہنے لگیں کہ لیلیٰ اب خیر سے اُنیس کے سن میں ہے اب اس کی شادی کی فکر کرنی چاہیے۔ کتنا اچھا ہو کہ اس خاندان کا بٹوارہ نہ ہو۔۔۔۔۔''

''اور مکان کا اور جائیداد کا بھی بٹوارہ نہ ہو۔'' میں نے ٹکڑا لگایا۔

''لیلیٰ! تم یہ زیادتی کر رہی ہو۔ میرے خیال میں وہ خلوص سے یہ بات کہہ رہی تھیں۔ مادی نقطۂ نظر سے نہیں، انسانی نقطۂ نظر سے بات کر رہی تھیں۔''

''اور اگر مادی اور انسانی نقطۂ نظر میں یکجائی پیدا ہو جائے تو پھر تو کیا ہی بات ہے۔ خیر تم نے کیا جواب دیا۔''

''میں نے کہا، امی آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں بہن کو بیوی بنالوں، یہ تو Incest کی صورت ہے۔ بات یہ ہے کہ میں تو شروع سے تمہیں بہن ہی سمجھتا آیا تھا۔ یہ بات امی کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

سلیم دھم دھم سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں آن دھمکا۔'' کیا معاملہ ہے جی؟ آپ دونوں بہت سنجیدہ نظر آ رہے ہیں۔''

میں ہنس دی'' مجھے سنجیدہ ہونا ہی چاہیے۔ کمال نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔''

''اچھا کمال بھیا نے تم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا؟ اس فہرست میں میرا نام بھی شامل کرلو۔ میں نے بھی یہی حرکت کی ہے۔''

''تم نے بھی انکار کر دیا؟'' کمال اور میرے منہ سے بیک وقت یہ بات نکلی۔

''ہوا یوں کہ امی نے میرے سامنے یہ تجویز پیش کی۔''

''تمہارے سامنے بھی یہ تجویز پیش کی؟ امی بہت بے صبری ہو رہی ہیں۔ مجھے جلدی سے اپنے لیے کوئی لڑکی ڈھونڈ لینی چاہیے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ امی Desparate ہو جائیں۔ خیر تو تم نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا، امی میں اس لڑکی کو Love نہیں کرتا۔''

میں ہنس دی'' اتنی ایمانداری سے بات کرنے پر میں تمہیں داد دیتی ہوں۔''

''ارے میرا یہ مطلب نہیں تھا'' سلیم نے جلدی سے کہا۔'' اور امی نے Love کے لفظ کو اس طرح

دہرایا جیسے انہیں اس لفظ سے ذہنی صدمہ پہنچا ہو۔ ان کی تیوری چڑھ گئی، نتھنے کپکپانے لگے اور بولیں Love؟ شریف گھرانوں میں Love کی بات نہیں کی جاتی۔''

ہم نے ایک ساتھ ہنسنا شروع کر دیا، اور میں کہنے لگی ''مجھے بتایا گیا ہے کہ مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا، یعنی Love۔ مجھے دو مرتبہ ٹھکرایا گیا ہے اور مجھے دیکھو کہ میں خوش ہو رہی ہوں۔ میں تہہ دل سے تم دونوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ شوہر بن جاتے تو مجھے تم سے نفرت ہی کرنی تھی۔ لیکن دوستوں کی حیثیت میں میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

کمال بولا'' میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارا یہ رشتہ زیادہ پائیدار ہوگا۔''

''صحت و تندرستی میں، دکھ بیماری میں ہر حال میں ہمارا ساتھ رہے گا۔ موت ہی ہمیں جدا کرے تو کرے۔'' سلیم نے قہقہہ لگایا'' اچھا خیر اب ہم اپنا کام کریں۔ آؤ سماج کے اژدہوں کا سر کچل ڈالیں۔''

تیسرا باب

وہ چھوٹا سا لان کچھ اتنا ہی شاداب دکھائی دے رہا تھا جتنی وہ پھلواری جو لان کے گرداگرد کنارے کنارے پھولی ہوئی تھی۔ یہ پھلواری ایک طرف پہاڑی کے اس ڈھلان کو چھو رہی تھی جو کائی اور پتیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دوسری طرف بھوری رنگت والے ٹینس کورٹ سے جا لگی تھی اور ان دونوں کے درمیان اپنی حدوں سے تجاوز کر کے سبزی ترکاری کی کیاریوں اور سیبوں کے باغیچے میں جا گھسی تھی۔

اس سبزہ زار میں چائے کی میزیں بچھی ہوئی اس طرح نظر آ رہی تھیں جیسے ہری ہری گھاس میں اور بھوری بجری کے بیچ سفید کھمبیاں اُگ آئی ہوں۔ ان میزوں کے اردگرد جو خواتین منڈلا رہی تھیں ان کی ساڑھیوں سے یوں لگتا تھا جیسے کسی مصور کے تختے پر رنگ بکھرے پڑے ہیں۔ مردوں کی اچکنیں اور سوٹ اور میموں کے تقریباتی ملبوسات ایک سیاہی مائل بیک گراؤنڈ کا کام دے رہے تھے جس میں پینسل کے شوشے لگے ہوئے تھے۔

ہمارے چچا اور چچی ان سیڑھیوں کے پاس کھڑے تھے جو بجری بچھے راستے سے یہاں تک آتی تھیں۔ یہاں کھڑے ہو کر وہ مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ ان کے برابر سلیم اور کمال دھلے دھلائے اس طرح کھڑے تھے جیسے کسی شاپ ونڈو میں ڈومیاں کھڑی ہوں۔ ان کے چہروں پر بھی اسی قسم کی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جیسی اردگرد کے سب چہروں پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ مسکراہٹ آورد کا رنگ رکھتی تھی اور ایک خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے اخلاق کی غمازی کر رہی تھی۔

میں پیچھے تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی۔ ویسے میں بھی ہر ایک کو دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔ مگر میری مسکراہٹ میں ایک حیرانی بھی شامل تھی۔ جس طرح لوگ منہ بنا بنا کر اور بگاڑ بگاڑ کے باتیں کر رہے تھے اسے دیکھ کر میں سوچ رہی تھی اور حیران ہو رہی تھی کہ چہرے کے بگاڑ کی بھی سو صورتیں ہیں اور اسی حساب سے چہرے کو ذریعۂ اظہار بنانے کی بھی سو صورتیں ہیں۔ میزوں کے بیچ جا بجا سفید وردیوں والے بیرے مستعد کھڑے تھے۔ یہ سب غلام علی کی کمان میں تھے جو اپنی طرے والی وردی اور کلف لگی پگڑی میں ملبوس ان بیروں سے ایسے پیش آ رہا تھا جیسے وہ سب اس کے چاکر ہوں۔

قلی مہمانوں سے لدی ڈانڈیاں کھینچتے ہوئے کھڑی ڈھلانوں پر اس طرح چڑھ رہے تھے کہ ساتھ

میں ہانپ بھی رہے تھے۔ باوردی قلیوں کے دستے تو مشینیں بنے ہوئے تھے۔ میلے کچیلے پیوند لگے کپڑوں والے قلی اس طرح حرکت کر رہے تھے جیسے بچھو کاگ ہوں۔ ان سب میں سے پسینے کی بساند آرہی تھی اور دھوئیں سے بھرے گھروں میں جو جلی جلی بُو ہوتی ہے وہ ان کے کپڑوں میں سے آرہی تھی۔ ان کے چہروں پر کرب کی کیفیت تھی۔ پسینہ ان پر بہہ رہا تھا۔ اس طرح سانس لے رہے تھے جیسے یہ سانس بڑی تکلیف کے ساتھ ان کے پھیپھڑوں سے نکل رہا ہے۔

جب راجہ بھیم نگر کے قلیوں کی لال وردیاں دکھائی دیں تو ہماری چچی جان کا تو منہ بن گیا۔ راجہ صاحب اپنی دونوں بیویوں کے آگے آگے چل رہے تھے۔ ویسے تو وہ درمیانہ قد کے تھے، لیکن اپنی پگڑی کے زور پر قدآور نظر آرہے تھے۔ عیاشیوں کی وجہ سے چہرے کی آب کچھ ماند پڑ گئی تھی۔ دونوں کانوں کی لوؤں میں ایک ایک بڑا سا جواہر ریزہ جھلملا رہا تھا اور دونوں بیویاں کچھ ایسی لگ رہی تھیں جیسے قیمتی نگوں سے لدے پھندے دو جھاڑ ہوں۔ سینئر رانی صاحبہ کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ رنگوں سے لپی پتی کوئی گڑیا ہے۔ دوسری رانی صاحبہ؟ ارے وہ تو سلویا نکلیں! راجہ بھیم نگر کے لیے کیا مشکل تھا۔ ہر شے خرید سکتے تھے۔ سلویا نگر کے رنگ و نسل والے تعصب کی بھی قیمت لگا سکتے تھے۔ وہ بی بی بڑی تحقیر سے ارد گرد نظر ڈال رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر پل بھر کے لیے تھوڑا اسٹپٹائی۔ میں نے اسے ایسے دیکھا جیسے اسے پہچانتی ہی نہیں ہوں اور وہ کاندھے اچکا کر آگے نکل گئی۔ تھوڑی دیر تک میں اس کی نفرت کو یاد کر کے پریشان رہی۔

بیگم وحید آئیں تو ہماری چچی جان تو بالکل بجھ گئیں۔ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب ہماری چچی جان اور بیگم وحید کے درمیان بہت تناتنی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب چچی جان کو یہ پتہ چلا کہ بیگم وحید نے ایک خلاف ضابطہ حرکت کی ہے۔ اسی خاتون نے ہماری چچی جان کے اردلیوں کی وردی کا رنگ اڑا لیا۔ اسی رنگ کی وردیاں اپنے اردلیوں کے لیے بنوا دیں۔ ہماری چچی جان اس حرکت سے بہت بے مزہ ہوئیں اور تقریریں شروع کر دیں کہ کیسے کیسے نودولتیے پیدا ہو گئے ہیں۔ تاہم دوستی پکی تھی کہ ایسے کئی مرحلوں کو وہ سہہ گئی اور پھر بھی برقرار رہی۔

بیگم وحید ترت پھرت سیڑھیاں اترنے لگیں۔ نادرہ والدہ ماجدہ کے بارعب سائے میں پیچھے پیچھے آرہی تھی۔

نادرہ میری طرف بڑھی تو میں نے دیکھا کہ سلیم مڑ کر اسے دیکھ رہا ہے۔ ہم ٹوٹ کر ایک دوسرے سے ملے۔ بات یہ تھی کہ اس بھیڑ بھڑکے نے تو ہم دونوں ہی کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس فضا سے نہ میں مانوس تھی نہ وہ مانوس تھی۔

اب مہمانوں میں سے بہت سے آن پہنچے تھے۔ چچا جان اور چچی جان اب وہاں سے ہٹ کر چائے کی میزوں کی سمت میں آگئے۔ سائرہ چچی کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ بلاشبہ یہ بہت شاندار

اجتماع تھا۔ صوبے کے سب ہی با اختیار لوگ خواہ ان کا تعلق حکومت سے ہو یا سیاست سے یا سوسائٹی میں با اختیار حیثیت رکھتے ہوں، غرضیکہ سب ہی یہاں اکٹھے ہو گئے تھے اور ہماری چچی جان کی مہمان نوازی سے فیض یاب ہو رہے تھے۔

اس وقت کے رواج کے مطابق یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ انواع و اقسام کی انگریزی اشیائے خوردنی کے ساتھ ساتھ ہر رنگ ہر مزے کی دیسی چیزیں بھی ہوں۔ تربیت یافتہ مؤدب بیرے دیسی مٹھائیوں اور نمکین چیزوں سے بھری تھالیں لے لے کر چلے آ رہے تھے۔ باقی کیک سینڈوچ وغیرہ پہلے ہی سٹینڈ پر رکھی طشتریوں میں سجا کر میز پر لگا دیئے گئے تھے۔ غلام علی مہمان کے آس پاس اور بیروں کے اردگرد ایسے منڈلا رہا تھا جیسے وہ کوئی لاٹ پادری ہے اور متبرک رسوم کی نگہبانی کر رہا ہے۔

مہمانوں کے آنے کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ مسز لال کی تو یہ پرانی عادت تھی کہ دیر سے آتی تھیں اور ایک ڈراما سا پیدا کر دیتی تھیں کہ میں آ گئی ہوں۔ آج بھی انہوں نے یہی کیا۔ دیر سے آئیں مگر اتنی دیر سے بھی نہیں کہ انہیں آخری مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوتا۔ سب سے اوپر والی سیڑھی پر پہنچ کر تھوڑا رک کر کھڑی ہو گئیں۔ ساڑھی کے پلو سے سر تو بیشک بڑے سلیقے سے ڈھکا ہوا تھا لیکن بدن کے سارے خطوط اور خم اپنی کساوٹ کے ساتھ نمایاں تھے۔ سر ایک سمت میں ذرا سا ڈھلکا ہوا۔ لمبی صراحی دار گردن، ہونٹوں پر ہلکا تبسم، نیم وا آنکھیں جیسے اہلِ دل کو اشارہ کر رہی ہوں۔ ان کی آنکھوں اور ان کی آواز میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ کسی کو چائے کی پیالی بھی پیش کرتیں تو لگتا کہ جام محبت پیش کر رہی ہیں۔ اس ادا پر مرد لوٹ پوٹ ہو جاتے اور عورتوں کو دھڑکا لگ جاتا لیکن گفتگو ہمیشہ ایسے کرتیں جیسے بہت معصوم ہیں۔ اپنی پارسائی ایسے جتاتی تھیں جیسے کوئی سپاہی اپنی چمکتی دمکتی ڈھال کو گردش دے رہا ہو۔

ڈاکٹر لال خود میلے کچیلے آدمی تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں شاید ہی انہیں کوئی یاد کرتا ہو۔ نوادرات جمع کرنے والے کو جتنا اپنی کسی نادر دریافت پر ناز ہوتا ہے اس سے بڑھ کر ان صاحب کو اپنی دھرم پتنی پر ناز تھا۔ اگر دولت مند اور مقتدر طبقے میں بھی حسن کا ذوق رکھنے والے پائے جاتے ہیں تو پھر انہیں بھی صاحب ذوق تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور ان کی دھرم پتنی تو اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھیں کہ وہ اچھے ذوق کے بھی مالک ہیں اور مالدار بھی ہیں۔ انہیں اپنی ڈاکٹری سے کم اور پیسے سے زیادہ شغف تھا۔ لیکن موسم آنے پر ان کی ڈاکٹری خوب چمکتی تھی۔

کمال اور سلیم ان کے استقبال کے لیے لپک جھپک چلے۔ اور جب سلیم میرے پاس سے گزرا تو اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی اور منہ ایسے بنا رکھا تھا جیسے وہ سیٹی بجا رہا ہو۔

سواری کی آواز بتا رہی تھی کہ مہمانوں کی ایک نئی ٹکڑی آن پہنچی ہے۔ مسز اگروال اپنے جثے کے ساتھ بہت سنبھل کر ڈانڈی سے اتریں اور احتیاط سے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ ان کے گول مٹول دہقانی

چہرے پر ایک طمانیت تھی اور بہت سنجیدگی طاری تھی۔ اب تو ان لوگوں کی خوشحالی کافی پرانی ہو چکی تھی مگر اب بھی اس بی بی کا یہ حال تھا کہ ریشمی کپڑے اور جوتے پہن کر اور کرسی پہ بیٹھ کر اکھڑی اکھڑی نظر آتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر تصور میں ایسی عورت ابھرتی جس نے بہت آرام سے سوتی کپڑے پہن رکھے ہوں اور کسی دقیانوسی قسم کی رسوئی میں ننگے پیروں زمین پہ پھسکڑا مارے بیٹھی ہو۔

ان کے پتی نے بیتاب ہو کر اردلیوں کو ایک طرف کیا اور تیسری ڈانڈی سے اترنے والی سواری کو اترنے میں مدد دینے کے لیے مستعد ہوئے۔ اور تیسری ڈانڈی سے سیتا مسکراتی ہوئی اتری، اتر کر سیدھی ہوئی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

''ارے نادرہ دیکھو! سیتا!''

''کون؟''

''ارے وہی لڑکی جو سکول میں میری سہیلی بنی ہوئی تھی۔''

میں اس سے ملنے کے لیے آگے نہیں بڑھی۔ میں پہلے اسے نظر بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہی چوڑا دہانہ، ویسی ہی سانولی رنگت، ویسی ہی روشن آنکھیں۔ لیکن اب وہ سانولی جلد جیسے لَو دے رہی ہو اور آنکھیں لمبی لمبی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں کاجل لگا ہوا تھا۔ بھنوؤں میں خم تھا اور لمبی لمبی دکھائی دے رہی تھیں۔ دہانہ پیارا پیارا لگ رہا تھا۔ کالے چمکیلے بال کنگھی سے پیچھے کی طرف کیے ہوئے تھے جہاں ان کا دائرے کی شکل میں گچھا بنا کے سفید سفید پھول اڑس دیے گئے تھے۔ اس کا کستا ہوا بلاؤز طوطے کی چونچ جیسا لال تھا اور دستی سلک کی ساڑھی طوطے کے پروں کی طرح شوخ سبز رنگ کی تھی۔ ماتھے کی بندیا، ہونٹوں پہ لگی لپ سٹک، لمبے ناخنوں پر لگی پالش، جیسے ان سب نے بلاؤز سے رنگ چرایا ہو۔ سیتا اپنے چھریرے بدن کے ساتھ ایسے چل رہی تھی جیسے پانی بہہ رہا ہو۔

میں نے دیکھا کہ کمال کا جبڑا کچھ بھنچ گیا ہے اور سلیم نے سیتا سے کوئی بات کہی جس پر وہ ٹھٹھا کر ہنسنے لگی۔

''بہت پیاری ہے اور اسے اس کا احساس ہے۔'' نادرہ نے اپنی رائے دے ڈالی۔

''سادہ سپاٹ سی لڑکی تھی۔ انگلستان نے اس میں یہ تبدیلی پیدا کی ہے۔''

''یورپ والوں کا جو ہندوستانی عورت کا تصور ہے اس تصور کے مطابق وہ بن گئی ہے۔'' نادرہ نکتہ چینی کے موڈ میں تھی۔

''معلوم ہوتا ہے کہ وہ۔۔۔۔۔'' میں کہتے کہتے جھجک گئی۔

''یہ سب کرشمہ ہے میک اپ کا، لباس کا، اور مواقع میسر آنے کا۔ جیسے ہمیں گلا گھونٹ کر رکھا گیا ہے وہ صورت اس کے ساتھ تو نہیں تھی نا۔'' نادرہ کے لہجے میں رشک جھلک رہا تھا جو اس وقت میرے اندر بھی

کروٹ لے رہا تھا۔

''سیتا!''

''لیلیٰ!'' ہم دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو پکارا۔ وہ میری طرف بڑھی اور ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

''لیلیٰ! تم تو بہت بدل گئی ہو۔ تم پہلے سے بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو۔ لیکن تمہاری آنکھوں میں اسی طرح ایک پریشانی ایک تجسس کی کیفیت ہے۔'' وہ ہنسی۔ جیسے اس کے بات کرنے کا انداز تھا کہ چبا چبا کر ٹھکے ٹھکے سے لہجے میں بولتی تھی وہی انداز اس کی ہنسی کا بھی تھا۔

''تم بھی تو بہت بدل گئی ہو۔'' میں نے اکھڑے سے انداز میں کہا۔ مجھے یہ احساس شدت سے ستا رہا تھا کہ اس کے مقابلے میں میری انگریزی یوں ہی سی ہے۔ ''ہاں، یہ میری سہیلی نادرہ ہیں۔ ہم کالج میں اکٹھے رہے ہیں۔''

بس اچانک مجھے نادرہ سے کچھ زیادہ قرب کا احساس ہونے لگا۔ یادوں کا ابتدائی ریلا گزر جانے کے بعد سیتا مجھے اجنبی نظر آنے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے اس طرح بات کر رہے ہیں کہ بیچ میں بہت چوڑی خلیج ہے۔

''نادرہ، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ لیلیٰ اور میں سکول میں ساتھ ساتھ پڑھے ہیں۔''

''اب تو ایسے بہت زمانہ ہو گیا ہے۔'' اور یہ کہتے ہوئے میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سیتا کہے کہ بہت زمانہ ہو گیا تو پھر کیا ہوا۔

لیکن سیتا نے حقیقت پسندانہ لہجے میں جواب دیا ''ہاں بہت زیادہ زمانہ ہو گیا۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک تجسس کے ساتھ اور ایک لطف کی کیفیت کے ساتھ ارد گرد نظر ڈالی۔

''سکول کے زمانے کی ایک اور لڑکی بھی یہاں ہے۔ تمہیں سلویا نگر یاد ہے؟ ہمارے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی آئی ہوئی ہے۔ اب وہ بھیم نگر کی رانی ہے۔''

''واقعی؟ ہاں اس کے گن ایسے ہی تھے۔ میں ویسے چل کر اس سے ملتی ہوں۔ تم ساتھ چلو گی؟''

''مجھے تو اس سے للّی ہے۔''

''ڈیئر لیلیٰ! تم بالکل نہیں بدلیں۔ ارے سلویا نگر بڑی بن جائے یا چھوٹی رہ جائے، اپنی بلا سے۔'' سیتا ہنسنے لگی۔

آس پاس کی میزوں پر ڈلی ٹولیاں کھانے پینے میں لگی ہوئی تھیں۔ ایسے کھا پی رہی تھیں اور ہنس بول رہی تھیں جیسے اس کے سوا اور اس سے آگے اور کچھ کرنے کے لیے ہے ہی نہیں۔ ہندوستانی بیگمات مردوں سے الگ آپس میں اکٹھی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ انگریز مہمانوں میں سے اکثر نے اپنا گروپ الگ بنا لیا تھا۔

میں، نادرہ اور سیتا ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ اصل میں ہم تینوں ہی کچھ اکھڑے اکھڑے تھے۔ اس اکھڑے پن کو چھپانے کے لیے ہنس رہے تھے۔

''چلو یہاں بیٹھتے ہیں۔'' ایک الگ تھلگ میز کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ اونچائی پر جو باغیچہ تھا وہ بھی وہاں سے نظر آتا تھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' سیتا نے ایک تفریحی سے انداز میں اردگرد نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

ہم چلنے لگے تو میری نظر راجہ امیر پور پر پڑی۔ لیک کر سائرہ چچی کی طرف جارہے تھے۔ ان کا طور کچھ معذرت خواہانہ سا تھا اور اچھا لگ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے ان کا خادم پانوں سے بھری چاندی کی ڈبیا اور ایک چاندی کا اگلدان لیے چلا آ رہا تھا مگر اس طرح کے بیچ میں تھوڑا فاصلہ برقرار رکھا ہوا تھا۔ اور راجہ صاحب کے بڑے صاحبزادے لان میں سے ہوتے ہوئے بڑی تیزی سے جا رہے تھے کہ باپ کو جا پکڑیں۔ انہی کے ساتھ ایک اور اجنبی صورت لیک جھپک چل رہا تھا۔ مگر وہ اجنبی کہاں تھا۔ پہلی نظر میں جب میں نے اسے پہچانا تو میں تو سکتے میں آ گئی۔ ایسی ٹپٹائی کہ اور کچھ تو سمجھ میں نہ آیا اپنی کیفیت چھپانے کی غرض سے تیز تیز باتیں کرنی شروع کر دیں۔

''مجھے بیٹھنے کے لیے یہ جگہ بہت پسند ہے۔ اس جگہ کی خوبی یہ ہے کہ یہاں سے پہاڑیوں کے اس پار تک دیکھ سکتے ہیں اور لوگوں کی طرف سے پیٹھ موڑ کر ان سے بے تعلق ہو سکتے ہیں۔ ان کی کھوکھلی آوازیں، ان کے کھوکھلے لفظ مجھے بور کرتے ہیں۔ ذرا انہیں دیکھو۔ لگتا ہے کہ جنم جنم سے فوٹوگرافروں کے روبرو بیٹھے ہیں اور بڑے صبر کے ساتھ اس گھڑی کا انتظار کر رہے ہیں جب کیمرہ کلک کرے گا۔ اسی انتظار میں مسکراہٹ ان کے چہرے پر منجمد ہو گئی ہے۔

''لیلیٰ! تمہیں یاد ہے جب ہم بحثیں کیا کرتے تھے تو نیتا تمہیں فراری ہونے کا الزام دیا کرتی تھی۔ ویسے میں اس کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتی تھی۔ اس کا نقطۂ نظر تو یہ تھا کہ آدمی جب تک اپنی طبقاتی شخصیت سے نجات حاصل نہ کرے یعنی کہ اپنے آپ کو ڈی کلاس نہ کر لے اس وقت تک وہ حقیقت سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا۔ مگر میرے خیال میں ہمارا مذہب بجا طور پر ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ آدمیوں کے بیچ آدمی بن کر رہنا چاہیے۔ تو بی بی تم حقیقت سے کب تک آنکھیں چراؤ گی۔ زود یا بدیر وہ دن آنا ہے جب تم ان پہاڑیوں سے منہ موڑنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔ تو ابھی سے اس کی عادت کیوں نہیں ڈال لیتیں۔'' نادرہ نے مجھے اچھا خاصا وعظ دے ڈالا۔ ویسے اس کا وعظ و پند میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھا۔

سیتا نے آرام سے کرسی پر کمر ٹکائی اور لفظوں کو چبا چبا کر کہنے لگی: ''تمہاری باتیں سننے میں مجھے لطف آ رہا ہے۔ مزیدار گفتگو ہے۔ بہت عرصہ پہلے اس قسم کے مجرد مسئلے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے، مجھے پریشان کیا کرتے تھے۔ اب تو میں یہ سمجھتی ہوں کہ جینے کا تجربہ خود ہی بہت بڑا چیلنج ہے۔ اور آدمی لوگ اپنی

بہت دلچسپ چیز ہوتے ہیں۔ جب ہی تو میرا پڑھنے سے جی اکھڑ گیا۔ ویسے لیلیٰ میں تمہاری طرح ذہین تو کبھی بھی نہیں تھی۔ جیتے جاگتے لوگوں کے مقابلے میں کتابیں کتنی مردہ کتنی بے رنگ ہوتی ہیں۔ چار سال گنوا کر میں نے ایک واجبی سی ڈگری حاصل کی اور واپس آ گئی۔ میرے پتا جی بہت مایوس ہوئے۔ مگر مجھے تو اس کا ذرا بھی افسوس نہیں ہے۔''

''تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے پتا جی اپنی مایوسی کو سہار گئے ہیں۔ ماشاءاللہ سے امیر ہو نا۔'' نادرہ کے نازک نتھنے پھڑ پھڑانے لگے جو اس کے مخاصمانہ جذبے کی چغلی کھا رہے تھے۔

''مجھے پتہ ہے۔'' سیتا نے بڑے سکون سے جواب دیا ''میں تو بہت خوش ہوں کہ ہم امیر لوگ ہیں۔ بلکہ مجھے تو اپنے وحشی ہونے میں بہت مزہ آتا ہے۔ اب میں اگر اس کی وجہ سے کسی احساسِ جرم میں مبتلا ہو بھی جاؤں تو اس سے فرق کیا پڑے گا۔ ہم جو ہیں وہی رہیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اگر فرسٹریشن کا شکار ہو جاؤں تو اس سے کسے پھوٹی کوڑی کا فائدہ پہنچے گا۔''

نادرہ کا منہ لال ہو گیا۔ سیتا کی اس غیر متوقع جارحانہ روش سے میں بہت سٹپٹائی۔ ابھی تو ہم ایک دوسرے سے پوری طرح مانوس بھی نہیں ہوئے تھے۔ اسی سٹپٹائی کیفیت میں میں نے جھجکتے جھجکتے کہا ''سیتا تم تو بہت بدل گئی ہو۔ ارے تم تو بہت آدرش وادی ہوا کرتی تھیں۔ تمہیں یاد ہے کہ جب سکول میں ایک اینگلو انڈین لڑکی نے گاندھی جی کو گالی دے دی تھی تو ہم پنجے جھاڑ کے اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ہم بہت نیشنلسٹ قسم کی چیز ہوا کرتے تھے اور وہ بھدی ساڑھیاں خرید کے پہنا کرتے تھے جن کی کناری پر قومی جھنڈے کا پرنٹ ہوتا تھا۔ یہ وہی دن تھے جب تمہارے انکل جیل گئے تھے۔''

''لیلیٰ ڈیئر! میں اب بھی نیشنلسٹ ہوں۔'' سیتا کے لہجے میں اب بھی ایک استہزا کا رنگ تھا۔ ''ویسے تو میرے پتا جی گاندھی کے بہت بھگت ہیں لیکن کوئی مقصد ہو تو ان کی مٹھی فوراً کھل جاتی ہے۔ میں دیسی کپڑے کے سوا کوئی کپڑا نہیں پہنتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے پراچین آرٹ اور کلچر کی نو سنا ہونی چاہیے۔ لیکن اس کے لیے میں تیار نہیں ہوں کہ سب کچھ تیاگ کے میں جیل چلی جاؤں۔ ویسے میں یہ جانتی ہوں کہ جیل جانے کا آگے چل کر انعام مل جائے گا۔ مگر ہمارے چچا جی نے ایسا نہیں سوچا تھا۔'' اس کی آواز تھوڑا بھرانے لگی تھی مگر فوراً اس کا پچھلا لہجہ پلٹ آیا ''مجھے یاد ہے کہ پتا جی چاچا جی کے جیل جانے سے بہت سٹپٹائے تھے۔ انہیں ابھی ابھی انسپکٹر جنرل پولیس نے کپڑے کا ایک کنٹریکٹ دلوایا تھا۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ میں اگر نراش آدرش وادی بن جاؤں تو اس سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا تو جو ہے سو ہے، میں اس میں خوش ہوں۔''

بیرا گرم گرم چائے لے کر آ گیا۔ میں چائے پیالیوں میں انڈیلنے لگی۔

''میں چائے میں شکر نہیں لیتی۔ شکریہ۔'' سیتا بولی۔

''تم احتجاج بہت کرتی ہو۔'' نادرہ نے ترش لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی منہ سے کیک کے ریزے صاف کیے'' معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے اندر کوئی لڑائی جاری ہے۔ یوں تم نے بہت آزادی حاصل کر لی ہے، لیکن اس آزادی نے اس اندر کی لڑائی سے نجات حاصل کرنے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کی ہے۔''

سیتا ہنسی اور آنکھیں میچتے ہوئے بولی'' یہ جو تنک سی نفسیات ہم پڑھ لیتے ہیں یہ بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے۔''

اسی گھڑی سلیم آن دھمکا۔ اس وقت اس کا آنا اچھا ہی ہوا۔ بولا'' ہم آپ کو جوائن (Join) کر سکتے ہیں؟ بہت بوریت تھی۔ آپ لوگوں کے پاس پناہ لینے کے لیے آئے ہیں۔''

''ضرور، ضرور۔ ہمارے سر آنکھوں پہ۔'' سیتا مسکرا اٹھی۔

''میں ان لوگوں کا آپ سے تعارف کرا دوں۔ یہ ٹھاکر رنجیت سنگھ ہیں اور یہ کنور رضا علی آف امیر پور ہیں اور ان کے ساتھ ان کے کزن امیر حسین ہیں۔ اور میرے بھائی کمال کو تو مس اگروال آپ جانتی ہی ہیں۔''

''سیتا کہیے پلیز۔'' وہ پھر مسکرائی۔

ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا'' یہ سیتا ہیں۔۔۔۔۔ اور یہ میری کزن لیلیٰ ہیں۔ اور یہ'' اس نے سوالیہ نظروں سے نادرہ کو دیکھا۔

''یہ میری سہیلی نادرہ وحید ہیں۔'' مجھے اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں لوگ میرے دل کی دھڑکن نہ سن لیں۔

وہ سب بیٹھ گئے اور سلیم کہنے لگا'' لو بھئی اب ہم یہاں براجمان ہوتے ہیں۔ خدا خدا کر کے اب ہم اپنی جون میں آئے ہیں۔ اس پر تکلف گفتگو نے مجھے تو بور کر دیا۔ چائے کی طلب ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ بیرا!'' اس نے بیرے کو پکار کر بلایا اور مزید چائے کا آرڈر دیا۔

''لیلیٰ!'' کمال مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''تمہیں رنجیت تو یاد ہوگا نا؟''

''میں اس وقت بہت چھوٹی سی تھی۔۔۔۔۔'' میں کہنے لگی تھی۔

''مجھے یاد ہے تم ننھی سی بچی ہوا کرتی تھیں اور آنکھیں اتنی بڑی بڑی اور۔۔۔۔۔'' رنجیت ہنسنے لگا ''لیکن افسوس کہ اس کے بعد پھر ہم مل ہی نہیں سکے۔ کمال! تم تو شاید ہمارے رسم و رواج بھول چکے ہو۔ تمہارے دادا جان کے زمانے میں ہم ایک دوسرے سے آزادانہ مل جل نہیں سکتے تھے، خاص طور پر تیرہ چودہ کی عمر کے بعد۔ یہ عمر تو ہوتی ہی ہے خطرناک۔''

''اب جبکہ تم اس قاتل عمر میں پہنچ گئے ہو جسے پچیسواں برس کہتے ہیں۔'' سلیم کہنے لگا'' تو میں تمہیں آزادانہ ملاقات کی اجازت دیتا ہوں۔''

''عجیب سی بات ہے کہ بچپن میں ملیں اور پھر اتنے برسوں کے بعد ملیں۔'' کمال آہستگی سے بولا ''رنجیت! ہم جب اپنے لڑکپن کی باتیں کر رہے تھے تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہماری دوستی میں کوئی وقفہ آیا ہی نہیں تھا۔ انگلینڈ میں جو میں نے یار دوست بنائے ان کے مقابلے میں تم مجھے اپنے سے زیادہ قریب محسوس ہوتے ہو۔''

''یہ تمہارے مشرقی خون کا کمال ہے۔'' رنجیت مسکرا کر کہنے لگا ''ارے نسلوں سے دوستی کا رشتہ چلا آ رہا ہے۔ اسے ٹوٹنے میں وقت لگے گا۔ دس بارہ سال اس کام کے لیے بہت کم ہیں۔''

کمال نے بھی اسی طرح مسکرا کر جواب دیا ''مشرق کے ساتھ یہی تو مشکل ہے کہ کسی چیز پر بھی اس کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔ اور جہاں بیسویں صدی کے ہوتے ہوئے بھی پتھر دھات کا زمانہ سانس لے رہا ہو وہاں وقت کے کیا معنی رہ جاتے ہیں۔''

دونوں کتنی اپنائیت سے باتیں کر رہے تھے۔ حرارت کی رو دونوں کے بیچ دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

رنجیت ہمارے دادا کے دوست ٹھاکر بلیر سنگھ کا بیٹا تھا۔ اندر دھنسی دھنسی آنکھیں، موٹے موٹے میلے الجھے بال، ایسا اونچا قہقہہ لگاتا تھا کہ متعدی بیماری کی طرح پھیلتا محسوس ہوتا تھا۔ آدمی کیا تھا کھلی کتاب تھا۔ کوئی بات دل میں چھپا کر رکھنے کا قائل نہیں تھا۔

اس کے برعکس اسی کے برابر امیر پور کا نوجوان چپ چاپ اپنے آپ میں سمٹا ہوا بیٹھا تھا۔ مجال ہے کہ نظر اٹھا کر سیتا کو، یا نادرہ کو، یا مجھے دیکھا ہو۔ ویسے تو انگریز استادوں سے پڑھا تھا مگر عورتوں کے بارے میں جو روایتی رویہ چلا آتا ہے اس کے زیر اثر پلا بڑھا تھا۔ سولہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی تھی اور ابھی چوبیس برس کا تھا کہ پانچ بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ سنا کرتے تھے کہ اسے اپنی بیوی کا نام معلوم نہیں تھا۔ کبھی بیوی کا نام لے کر بات ہی نہیں کی۔

سلیم اپنی پرانی سکول والی ٹائی کو انگلیوں سے چھیڑتے ہوئے سیتا سے کہنے لگا ''انگریزوں کے دلوں کو جیتنے کا یہ تیر بہدف نسخہ تھا۔ اس بھلے مانس پر تو اس کا ایسا اثر ہوتا تھا جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ غالباً محکمۂ جنگلات میں تھا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ بالکل بندر نظر آتا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ چڑیا گھر سے کوئی جوڑا نکل آیا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا اس کی بیوی بالکل ریچھنی لگتی تھی۔ میری پیٹھ کو تھپتھپا تھپتھپا کر سکول کے پرانے بھلے دنوں کی باتیں کرنے لگا۔ مجھے کچھ اس قسم کا احساس دلاتا کہ جیسے میں کسی خاص صفت کا مالک ہوں۔''

سیتا ہنسنے لگی۔ پھر اس سے گھل مل کر لندن کی سہانی باتوں کو یاد کرنے لگی۔ ان باتوں سے بھلا ہمارا کیا تعلق تھا۔ میں دل ہی دل میں جل رہی تھی۔

کمال کے چہرے پر پل بھر کے لیے ناگواری کی کیفیت نمودار ہوئی۔ پھر اس نے رنجیت اور رضا علی سے شیر کے شکار کے بارے میں جس کا وہ منصوبہ باندھ رہے تھے، باتیں کرنی شروع کر دیں۔

باقی ہم سب خاموش بیٹھے تھے۔ نادرہ کے چہرے سے اب تک وہی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی کہ جیسے وہ سیتا کو پسند نہیں کرتی۔

میں ان کی صرف آوازیں سن رہی تھی۔ باقی میں اپنے آپ میں گم اپنے شعور کی کسی گہری تہہ میں ٹٹول رہی تھی کہ مجھے بولنے کے لیے کچھ لفظ مل جائیں یا کم از کم یہ ہمت پیدا ہو جائے کہ جب امیر کھڑا ہو تو میں نظر اٹھا کر اسے دیکھ لوں۔

امیر پور کا نوجوان بڑی متانت سے کہہ رہا تھا "اگر تم مجھے اجازت دو۔۔۔۔۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" سلیم اچھل پڑا، اور کہنے لگا "اور کل کی ٹینس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ پروگرام تو طے ہو چکا ہے۔ ہے نا؟ تم دونوں کو آنا ہے۔"

"شکریہ۔ مزہ آئے گا۔۔۔۔۔"

"بہت بہت شکریہ۔" امیر نے کہا۔

دونوں نے جھک کر سلام کیا "خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" نادرہ نے اور میں نے دونوں نے اکٹھا کہا۔

"کل تک کے لیے گڈ بائی۔" سیتا مسکرائی۔

اس رخصتی کے ساتھ ہی یہ لان، جس میں زندگی کی ایک رودوڑی ہوئی تھی، اچانک مجھے لگنے لگا کہ یہاں سب پتلیاں ہی پتلیاں ہیں جو نپے تلے انداز میں نقل و حرکت کر رہی ہیں، نقلیں اتار رہی ہیں، اور جچے تلے حساب اور قواعد و ضوابط کے مطابق آوازیں نکال رہی ہیں۔ دم کے دم میں اس سبزہ زار سے ہر طرح کی انسانی دلچسپی اُڑن چھو ہو گئی تھی۔

چوتھا باب

دوسری دفعہ جب میں اور امیر اُس جگہ اکٹھے ہوئے تو ہمارے بیچ جو خاموشی کی خلیج تھی اور جو کشاکش تھی وہ اس سہولت سے ختم ہوئی کہ میں تو حیران رہ گئی۔ پہلی مرتبہ مجھے یہ آگاہی ہوئی کہ ہمارے ذہن کی استوار کی ہوئی فصیلیں بھی اتنی ہی ہوائی ہوتی ہیں جتنے وہ اندیشے جو ان فصیلوں کو کھڑا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اگر آدمی اپنے عمل سے ان پر غلبہ پالے تو پھر یہ یقین بھی مشکل ہی سے آتا ہے کہ ان فصیلوں کا کبھی کوئی وجود بھی تھا۔

گارڈن پارٹی کے بعد امیر، رضا علی اور رنجیت سنگھ کے ساتھ ٹینس کھیلنے کے لیے دو دن آتا رہا اور دو دن پورے پورے دن ہماری ملاقات رہی۔

میں ٹینس کورٹ کے ایک طرف بیٹھی پورے اطمینان قلب کے ساتھ کھیل دیکھ رہی تھی۔ سورج کی حرارت اور اس کے ساتھ ہلکی ہلکی ہوا جو دیوار کی چتیوں میں باجا سا بجا رہی تھی، میرے بدن کو چھو رہی تھی۔ میں ایک میکانکی سے انداز میں رنجیت کا ہنسی ٹھٹھا سن رہی تھی۔ وہ میرے برابر بیٹھا کھیل پر تبصرہ آرائی کیے جا رہا تھا۔ حرکت کرتے جوان جسموں کا کیا بناؤ تھا اور کیا توانائی تھی جیسے کسی مجسمہ ساز کے تراشے ہوئے جسم ہوں۔ مجھے انہیں دیکھ کر ایک حسی قسم کی لذت مل رہی تھی۔

امیر آ کر میرے پاس بیٹھ گیا اور رنجیت جا کر کھیل میں شریک ہو گیا۔ اس نے ستانے کے انداز میں اپنے پیروں کو پھیلایا اور بید والی کرسی کو ذرا پیچھے کی طرف کھسکا لیا۔ اس کا جسم آرام مانگ رہا تھا۔ اس میں کتنی نرمی آ گئی تھی۔

"اچھا گیم رہا۔" اس نے اپنے ریکٹ کو دیکھتے ہوئے بڑی شائستگی سے کہا۔

"ہاں اچھا تھا۔" میں نے تھوڑے حجاب کے ساتھ کہا۔

"کمال اچھا کھیلتا ہے اور سلیم اگر تھوڑا اور تیزی سے دوڑنے لگے تو اس کا کھیل بھی بہتر ہو جائے۔"

"تیز دوڑنے کے لیے تو وہ بنا ہی نہیں ہے۔"

میرے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگا اور وہ جو درمیان میں ایک حجاب تھا وہ بھک سے اڑ گیا۔ وہ مجھے دیکھنے لگا اور میں نے نظریں بالکل نہیں چرائیں۔

اپنے چچیروں کے بارے میں، گارڈن پارٹی کے بارے میں، اسد اور زاہد کے بارے میں، اور ادھر اُدھر کی غیر متعلق چیزوں کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اور یہ باتیں کرتے ہوئے مجھے ڈھیر سے

دھیرے احساس ہوا کہ وہ جو ہم پر پابندیاں ٹھونسی گئی تھیں اور جن کی وجہ سے ہم اپنے چھوٹے سے حلقے سے باہر کسی سے بات کرنے جوگے نہیں تھے وہ پابندیاں تو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ بودی ہیں اور یوں لگا ہم جو گفتگو کر رہے ہیں اس کا آغاز کہیں بہت زمانہ پہلے ہوا تھا۔

اب اپنی پہلی ملاقات پر بھی بات کر سکتے تھے۔ بات کا آغاز اسی نے کیا" بہت عجیب طرح سے ملاقات ہوئی۔"

"کتنی فضول بات تھی۔ میں اس شخص سے ڈر رہی تھی جو بیچارہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔"

"تم ڈر گئیں، اچھا ہی ہوا۔ میں تو اس پر خوش ہوں۔ نہیں تو میں تم سے کیسے ملتا۔ میں تو یہ توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ۔۔۔۔۔"

"توقع؟۔۔۔۔۔آپ کو کیسے توقع ہو سکتی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ اجنبی تو توقع نہیں کیا کرتے کہ۔۔۔۔۔" اور میں جھجک گئی۔ زبان لڑکھڑانے لگی۔

"میں نے اسد سے تمہارے متعلق سن رکھا تھا" وہ وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگا" اور میں روز صبح کو تمہیں ڈرائیو کرتے ہوئے یونیورسٹی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ یہ میرا ایک طرح کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ میں تمہارا انتظار کرنے لگا۔ کسی روز تمہیں دیر ہو جاتی یا آتی ہی نہیں تو میں بیتاب ہو جاتا۔" پھر اس نے سادگی سے اس بات میں ایک ٹکڑا لگا دیا" مجھے یہ بات ماننے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا کہ بہت سے لڑکوں کا مشغلہ ہی یہ ہے کہ گیٹ کے آس پاس اس انتظار میں منڈلاتے رہتے ہیں کہ لڑکیاں ادھر سے گزریں تو انہیں تاڑیں۔"

"جب ہی تو ہماری چچی اور بیگم وحید کہا کرتی تھیں کہ لڑکے ابھی اس لائق نہیں ہیں کہ لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ پڑھیں، اس لیے کہ گھروں پر انہیں یہ سکھایا ہی نہیں جاتا کہ لڑکیوں سے ملنے اور بات کرنے کے آداب کیا ہیں۔"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔" امیر مسکرایا" میں کسی نازیبا۔۔۔۔۔"

"میں کسی کی ذات پر حملہ نہیں کر رہی۔" میں نے بیچ ہی میں اس کی بات کاٹ دی۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ ٹپٹا جانے سے میرے گال تمتمانے لگے ہیں۔

"بہر حال" اس نے کوشش کر کے ایسا لہجہ بنایا جیسے وہ بہت سنجیدگی سے بات نہیں کر رہا" تمہیں تو ہمارے وجود کا بھی احساس نہیں ہوگا۔ تم تو ایک اور ہی دنیا کی باسی تھیں۔ اور یہ وہ دنیا تھی جس پر ایسے ہزاروں سماجی تعصبات پہرہ دے رہے تھے جو آگ اگلنے والے اژدہوں سے بھی زیادہ خوفناک ہیں۔"

"آخر ایک دن میں نے ہمت کر کے ایک دوسری دنیا میں قدم رکھا۔۔۔۔۔"

"اور قسمت نے تمہیں میری باہوں میں۔۔۔۔۔ استعارتاً نہیں بلکہ سچ مچ میری باہوں میں دھکیل دیا۔"

''پھر ایک دن آیا کہ تم اژدہوں کے بیچ سے گزر کر قعلے کے بیچوں بیچ آن دھمکے۔''

''اس واسطے سے کہ اسد نے اپنا سر پھڑوالیا۔ لیکن میں نے یہ تمنا کبھی نہیں کی تھی کہ قسمت میری خاطر ایسے خطرناک طریقے آزمائے۔''

''تمہیں یہ تمنا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ قسمت تمہیں بڑے آرام اور امن سے اس چھوٹی سی دنیا میں لے آئی جہاں لوگ ایک دوسرے سے آنکھ بچا کر نکل ہی نہیں سکتے۔ ایک دوسرے سے متنفر ہوں تو بھی ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔''

''اس میں قسمت کا بہت کم دخل ہے۔ جیسے سازشی لوگ سکیمیں بناتے ہیں ویسے ہی میں نے سکیم بنائی تھی۔ لیجئے قسمت کا کام ہو گیا۔ میرے خیال میں قسمت کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ کسی خاص گھڑی میں آ کر ہمیں اس طرح جھنجھوڑے کہ ہم چونک پڑیں۔ ایسی گھڑیاں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ باقی ایسے سنگ میلوں کے درمیان ہمیں خود اپنی راہ تلاش کرنی پڑتی ہے۔ میں نے اس دنیا کا رستہ اس طرح پایا کہ ایک غریب رشتہ دار کے پیچھے لگ کر یہاں چلا آیا۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے اپنی غیرت کو نگلنا پڑا۔ لیکن یہ اتنا بڑا لقمہ نہیں تھا کہ میرے حلق میں پھنس جاتا۔ میں زندہ ہوں اور خیریت سے ہوں۔ نوالہ حلق میں ایسا نہیں پھنسا کہ دم گھٹ کر میری موت واقع ہو جاتی۔''

''اور میں بھی تو کوئی قاتل نہیں ہوں۔''

''لیکن یاد رہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی قتل ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بھی چلتا پھرتا رہتا ہے۔ لوگوں کو اس پر زندہ آدمی کا گمان ہوتا ہے۔''

ہم مل کر ہنسنے لگے اور مجھے اس وقت سوائے ہنسنے اور مشغول کرنے کے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اسی عالم میں میں نے دیکھا کہ ملازمین جو اچٹ کر ادھر ادھر گر جانے والی بال کو اٹھانے میں لگے ہوئے تھے، مودب ہو کر سیدھے کھڑے ہو گئے ہیں اور کیا دیکھتی ہوں کہ حامد چچا لان میں سے ہوتے ہوئے ادھر آ رہے ہیں۔ میری ساری ہنسی، سارا احساس آزادی میرے اندر جیسے ٹھٹھر گیا ہو۔

ہمارے قریب آئے، امیر کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور خود ایک آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ ان کے چہرے پر وہی معمول کا روکھا پن تھا۔ آنکھوں سے لگتا تھا کہ کسی گہری فکر میں غلطاں ہیں۔

تھوڑی دیر تک تو خاموشی طاری رہی، لیکن اس نرم گرم دھوپ میں بیٹھ کر جب انہوں نے تھوڑا اپنے بیٹوں کو کھیلتے دیکھا تو ان کے چہرے کے تنے ہوئے خطوط کچھ نرم پڑنے شروع ہوئے۔ کھیل میں ان کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ امیر سے اپنے طالب علمی کے دنوں کی باتیں کرنے لگے جب وہ بھی کھیلوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔

میں حیران کہ یا اللہ چہرے پر چڑھی ہوئی تہیں کس طرح اترتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ وہ تو حاکمانہ فوں فاں کی چلتی پھرتی تصویر ہوا کرتے تھے۔ اب وہ آدمی کی جون میں نظر آ رہے ہیں۔

اصل میں جب سے ان کے بیٹے پلٹ کر گھر آئے تھے مجھے ان میں آدمی والی بُو ن کی اڑتی اڑتی سی جھلک دکھائی دینے لگی تھی جس کے مجھے پہلے کبھی ان میں کوئی اثر آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔

جب کھیل ختم ہو گیا اور کھلاڑی ہمارے ساتھ آ کر بیٹھے تو حامد چچا کی فوں فاں بالکل رخصت ہو چکی تھی۔ اپنے بیٹوں اور اپنے دوستوں کے بیٹوں کے ساتھ کس بے تکلفی سے ہنس بول رہے تھے۔

بولے "لیلیٰ بٹیا! انعام علی سے جا کر کہو کہ چائے یہیں لے آئے۔ گھر کے اندر بند ہو کر بیٹھنے سے یہ بہتر رہے گا کہ یہاں بیٹھ کر چائے پی جائے۔ یہاں زیادہ خوشگوار فضا ہے۔ تمہاری چچی تو کہیں باہر گئی ہوئی ہیں، اب تمہیں ہی میزبانی کا حق ادا کرنا پڑے گا۔"

مجھے لگا کہ چچا جان کے لہجے میں ایک نئی طرح کی ملائمت آ گئی ہے۔ یا شاید یہ میرا اپنا تصور ہو اور تبدیلی اصل میں میرے اندر آئی ہو۔ اس وقت مجھے ہر چیز بہت سندر دکھائی دے رہی تھی اور ہر آدمی بہت بھلا مانس نظر آ رہا تھا۔

چائے ختم ہی ہوئی تھی کہ اس خوشگوار فضا میں ایک کھنڈت پڑ گئی۔ ملازم یہ بدمزہ اطلاع لے کر آیا کہ مسٹر اگروال اور شیخ ولی الدین آئے ہیں۔ وہ تشریف لائے اور اس ہنستی بولتی ٹولی کے بیچ میں آ کر ایسے بیٹھ گئے جیسے کوے اتر کر کائیں کائیں کرنے لگے ہوں۔

علیک سلیک اور رسمی مزاج پرسی کے بعد ان لوگوں نے مطلب کی بات شروع کی۔ کچھ سیاسی اہمیت والے معاملات پر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

میں نے سوچا کہ اب یہاں سے کھسک ہی جائیں تو اچھا ہے۔ تو میں کچھ رکتی جھجکتی وہاں سے اٹھی اور اندر کی طرف چلی۔ میں نے کیا دیکھا کہ چچا جان کا چہرہ تو دم کے دم میں بدل گیا اور پھر وہی درشتی اور سختی چہرے پر آ گئی جو ان کی پریشانی اور جارحانہ روش کی چغلی کھا رہی تھی۔

حامد چچا تھوڑے دن تک الیکشن کے قصوں قضیوں میں بہت غلطاں و پیچاں رہے۔ نئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت یہ الیکشن ہونے والے تھے۔ کوئی پارٹی ہو یا تاش کی بازی ہو رہی ہو، ہیر پھیر کر یہی ایک موضوع تھا۔ باقی اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ یاروں کو حلقۂ انتخاب اس طرح عنایت کیے جا رہے تھے اور وزارتیں اس طرح بخشی جا رہی تھیں جیسے حلقۂ انتخاب اور وزارتیں نہ ہوں کیک پیس ہوں۔ اور خواتین کو دونوں ایوانوں میں نشستیں یوں پیش کی جا رہی تھیں جیسے گلدستے پیش کیے جاتے ہیں۔

حامد چچا کے اکثر دوستوں کو کامیابی کا کامل یقین تھا۔ ان کی دانست میں جماعتی وابستگیاں تو بس لیبل ہوتی ہیں۔ ان سے بس جمہوری آداب کی خانہ پری ہوتی ہے۔ باقی ان کے خیال میں اس دفعہ بھی ان کا اثر و رسوخ کام آئے گا اور ان کی مقتدر حیثیت ووٹروں پر اثر انداز ہوگی۔ سو پہلے کی طرح اب کے بھی کامیابی ان کے قدم چومے گی۔

حامد چچا ان چند لوگوں میں سے تھے جو یہ مانتے تھے کہ آئین کی رو سے عام مردوں عورتوں کو

آئین کی طرف سے ووٹ کا حق ملنے کے بعد کانگریس اور نو منظم مسلم لیگ دونوں سے سخت مقابلہ پیش آئے گا۔ انہوں نے دوستوں پر یہ بھی جتا دیا تھا کہ کانگریس نے ایک لمبے عرصے تک آزادی کے لیے جو جدوجہد کی ہے اور قربانیاں دی ہیں اس کی وجہ سے وہ ایک بڑی طاقت ہے۔ اور رہی مسلم لیگ تو ایک تو وہ مسلمانوں کے مذہبی احساس اور جذبات کو اپیل کرتی ہے۔ پھر ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے طور پر مسلمانوں کو جو سیاسی اور اقتصادی اندیشے ہیں انہیں اپیل کرتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر وہ بھی ایک طاقت ہے۔

نظر یہ آ رہا تھا کہ اقتدار کے لیے اب کے معرکہ آرائی زیادہ سخت ہوگی اس لیے کہ اب کے حکومت بنانے والوں کے پاس زیادہ اختیارات ہوں گے۔

حامد چچا پہلے پہل قومی سیاست کے میدان میں اترے تھے۔ پہلے تو انہوں نے یہ سوچا تھا کہ مناسب یہی ہے کہ اپنے حلقہ انتخاب سے تعلقہ داروں کا نمائندہ بن کر الیکشن لڑا جائے۔ تعلقہ داروں کے لیے صوبائی اسمبلی میں چار نشستیں ریزرو تھیں۔ ان کے لیے تعلقہ داروں کو آپس ہی میں الیکشن لڑنا تھا لیکن ریزرو نشست کے لیے راجا امیر پور نے اپنے ایک چھوکو آگے بڑھا دیا اور حامد چچا کو مشورہ دیا کہ آپ کا حلقہ انتخاب تو محفوظ ہے جس میں آپ کے اور راجہ بھیم نگر کے علاقے شامل ہیں لہٰذا آپ اس حلقے سے کھڑے ہو جائیں۔

میں دریچے سے دیکھ رہی تھی کہ سایہ لان میں پھیلتا جا رہا ہے اور وادی میں سے سرکتے سرکتے وہ سامنے والی چوٹیوں تک پہنچ گیا ہے اب کوئی دم جاتا ہے کہ شام پڑ جائے گی اور امیر یہاں سے رخصت ہو جائے گا۔ اور میرا اتنا بہت سا وقت اس کے بغیر کٹے گا۔ میں نے رسالے کے ورق الٹنے پلٹنے شروع کر دیے۔ میرے ذہن کی یکسوئی ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ آنکھ کے پھوڑے کی طرح پھدک رہا تھا، کبھی یہاں کبھی وہاں۔

مجھے چچا جان اور ان کے بن بلائے مہمانوں کی آوازیں سنائی دیں۔ باہر سے اٹھ کر اندر کی طرف آ رہے تھے۔ میں رسالوں کو ایک طرف پھینک پورچ کی طرف لپکی۔ میں نے سامنے والی سیڑھیوں کے پاس جا کر انہیں پکڑا۔ اگروال جی نے اپنی دل موہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہنے لگے "سیتا افسوس کر رہی تھی کہ تم سے ملاقات کے لیے نہیں آ سکی۔ اسے نزلہ زکام کی شکایت ہو گئی ہے۔"

"ارے، مجھے تو فکر ہو گئی۔ اللہ کرے جلدی اچھی ہو جائے۔" میں نے جواب تو یہی دیا لیکن میرے ضمیر نے مجھے کچوکا دیا۔ اصل میں اس خبر سے مجھ پہ کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

میں جب واپس کھیل کے مقام پر پہنچی تو دیکھا کہ سلیم بیٹھا دوسروں کو کھیلتے دیکھ رہا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر کوئی ایسا تعجب نہیں ہوا۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ حضرت کھیل کو چھوڑ چھاڑ بزرگوں کی گفتگو سننے کے لیے یہاں آ بیٹھے ہوں گے۔ سلیم بور سیاسی بحثوں میں شریک ہونے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتا تھا۔ بلکہ اپنی طرف سے خود بھی بحث چھیڑ دیتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں اس نے بہت درک حاصل کر لیا ہے۔

امیر نیٹ پہ کھڑا اپنے پارٹنر کا انتظار کر رہا تھا مجھے دیکھ کر مسکرایا اور مجھے لگا کہ میرے گال اور میرے

کانوں کی لویں گرم ہو گئی ہیں۔ میں مڑ کر سلیم سے باتیں کرنے لگی" اچھا ہوا یہ لوگ چلے گئے۔ مجھے یہ لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اس وقت بھی جب وہ محبت والفت کا دم بھرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ نیچے کوئی سخت اور کرخت چیز ہے جس پہ نرم ریشمیں غلاف چڑھا ہوا ہے۔"

"ڈیئر لیلیٰ! تمہارا وجدان تم سے کچھ کہتا ہے جس سے تمہیں بے کلی ہونے لگتی ہے۔ اصل میں انہی لوگوں کے وسیلے سے تاریخ کا عمل تمہارے طبقے کو نیست و نابود کرے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ فی الحال یہ دونوں صاحبان جاگیرداری نظام کے حاشیہ نشین بنے ہوئے ہیں۔"

سلیم اس وقت اپنی ترنگ میں تھا اور اپنے خیالات عالیہ کی تفسیر پیش کرنے پہ مائل نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایسا ظاہر کیا جیسے میں اس کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہی ہوں۔ وہ جاری تھا" آج میں نے ان صاحبان کی باتوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کی باتوں سے میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہمارا صوبہ اپنے کلچر کے واسطے سے کیوں اتنی شہرت رکھتا ہے اور ہمارے شہر کے تکلفات اور ادب آداب کی نزاکتوں اور نفاستوں کی اتنی دھوم کیوں ہے۔ ایسی مشکل بازی گری دنیا کے کسی اور شہر میں ممکن نہیں کہ آدمی آنکھوں دیکھتے دوسرے کی پیٹھ میں چھرا بھونکے اور اتنی انکساری، اتنی دل آویزی اور اتنے شاعرانہ انداز سے کہ چھرا مارنے والا اور چھرا کھانے والا دونوں ایک دوسرے کی عنایات کے ممنون نظر آئیں اور جوش ممنونیت میں بچھے جا رہے ہوں۔ یہاں سے مجھے عملی سیاست کا ایسا سبق ملا ہے کہ اس کے سامنے سیاست کے بارے میں نظری مباحث یوں نظر آتے ہیں جیسے کوئی اینجی ہوائی قلعے بنا رہا ہو۔"

"ابھی جب میں نے حامد چچا کو ان دو ذات شریف کے ساتھ گزرتے دیکھا تو وہ بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے......"

"ولی الدین صاحب یہ خبر لے کر آئے تھے کہ وہ خیر سے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ہیں اور اگرچہ ان بیچاروں نے بہت بچر مچر کی مگر کیا کریں، انہیں ہمارے والد ماجد کے مقابلے میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔"

"یہ تو بہت معنی خیز بات ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ جو ولی الدین صاحب ہیں، ہمیشہ اس فریق کا ساتھ دیتے ہیں جس کے متعلق انہیں گمان ہوتا ہے کہ وہ جیتے گا۔ مگر اگر وال جی کو وہ کس خوشی میں اپنے ساتھ لائے تھے۔"

"قصہ یہ ہے کہ کانگریس اور لیگ نے اس بات پر سمجھوتا کر لیا ہے کہ جہاں انگریزوں اور ان کی منظور نظر پارٹیوں سے مقابلہ پڑے گا وہاں یہ دونوں جماعتیں اپنے اختلافات کو فراموش کر کے ان سے مقابلہ کریں گی۔ اگر وال جی بہت دکھی ہو رہے تھے۔ اشارتاً انہوں نے یہ بتایا کہ کیا کیا جائے، مجبوری ہے۔ انہیں راجہ بھیم نگر پر، جو ان کے مقروض چلے آتے ہیں، یہ دباؤ ڈالنا پڑے گا کہ وہ ہمارے بابا کی حمایت سے دست کش ہو جائیں۔ دونوں نے بہت عذر معذرت کی اور جتایا کہ انہوں نے پہلے سے یہ بتا دیا ہے اور اس طرح گویا

حق دوستی ادا کیا ہے۔ ان صاحبان نے پاپا کو مشورہ دیا کہ جناب آپ اپنے ابتدائی منصوبے ہی کو اپنائیں اور تعلقہ داروں کے نمائندے کے طور پر نامزدگی حاصل کر کے ان کے خصوصی حلقۂ انتخاب سے الیکشن لڑیں۔''

میں بولی'' مجھے تو یہ میوزیکل چیئرز کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ خرانٹ لوگوں نے غیر اخلاقی باتوں کو الٹ پلٹ کر کے سیاسی کھیل کی شکل دے دی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جب اسد اپنے نظریات و عقائد کی باتیں کرتا تھا یا جب عینا اور میں بحثیں کیا کرتے تھے تو سیاست کتنی مختلف چیز نظر آتی تھی۔''

''دنیا میں اسد اور عینا نام کی جو مخلوق پائی جاتی ہے وہ بھی تو اگروالوں اور والی الدینوں کی مطلب براری میں بہت کام آتی ہے۔'' سلیم تحقیر بھرے لہجے میں کہنے لگا'' وہ جو مثل ہے کہ شیطان اپنے مطلب کے لیے مقدس صحیفوں کو بھی چوم چاٹ سکتا ہے، تو اگروالوں اور ولی الدینوں کو بھی تو کوئی مقدس صحیفہ درکار ہے۔ کیا مضائقہ ہے کہ ایسا کوئی صحیفہ تمہارے دوستوں کی طرف سے فراہم ہو جائے۔''

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا اور پھر سلیم کہنے لگا۔'' ارے ہاں میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ بیگم وحید بھی مسلم لیگ کی امیدوار کے طور پر کھڑی ہو رہی ہیں۔''

''اچھا واقعی! خیر یہ منطق کے عین مطابق ہے۔ اب وہ اپنے اسلامی جہاد کو بڑے پیمانے پر جاری رکھنے کا اہتمام کر سکتی ہیں۔ نادرہ تو بہت خوش ہوگی۔''

''اچھی لڑکی ہے۔ مجھے تو اچھی لگتی ہے۔''

''وہ تو نظر آ رہا تھا۔'' میں نے چھیڑ خانی کی۔

''تم اسے بلاتی کیوں نہیں ہو۔ میں نے تو اسے سیر پہ چلنے کی دعوت دی تھی۔ مگر کیا شرمیلی لڑکی ہے۔ میری دعوت قبول ہی نہیں کی۔ حالانکہ ایک پورا قبیلہ اس دوشیزہ کا ولی بن کے ساتھ ساتھ چلتا۔''

''مشکل یہ ہے کہ اسے دعوت دوں تو پھر سیتا کو بھی بلانا پڑے گا۔ اور سیتا تو اسے زہروں بری لگتی ہے۔ ہاں ایک بات پوچھوں؟ تم تو راز کی باتیں بہت جانتے ہو۔ یہ بتاؤ کمال سیتا سے اتنا متنفر کیوں ہے؟

''یہ تو کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ اور وہ اس سے متنفر تو نہیں ہے۔ اس کے برخلاف موصوف تو اس کی محبت میں سرشار تھے اور شاید اب بھی ہیں۔ جب لندن میں ان کی ملاقات ہوئی ہے اس کے فوراً ہی بعد یہ چکر چل پڑا۔ شروع میں تو بہت خوش تھی کہ کمال اس کی طرف متوجہ ہے، مگر جب بات بہت آگے بڑھ گئی تو بھڑک گئی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ کمال اس سے شادی کا خواہش مند تھا۔''

''بالکل تھا۔ ویسے تو وہ بہت تہذیب یافتہ ہے مگر اسے تھوڑا کھرچو تو اندر سے کٹر روایتی ہندو۔ اور مسلمانوں کے خلاف تعصب کا زہر بھرا ہوا۔''

''سلیم، یہ تم کوئی جائز بات نہیں کر رہے۔ سوچو کہ کیا کوئی مسلمان کسی ہندو لڑکے سے شادی کرے گی؟ ہمارا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔''

''شاید خود حفاظتی کے جذبے کے تحت مخصوص حالات میں یہ ممانعت ضروری تھی۔''

''بعض لوگ اس پر یہ کہیں گے کہ تم اللہ تعالیٰ کے قطعی اور ابدی احکامات سے روگردانی کر رہے ہو۔'' میں نے چھیڑنے کی غرض سے بات کی۔

''دینی بحثوں سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ لیکن سیتا کے رویے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ فرقہ وارانہ مسئلے کی حقیقت مجھ پر اب واضح ہوئی۔ آپ ایسے مذہب سے کیا توقع کر سکتے ہیں جو لوگوں کے ساتھ مل کر کھانے پینے سے منع کرتا ہے۔ جہاں آدمی پہ دوسرے کی پرچھائیں بھی پڑ جائے تو وہ بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں سچی دوستی یا افہام و تفہیم کیسے ہو سکتی ہے۔''

''رنجیت بھی تو تمہارا دوست ہے۔ ہے نا؟''

''لیکن وہ اس طرح کے نامعقول تعصبات میں مبتلا نہیں ہے۔''

''اس کے دادا نے بابا جان کے ساتھ مل کر کھانا کبھی نہیں کھایا۔ مگر وہ بابا جان کے یارِ غار تھے۔''

''تم سارے کے سارے سیاسی اور سماجی مسئلے کو ایک فرد کی مثال سے تو نہیں سمجھ سکتیں۔'' سلیم کا تحمل جواب دینے لگا تھا۔

میں نے بھی پلٹ کر ویسا ہی جواب دیا ''اور تم بھی کسی ایک مثال کو لے کر کلیہ تو نہیں بنا سکتے۔''

اتنے میں دوسرے لوگ آ گئے اور اس لیے یہ بحث اس سے آگے نہیں بڑھ پائی۔

جب ہم اٹھ کر اندر جانے لگے تو سلیم نے کہا ''آپ سب کو ڈنر کے لیے ٹھہرنا ہوگا۔ اس کے بعد برج چلے گی۔''

''اچھا خیال ہے۔'' رنجیت بولا۔

''سوری۔ مجھے تو جانا ہے۔'' رضا علی بولا ''ہماری اماں کا تقاضا ہوتا ہے کہ رات کا کھانا زنان خانے میں ان کے ساتھ کھایا جائے۔''

''امیر! تمہارا کیا خیال ہے؟''

''مَیں؟'' اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ اور میں نے اپنی خاموشی سے اس پر جتایا کہ تمہیں ٹھہرنا ہے۔ اس نے رضا علی سے پوچھا ''بھائی صاحب میں رک جاؤں؟''

''تمہاری مرضی ہے۔''

''شکریہ'' امیر نے سلیم سے کہا ''میں رک رہا ہوں۔''

جب ہم اندر داخل ہو رہے تھے تو اس نے مجھ سے بہت آہستہ سے کہا ''اسی حساب سے میں لگتا رہا تو غیرت نام کی چیز ذرہ برابر بھی باقی نہیں رہے گی۔''

پانچواں باب

ہمارے چچا جان کا موڈ اچھا نہیں تھا۔ اس سے ڈنر کا ماحول بھی متاثر ہوا۔ پھر جب انہوں نے کہا کہ میرے لیے کافی سٹڈی میں بھجوادی جائے کہ مجھے کچھ ضروری کاغذات پڑھنے ہیں تو ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

ہم اٹھ کر سٹنگ روم میں آ گئے۔ رنجیت کہنے لگا کہ میرے خیال میں چچا حامد کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سلیم کو ایسا موقع خدا دے۔ اس نے سیاسی صورتحال کے بارے میں اپنے خیالات عالیہ بگھارنے شروع کر دیئے۔ اس کی بحث نے تو چچی کا کام کیا۔ وہ جو ایک الکساہٹ چھائی ہوئی تھی وہ رفو چکر ہوگئی۔ کس زور زور سے بول رہے تھے۔ کوئی سنتا تو سمجھتا کہ لڑائی ہو رہی ہے۔

مجھے پتہ چلا کہ میں اپنا رومال کہیں بھول آئی ہوں۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف چلی۔ امیر لپک کر آیا اور دروازہ کھولنے لگا۔ وہ سب بحث میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ کسی کی نظر اس طرف پڑی ہی نہیں۔

بے کلی سے بولا "کیا تم جارہی ہو؟ اس گفتگو سے شاید بور ہوگئی ہو۔"

"اسے گفتگو کون کہے گا۔" میں ہنس دی "نہیں، میں بور نہیں ہوئی۔ میں ذرا جا رہی ہوں کہ کوئی رومال مل جائے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ میں اس بحث سے اکتا گئی ہوں۔ عمل کے نام صفر باتیں کروالو۔ خالی باتیں ہی باتیں۔ اس سے تو خاموشی بھلی۔"

"بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی جو کرنا چاہتا ہے وہ کر نہیں پاتا۔ مگر خاموشی تو ناممکن چیز ہے۔"

"یہ بات ہے تو پھر مجھے وہ زبان سیکھنی پڑے گی جو یہ لوگ بولتے ہیں۔"

"ہاں پھر کیا عجب ہے کہ ہمیں کوئی ایسی زبان میسر آ جائے جس میں ہم ایک دوسرے سے بات کر سکیں۔" امیر نے بڑی سادگی سے یہ بات کہی تھی۔ مگر میں شپٹا گئی اور اپنی شپٹاہٹ کو چھپانے کی کوشش میں مسکرانے لگی اور جلدی سے وہاں سے نکل گئی۔

جب میں واپس آئی تو کمال اس شان سے بول رہا تھا جیسے جلسے میں تقریر کر رہا ہو" دوستو، صرف ایک پارٹی ہے جس میں ہم شامل ہو سکتے ہیں۔ وہ پارٹی جس نے زمینداروں اور کسانوں کو محبت کے ایک

رشتے میں پرو دیا ہے۔ اگر تم پارٹی کے اس نصب العین کو اپنا نصب العین نہیں قرار دیتے تو گویا تم نے اس نظام کے جسم میں خنجر گھونپ دیا ہے جس سے متعلق ہونے کا ہمیں شرف حاصل ہے۔''

ہمارے قہقہوں اور نقلی تالیوں کے بیچ حامد چچا کی روکھی آواز سنائی دی جو سارے شور پہ چھا گئی۔

''ہاں یہ ایسا شرف ہے جس پر مجھے فخر ہے۔ اور تم میں سے کوئی بھی اس شرف کا مستحق نظر نہیں آتا۔''

''چچا دروازے میں کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پہ زردی کھنڈی ہوئی تھی اور ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ ایک دم سے سب چپ ہو گئے تھے۔ اس خاموشی میں آخر کمال نے سٹپٹائے سے لہجے میں کہا'' بابا، ہم تو مذاق کر رہے تھے۔۔۔۔۔''

''مذاق؟'' چچا جان اس پہ پھوٹ پڑے۔ درشت لہجے میں بولے'' ہماری ہستی خطرے میں ہے اور تمہیں مذاق کی سوجی ہے۔ ہمیں اپنے باپ دادا سے ورثے میں کچھ حقوق و مراعات ملے ہیں۔ ان حقوق و مراعات کا تحفظ ہمارا فرض ہے۔ مجھے ایسے ناشکر گزاروں کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا جو مراعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر اپنی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کرتے۔''

وہ پلٹے اور کمرے سے نکل گئے۔ چند منٹ تک ایک ایسی خاموشی طاری رہی جس سے ہم سب مغلوب نظر آ رہے تھے۔ پھر رنجیت بولا'' دیر ہو گئی۔ اب چلنا چاہیے۔''

کمال اور سلیم رنجیت اور امیر کو گاڑی تک چھوڑنے کے لیے گئے۔ میں اکیلی دریچے میں کھڑی انہیں جاتا دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اندھیرے میں گم ہوتے چلے گئے۔

ستارے چڑھتے چاند کی روشنی میں ماند پڑ گئے تھے اور پہاڑیوں کا سلسلہ دمکتے آسمان کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا نظر آ رہا تھا کہ جیسے تھیٹر کا سٹیج آراستہ ہو۔ خاموش جھیل میں چیزوں کا عکس جھلک رہا تھا۔ تاج، ہار اور رنگ برنگ روشنیوں کا عکس۔ ٹھنڈی بے نم رات خاموش تھی اور صاف شفاف۔ رات کو یہ فضا اور شام کی باتوں کی یادیں مل کر میرے پورے وجود میں ایک تلاطم پیدا کر رہی تھیں۔

سائرہ چچی کی ڈانڈی آن پہنچی۔ اس سواری کی آمد کا شور اس سناٹے میں کچھ اور زیادہ تیز سنائی دے رہا تھا۔ چچی ڈانڈی سے اتر کر اندر آئیں تو ان کے بیٹے بھی ان کے ساتھ تھے۔

پوچھنے لگیں'' رنجیت کے ساتھ جو نوجوان جا رہا تھا وہ کون تھا؟''

''رضا علی کا کزن امیر'' کمال نے جواب دیا۔

''امیر؟۔۔۔۔۔ رضا علی کا کزن؟ یہ کون سا کزن تھا۔ مجھے تو اس نام کا کوئی یاد آ نہیں رہا۔ اور میں تو اس خاندان کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ دوسری شاخ سے ہوگا۔'' انہوں نے ایسے لہجے میں دوسری شاخ کی بات کی جیسے وہ کوئی بہت ادنیٰ شاخ ہو۔

''آپ کا دوسری شاخ سے کیا مطلب ہے؟'' سلیم نے پوچھا۔

''بوڑھے راجہ صاحب کی دوسری بیوی سے جو نسل چلی ہے، وہ معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ حسب نسب والے نہیں تھے۔۔۔۔۔۔ کیا کرتا ہے؟''

''علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ پڑھاتا ہے۔ میرے خیال میں جونیئر لیکچرر ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ راجہ صاحب خرچ دیتے ہیں۔''

''امی، اس سے آخر کیا فرق پڑتا ہے۔ امیر اچھا لڑکا نظر آتا ہے۔ کم از کم رضا علی سے تو زیادہ ہی دلچسپ آدمی ہے۔'' کمال نے احتجاج کے لہجے میں بات کی۔

''اس سے یقیناً فرق پڑتا ہے۔'' سائرہ چچی نے ذرا اونچی آواز میں کہا ''اچھے حسب نسب سے بھی تو بڑا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں یہ باتیں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔''

''پلیز امی!'' سلیم دخل دیتے ہوئے بولا ''ہم نے آج بہت بحث کی ہے۔ آج کے دن کا کوٹہ ہم نے پورا کر لیا ہے۔''

''دن کو کوٹہ پورا کر لیا ہو یا رات کا۔'' سائرہ چچی بڑبڑانے لگیں ''حقیقت تو حقیقت ہی رہے گی۔''

کمال کھلکھلا کر ہنسا اور ماں سے گلے لگ کر کہنے لگا ''امی تمہارا کوئی جواب نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پورے کرۂ ارض میں تم سب سے بڑھیا ہو۔''

میں نے مسکرانا چاہا لیکن جو دن اتنا روشن چڑھا تھا اس کا انجام بدشگنی پر جا کر ہوا۔

چھٹا باب

مجھے اپنے چچیرے بھائیوں کے ساتھ باہر جانے کی اجازت مل گئی تھی، اس وجہ سے کہ وہ اس پر اڑ گئے تھے کہ مجھے ان کے ساتھ گھر سے نکلنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ تاہم ہماری چچی کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ غیر شادی شدہ لڑکی کو کھلی آزادی نہیں ملنی چاہیے اور کتنی ایسی تقریبات ہوتی تھیں جن میں مجھے بلایا ہی نہیں جاتا تھا۔ جہاں بلایا جاتا وہاں یہ لوگ مجھے ساتھ لے کر نہیں جاتے تھے۔ مجھے بھی اس کی کوئی ایسی پروا نہیں تھی۔ پارٹیاں تو محض بہانہ تھیں۔ ان کی اپنی جگہ کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت اس بات کی تھی کہ ان پارٹیوں میں امیر موجود ہوتا تھا۔ ایک تو وہ دنیا تھی جس میں میں اپنی پھپھیوں عابدہ ماجدہ کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک یہ دنیا تھی جس میں اب میں سانس لے رہی تھی۔ ان دونوں دنیاؤں کی قدریں ایک دوسری سے متصادم تھیں۔ اس سے میرے اندر شکوک وشبہات اور بہت سے سوال پیدا ہو گئے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میں اپنی ذات میں سمٹتی چلی گئی۔

میرے مسائل بے فکری اور تفریح کی عمومی فضا میں دب کر رہ گئے تھے۔ یہاں تو زندگی ان دعوت ناموں کے حساب سے بسر ہوتی تھی جو ڈاک اور ہرکارہ دونوں ہی ذریعوں سے موصول ہوتے تھے۔ مستطیل کی شکل کے سنہری کناروں والے کارڈ بورڈ کے دعوت نامے، وہ دعوت نامے جن کا کاغذ ابھرا ابھرا ہوتا تھا۔ کس کس کو یہ دعوت نامے پہنچتے ہیں، بس اسی سے آدمی کی حیثیت اس معاشرے میں متعین ہوتی تھی جو اقلیدسی طرز کے حلقوں کی شکل میں پھیلا نظر آتا تھا۔ اگرچہ ایک حلقے میں جو سانچے مروج ہوتے تھے ان کی نقالی دوسرے حلقوں میں بھی ہونے لگتی تھی لیکن ہندوستانیوں اور انگریزوں کے حلقے زیادہ تر ایک دوسرے سے الگ اپنی اپنی جگہ پھلتے پھولتے رہتے تھے۔ بس کبھی کبھی ان کا اتصال ہوتا تھا۔

ویسے تو اس گھر میں انگریز مہمان اب دادا کے زمانے کے مقابلے میں کہیں زیادہ آتے تھے لیکن ان میں سے کسی ایک انگریز کی دوستی اُس شان کی نہیں تھی جو شان مسٹر فری مینٹل اور ہمارے دادا کی دوستی کی تھی۔ مسٹر فری مینٹل بابا جان کے گزر جانے کے صرف ایک سال بعد تک زندہ رہے۔ اپنے وصیت نامے میں انہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ انہیں ان کے دوست کے برابر دفن کیا جائے۔ چنانچہ حسن پور کے آموں کے باغ میں جو ہمارا خاندانی قبرستان تھا اس میں ان کی بھی قبر بنی۔ صرف سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ایک صلیب اس قبر کو ہماری خاندانی قبروں سے ممیز کرتی تھی۔

پورے موسم ہر پھر کر وہی لوگ دکھائی دیتے رہے۔ چہرے وہی مگر ہر دعوت کے ساتھ ان کی سنگت بدل جاتی تھی۔ ایک دعوت میں چند منتخب چہرے دکھائی دے رہے ہیں تو دوسری دعوت میں ان میں سے چند چہرے وہی، باقی دوسرے چہرے جو پچھلی دعوت میں نہیں تھے اور یہاں سے اوجھل ہو کر پھر کسی اگلی دعوت میں دکھائی دیتے۔ گھر بھی گنے چنے تھے۔ انہی میں یار لوگ گردش کرتے رہتے تھے۔ دعوتوں کا بھی ایک بنا بنایا رنگ تھا۔ لنچ، ڈنر، ٹی، سب کی ایک بندھی ٹکی صورت تھی۔ کس دعوت میں کتنے کورس چلے، اس سے دعوتوں میں میزبانی کا معیار جانچا جاتا تھا اور کس دعوت میں کتنے خطاب یافتہ مہمان آئے اور کتنی اہم سرکاری شخصیتیں شریک ہوئیں، اس سے دعوت کرنے والے کے سماجی مرتبے کا تعین ہوتا تھا۔ ان دعوتوں میں خواتین و حضرات خود بخود الگ الگ حلقوں میں بٹ جاتے تھے۔ اس طرح زنانہ حلقے اور مردانہ حلقے میں بٹ جانے کے بعد یہ مہمان مخلوط سوسائٹی کے ادب آداب بہت محتاط انداز میں نباہتے تھے۔ یہ محتاط انداز کچھ اسی قسم کا تھا جو وہ اس وقت اختیار کرتے تھے جب انہیں چھری کانٹے سے نامانوس مغربی کھانے کھانے پڑتے تھے۔ جو خواتین مردوں سے بے تکلفی سے ملتی تھیں انہیں دوسری خواتین شک کی نظروں سے دیکھتی تھیں اور ان کے خلاف باتیں کرتی تھیں۔ جو پالتو جانور تاروں سے گھرے قطعات میں رکھے جاتے ہیں شاید ان کا طور بھی یہی ہوتا ہو۔ ان کا جو ساتھی جانور آوارہ پھرتا پھراتا اپنے محفوظ مقام سے تھوڑا نکل کر غیر محفوظ جگہ پر جا نکلتا ہوگا، اس احتیاط کے ساتھ کہ اپنے محفوظ مقام سے قریب ہی رہے، اس کے خلاف بھی شاید پالتو برادری کا ردعمل ایسا ہی ہوتا ہو گا۔

بس ایک شخصیت تھی جس نے شاید ہی کبھی اپنے گھر میں دعوت کا اہتمام کیا ہو۔ یہ تھے راجہ امیر پور۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے گھر میں سخت پردہ کیا جاتا تھا۔ انہیں یہ بات زیبا نظر نہیں آتی تھی کہ گھر پہ عورتوں اور مردوں کو اکٹھا مدعو کیا جائے۔ ان کی طرف سے جو پرتکلف دعوتیں دی جاتی تھیں ان کا اہتمام یا تو بنکوئٹ ہال میں ہوتا تھا یا رنتز ہوٹل کے گارڈن ٹیریس میں۔ رنتز ہوٹل کی کہانی یہ ہے کہ ایک مرتبہ راجہ صاحب کے والد صاحب اس میں قیام کرنا چاہتے تھے۔ ہوٹل والوں نے انہیں ٹھہرانے سے انکار کر دیا۔ راجہ صاحب کے غرور کو ٹھیس لگی۔ انہوں نے تاؤ میں آ کر پورا ہوٹل ہی خرید لیا۔

اس سیزن میں راجہ امیر پور نے مہمانوں کی تواضع کے معاملے میں ایک نئی طرح ڈالی تھی۔ ہر پارٹی کے بعد مہمانوں کو لے کر سینما جاتے۔ وہاں ایک ہی تو سینما گھر تھا، اس کی بالکنی والی ساری نشستیں اپنے مہمانوں کے لیے ریزرو کرا لیتے تھے۔

تفریح کی اس قسم سے ہمارے بزرگوں کا تعارف زندگی میں کہیں بہت دیر میں جا کر ہوا۔ اس موقع پر ان کا جو ردعمل ہوتا تھا اس سے ہم بہت محظوظ ہوتے تھے۔ جب محبت کا کوئی سین آتا یا بوسے کا موقع آتا تو بہت سٹپٹاتے تھے۔ اگرچہ اندھیرا ہوتا تھا لیکن اس اندھیرے میں بھی ہم ان کی سٹپٹاہٹ کو محسوس کر

سکتے تھے۔ ہماری چچی کو ایسے موقع پر بالعموم کھانسی کا دورہ پڑ جاتا اور چہرے کو رومال میں چھپا لیتیں۔ ایک دفعہ فلم میں محبت کا ایک بہت جذباتی سین آ جانے پر راجہ امیر پور تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر باہر چلے گئے، اس وجہ سے کہ وہ معزز خواتین کے ہوتے ہوئے ایسی بے حیائی کا مظاہرہ دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔

میں تنہائی کی ماری اب خوش رہنے لگی تھی۔ پہلی مرتبہ مجھے ایسے گروپ میں شامل ہونے کا موقع ملا جس کا بڑوں کے وسیع تر حلقے سے باہر زندگی گزارنے کا اپنا ایک طور تھا۔

ہمیں پابندیوں کے ساتھ آزادی ملی تھی۔ اپنی اس پابند آزادی کی وجہ سے میں اور نادرہ دونوں چپکے چپکے سیتا پہ بہت رشک کرتے تھے۔ جتاتی وہ یہی تھی کہ وہ کسی رسم و رواج کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ہاں جو پابندیاں اس نے اپنی مرضی سے قبول کر لی ہیں انہیں ضرور نباہتی ہے۔ مردوں کی صحبت میں ہم تو بہت اکھڑے اکھڑے رہتے تھے لیکن وہ تو اپنی نسوانیت پر ناز کرتی نظر آتی تھی، اگرچہ اس نے مسز لال کی طرح اپنی نسوانیت سے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہاں وہ توجہ کی نظروں کی ضرور طالب تھی اور ایسی نظر کو وہ پذیرائی بخشتی تھی۔ ایک ہم تھے کہ کوئی ہمیں نظر بھر کے دیکھ لیتا تو ہم سٹپٹا جاتے۔

امیر پور کے رضا علی پر سیتا کا جادو چل گیا۔ موصوف حکم کے غلام بن کر رہ گئے تھے۔ باقی تو بھونڑے تھے۔ تھوڑا منڈلائے، بھن بھنائے اور اڑ گئے۔ اس کا انحصار اس پر تھا کہ وہ کتنی چھٹی لے کر آئے ہیں۔ ان میں بھانت بھانت کی مخلوق تھی۔ ایک انگریز شاعر تھا جس نے داڑھی بڑھا لی تھی۔ وہ مشرق کی روح کا متلاشی تھا۔ اس نے اپنی دو حرکتوں سے انگریزوں کی برادری کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ ایک تو اس نے ہندوستانی کپڑے پہننے شروع کر دیئے تھے۔ دوسرے یہ کہ چھری کانٹا چھوڑ کر ہاتھ سے کھانا کھاتا تھا۔ انہی میں ایک خوفناک مونچھوں والا فوجی نوجوان تھا۔ بڑی مشق کر کر کے انگریزوں کی طرح رک رک کر بولتا تھا۔ اس نے ایسا فوجی لہجہ اپنایا تھا جو سندھرسٹ کے تربیت یافتہ افسروں کی نقل تھا۔ وہ ان افسروں کی اتنی ہی نقالی کرتا تھا جتنا وہ افسر اپنے پیشرو فرنگی افسروں کی نقالی کرتے تھے۔

بس ایک شخص تھا جو سیتا سے دانستہ بے اعتنائی برتتا تھا۔ وہ کمال تھا۔ بس میں نے اپنی تیز حس کے زور پر بھانپ لیا کہ وہ کمال کی موجودگی میں کیوں اتنے ناز و انداز دکھاتی ہے اور کمال کیوں اس کی موجودگی میں مسز لال کا پروانہ بن جاتا ہے۔ کسی کسی گھڑی جب میں ان دونوں کے متعلق سوچتی تو سیتا پر غصہ آتا تھا اور کمال پر ترس۔

لے دے کے ایک مسز لال ہی تو سیتا کی حریف تھیں۔ مت پوچھو کہ دونوں ایک دوسرے پہ کس طرح صدقے واری ہوتی تھیں۔ محبت کا اس طرح کا مظاہرہ تو اسی صورت میں ہوتا ہے جب دونوں طرف اندر ہی اندر نفرت پل رہی ہو۔

لیکن جوان اور بھرپور زندگی جو مسرت اپنے جلو میں لے کر آتی ہے وہ ان سب آویزشوں پر حاوی تھی۔

ساتواں باب

تین خط ایسے آئے کہ جس دنیا کو میں بھول بیٹھی تھی اس میں وہ مجھے پھر کھینچ کر لے گئے۔ پہلا خط نندی کا بھیجا ہوا پوسٹ کارڈ تھا جسے پڑھنا بہت مشکل تھا۔ اس نے خود ہی لکھا ہوگا۔ پہلے تو میرے لیے دعا لکھی تھی کہ خوش رہو، صحت و تندرستی رہے، لمبی عمر پاؤ۔ پھر خاندان کے ایک ایک فرد کا نام لے کر ادب کے ساتھ سلام لکھا تھا۔ گھر کے نوکروں کو بھی فرداً فرداً سلام لکھا تھا۔ پھر بہت دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی تھی کہ اللہ میاں نے سلیمن کو اس ظالم اور دکھ بھری دنیا سے بلا لیا اور اپنی آغوشِ رحمت میں لے لیا۔

ہماری چچی جان نے یہ خط مجھے دینے سے پہلے یقیناً خود پڑھا تھا۔ انہوں نے تبصرہ آرائی شروع کر دی کہ برے کام کا برا انجام۔ میری آنکھوں میں آنسو امنڈنے لگے تھے۔ میں نے انہیں یہ دیکھنے تھوڑا ہی دیا۔ میں ان کی طرف سے منہ پھیر کے وہاں سے اٹھ گئی۔

میں نے اپنے کمرے کی تنہائی میں بیٹھ کر سلیمن کو یاد کیا۔ کیونکہ یہاں اور کوئی تو ایسا نہیں تھا کہ میرے ساتھ بیٹھ کر میرا یہ غم بٹاتا۔ ایک نندی تھی سو وہ دور جا بیٹھی تھی۔

دوسرا خط عابدہ پھپھی کے میاں کا چچا جان کے نام تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ان کا حمل گر گیا ہے۔ ہسپتال میں ہیں اور اب بفضلہٖ تعالیٰ خطرے سے باہر ہیں۔ لیکن بیمار بہت ہیں۔ مزید لکھا تھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو انہیں جلد از جلد آشیانے پہنچا دیا جائے۔ ان کے ڈاکٹروں نے یہی مشورہ دیا ہے۔

زہرا کا جو مجھے خط آیا اس میں مزید تفصیلات درج تھیں۔ پہلے تو اس نے بڑی تفصیل سے شملہ میں اپنی مصروفیات کا ذکر کیا۔ چلتے چلتے یہ بھی ذکر کیا کہ وائسرائے سے، اس کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں سے اور دوسری کتنی ہی اہم شخصیات سے اس کی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ آخر میں اس نے اپنی اماں کے خط سے پورا ایک پیراگراف نقل کیا جس میں عابدہ پھپھی کا حال درج تھا۔

معلوم یہ ہوا کہ جب عابدہ پھپھی کی طبیعت بگڑنے لگی تو مقامی دائی کو بلایا گیا، اس وجہ سے کہ لیڈی ڈاکٹر تو ادھر ایک ہی تھی جو قریب والے قصبے میں کام کرتی تھی مگر ان دنوں وہ کہیں گئی ہوئی تھی۔ اور مرد ڈاکٹر کو اس لیے نہیں دکھایا گیا کہ پھپھی کی خوش دامن صاحبہ مرد سے علاج کرانے کے سخت خلاف تھیں۔ مگر جب حالت بہت بگڑ گئی اور خطرے کی حد تک پہنچ گئی تو آخر ان کے میاں انہیں سول سرجن کو دکھانے پر مصر

ہوئے۔ سول سرجن نے جھٹ پٹ انہیں لکھنؤ کے میڈیکل کالج ہسپتال میں بھجوایا۔

اس خونخوار منافقت اور جہالت پر میرا تو خون کھولنے لگا جس نے سلیمن کی جان لے لی اور عابدہ پھپھی کو موت کی دہلیز پہ پہنچا دیا۔ میں نے بہت عرصے سے انہیں کوئی خط نہیں لکھا تھا اور پچھلے تھوڑے عرصے سے تو کبھی ان کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اب سے چار ماہ پہلے میں نے یہ خبر سنی تھی کہ خدا خدا کر کے اب ان کے ماں بننے کا وقت آ گیا ہے۔ میں بہت خوش ہوئی تھی۔ اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا کہ اس عمر میں، اور جو ان کی صحت کی حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے پیدائش کا معاملہ ذرا نازک ہے۔

اور اب مجھے موت کے خوف نے آ لیا تھا۔ ساتھ میں یہ اندیشہ بھی ستا رہا تھا کہیں یہ نہ ہو کہ وہ دنیا سے گزر جائیں اور انہیں یہ پتہ ہی نہ چلے کہ میں انہیں کیا کچھ سمجھتی تھی۔ مجھے یہ خواہش ہوئی کہ مجھے اس وقت ان کے پاس ہونا چاہیے۔ مجھے ایک احساسِ جرم ستانے لگا اور ایک مبہم سے ڈر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میں سائرہ چچی کے پاس پہنچی اور پوچھنے لگی کہ میں عابدہ پھپھی کے پاس چلی جاؤں؟ ان محرکات نے جو مجھے یہاں ٹھہرے رہنے پہ مائل کر سکتے تھے ابھی میرے اندر طاقت نہیں پکڑی تھی۔

سائرہ چچی اپنے کمرے میں کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ ان کے دن بھر کے اوقات اسی حساب سے بنے ہوئے تھے کہ صبح کو کون سا لباس پہننا ہے، دوپہر کو کون سا اور شام کو کون سا۔ اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بڑی احتیاط سے چہرے پر پاؤڈر مل رہی تھیں۔ آیا بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

ایک جذباتی کیفیت سے مغلوب میں نے بے ساختہ کہا "میں لکھنؤ جانا چاہتی ہوں۔ مجھے جا کر عابدہ پھپھی کی خدمت کرنی چاہیے۔"

سائرہ چچی کی تعجب سے یہ کیفیت ہوئی کہ ان کے ہاتھ رخساروں سے ہٹ کر زانوؤں پر آ گئے۔

"یہ تمہارے دماغ میں کیا سمائی ہے؟" یہ کہتے ہوئے ان کی تیوری پہ بل پڑ گئے "اس کا فائدہ کیا ہو گا؟ تم کیا کرو گی؟ ان کی پوری طرح دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ اور پھر تم اکیلی کیسے سفر کر سکتی ہو؟ ادھر کالج کی روانگی سر پہ کھڑی ہے۔ تم جذباتی ہو رہی ہو۔ بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

"بس ان کے پاس جانے کے لیے طبیعت چاہ رہی ہے۔"

"ویسے تو تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن آدمی کو اپنے حواس بجا رکھنے چاہئیں۔ بہر حال بعد میں کسی وقت جب تمہارے انکل گھر پہ ہوں گے، اس پہ بات کریں گے۔" ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس وقت وہ اس بارے میں مزید بات نہیں کریں گی۔

وہاں سے لوٹی تو مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ اب فیصلہ مجھے نہیں کرنا، انہیں کرنا ہے لیکن اسی کے ساتھ مجھے اپنے آپ سے نفرت بھی ہو رہی تھی۔

اس کے بعد شام کو میں نے امیر کو بتایا کہ میں عابدہ پھپھی کے پاس جانے کا ارادہ کر رہی ہوں۔ وہ حیران رہ گیا اور مجھے ایسے دیکھا کہ جیسے اسے اس بات سے بہت تکلیف ہوئی ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک عجب سی خوشی محسوس ہوئی۔

''کیا تمہارا جانا بہت ضروری ہے؟'' اس نے بے چین ہو کر پوچھا ''ویسے تو ہم سب ہی کو یہاں سے جلدی ہی روانہ ہونا ہے۔ چھٹیاں بہت لمبی تو نہیں ہوا کرتیں۔''

''مجھے اس وقت ان کے پاس ہونا چاہیے۔'' میں گویا اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ چاہیے والی بات ہے یا واقعی تم ان کے پاس جانا چاہتی ہو؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ڈانوا ڈول ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میں خود غرض ہو گئی ہوں۔ میرا یہ فرض ہے کہ۔۔۔۔۔''

''تمہارا اپنے سلسلے میں بھی کوئی فرض ہے؟ تمہیں اپنی زندگی خود ہی بسر کرنی ہے۔ دوسرے آ کر تمہارے لیے بسر نہیں کریں گے۔ وہ بھی تو خود غرض ہو سکتے ہیں۔ آدمی کو چننا پڑتا ہے اگرچہ ایسے موقع پر چناؤ بہت مشکل ہوتا ہے۔'' اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ مجھ سے لفظوں میں کچھ سننا چاہتا ہے، اس سے آگے کا کچھ تقاضا کر رہا ہے۔

میرا دل اس زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ اس بھرے کمرے میں ہم اکیلے تھے۔ ہم برابر برابر بیٹھے تھے مگر اس طرح کہ ایک دوسرے کو چھو نہیں رہے تھے۔ اور اب وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ایسے ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے۔ البتہ جب اس نے سگریٹ بجھایا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ مگر اس گھڑی ہم آپس میں اتنے قریب آ گئے تھے جتنا پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔

''میں رک رہی ہوں۔'' میں نے سرگوشی میں کہا اور اسی کے ساتھ دوسروں کو دیکھنے لگی جو ہم سے بے خبر اپنے حال میں مگن ہنس رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔

''شکریہ!'' اس نے آہستہ سے کہا ''ہمیں کیا پتہ کہ ہمارے لیے کتنا وقت لکھا گیا ہے؟''

لیکن وقت کے اس گھڑی کوئی معنی نہیں تھے۔ اس بھرپور لمحے میں میں کہاں سوچ سکتی تھی کہ وقت کب شروع ہوا اور کہاں جا کر ختم ہوگا۔

آٹھواں باب

میں خوش تھی کہ میں نے اپنے جانے پہ بہت زور نہیں دیا تھا۔ دن جلدی جلدی گزر رہے تھے اور جدائی کا وقت، جس سے مفر نہیں تھا، قریب آتے جا رہے تھے۔ اس عالم میں امیر کو اور مجھے ملاقات کا ایک ایک لمحہ قیمتی نظر آ رہا تھا اگرچہ ہمیں تنہائی میسر نہیں تھی اور ہماری کیفیات کو اظہار کا موقع ہی میسر نہیں آیا۔

ہر صبح جس پل میری آنکھ کھلتی وہ پل ایک آنند کے ساتھ نئے دن کا سواگت کرتا نظر آتا تھا۔ آنکھ کھلنے پر جو پہلا منظر نظروں کے سامنے ابھر کر سامنے آتا وہ اس بلند و بالا چوٹی کا تھا جو لگتا تھا کہ میرے بیڈروم کے دریچے میں فریم کر کے سجا دی گئی ہے۔ اسے دیکھ کر اب پہلے کی طرح ہیبت طاری نہیں ہوتی تھی اور اس طرح کا ڈر نہیں لگتا تھا کہ اس کے دامن میں ایسی طاقتیں چھپی بیٹھی ہیں کہ ایک دفعہ انہیں ڈھیل مل گئی تھی تو انہوں نے درختوں سے لدی چھندی ڈھلوانوں میں گھاؤ ڈال دیئے تھے اور اپنی کڑک اور گرج سے جھیل کے کنارے سکون سے پھیلی ہوئی آبادی کو تہس نہس کرنے پر تلی نظر آتی تھیں۔ اب دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ چوٹی اپنے آپ میں سمٹ گئی ہے اور ایک طاقتور الوہی سکوت کے ساتھ اپنی پناہ دینے والی آغوش کو وا کئے کھڑی ہے۔

اس منور دنیا میں لگتا تھا کہ دعائیں قبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہیں۔ سو عابدہ چچی کو ضرور بالضرور شفا نصیب ہوگی۔

یہ ایسی دنیا تھی جہاں حامد چچا کا سیاست گزیدہ غیظ و غضب یوں نظر آتا تھا جیسے تیوہار کے موقع پر چھوٹنے والے پٹاخے ہوں، سائرہ چچی کے وعظ و پند سن کر لگتا تھا کہ سکول کی کوئی کلاس لگی ہوئی ہے اور رٹا رٹایا سبق دہرایا جا رہا ہے، اور افواہ بازیاں یوں معلوم ہوتی تھیں کہ جیسے بے ضرر مچھر بھن بھنا رہے ہیں اور کاٹ رہے ہیں۔

جب کمال کا نام مسز لال کے ساتھ جوڑا گیا تو ہماری چچی بہت پریشان ہوئیں۔ مگر ہمارے کزن صاحبان نے ان کی فکر و پریشانی کو سرے سے درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ انہوں نے چچی سے کہا کہ بیبیاں جو سریاں چھوڑتی ہیں ان پر کان دھرنا ہی بے عقلی کی بات ہے۔ ان بیبیوں نے بظاہر برقع اتار دیا ہے لیکن ان کے دل و دماغ ابھی تک برقع سے لپٹے لپٹائے پڑے ہیں۔ رہے یہ مرد صاحبان تو ویسے تو وہ سوشل طور پر خواتین سے ملتے جلتے ہیں لیکن ذہنی طور پر انہوں نے عورتوں کو حرم اور زنان خانوں میں دھکیلا ہوا ہے۔

یہ ہنستے مسکراتے دن چپکے چپکے کس پھرتی سے گزر گئے اس کا احساس ہمیں اس وقت ہوا جب رنجیت نے کمال کے اعزاز میں الوداعی پارٹی دے کر ہمیں اس میں مدعو کیا۔ ایسا لگتا ہی نہیں تھا کہ کمال کو جانا بھی ہے اور اس کے بعد دوسروں کو بھی جلد رخصت ہونا ہے۔ لیکن نوجوان دلوں دماغوں میں کوئی فکر کوئی پریشانی مستقل ڈیرا نہیں ڈال سکتی۔ چنانچہ ہم نے اس پارٹی کا اس طرح انتظار کیا جیسے یہ ہمارا آخری نہیں پہلا گیٹ ٹوگیدر ہے۔ جب پارٹی کا دن آیا تو ہم نے پارٹی سے غرض رکھی، آگے کی چنتا نہیں کی۔

جب ہم جھیل کی طرف جا رہے تھے تو سورج ڈوبنے لگا تھا۔ بادلوں نے اس سے رنگ چرایا اور اب یہ سنہری شعلہ صفت بادل مغربی سمت والی چوٹیوں پر تیر رہے تھے۔ اور کتنے بادل گالوں کی صورت بکھر گئے تھے۔ ان گالوں میں ہلکے ہلکے رنگ کی ایک رمق دوڑ رہی تھی۔ اونچے نیلے آسمان پر اور مشرق کی سمت بھورے اُفق پر یہ گالے اِدھر سے اُدھر تک اڑتے پھر رہے تھے۔ ایک بادل نے جانور کی شکل اختیار کر لی تھی۔ پیٹ بھورا بھورا مدہم مدہم سا، پشت سنہری گلابی۔ اس رنگ اور شکل کے ساتھ وہ بادل پوری جھیل پر پھیلا نظر آ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک دمکتی رنگت پورے بادل میں سرایت کر گئی اور پھر اس کے سائے میں لہریں لیتی سطحِ آب بھی لَو دینے لگی۔ مگر یہ سطحِ آب دور کے کناروں پر اندھیرے میں ڈوبتی پہاڑیوں کے عکس سے سرمئی نظر آ رہی تھی۔

اُودی اُودی نیلی نیلی دُھند پہاڑیوں کے سلسلوں پر منڈلا رہی تھی۔ کھائیوں میں، درزوں میں جہاں اسے گنجائش نظر آتی وہاں سما جاتی۔ سورج اب چھپ گیا تھا لیکن اس سے پھوٹتی رنگت سے بادلوں کا رنگ گہرا ہوتا، اور بدلتا چلا جا رہا تھا اور اس کا عکس پورے منظر پہ پڑ رہا تھا۔

دھیرے دھیرے دھند کا اوپر کی سمت میں پھیلنے لگا۔ جب ہم اس سڑک پہ پہنچے ہیں جس کے دونوں طرف بید لرزاں کے درخت کھڑے تھے اور جو جھیل کے گرداگرد چلی گئی تھی تو سیاہ ہوتے آسمان پر ستارے نمودار ہونے لگے تھے اور پہاڑیوں پر اور سڑکوں پر پھیلتے دھند لکے میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور جھیل کے اندھیرے پانی پر ان کے عکس جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔

بوٹ ہاؤس کے کمرے میں پہلے میں اور نادرہ داخل ہوئے۔ ہمارے پیچھے پیچھے کمال اور سلیم آئے۔ جب ہم داخل ہوئے ہیں تو رنجیت کے ساتھ صرف سیتا تھی۔ امیر اور رضا علی کو وہاں نہ پا کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ ہم سب سے یہی کہا گیا تھا کہ جلدی آنا ہے۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔

کمرے میں روشنی مدہم مدہم تھی۔ اس مدہم روشنی میں سیتا شعلے کی طرح چمک دمک رہی تھی۔ کمال کی خاطر میں سوچ رہی تھی کہ دوسرے لوگ بھی جلدی ہی آ جائیں تو اچھا ہے۔

رنجیت نے بہت خوش ہو کر ہمارا سواگت کیا۔ وہ ایسے خوش ہو رہا تھا جیسے کوئی بچہ اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا کام دکھا کر خوش ہوتا ہے۔ "ہے نا پہلے سے مختلف نقشہ۔" اس نے ایسے اشارہ کیا کہ پورا کمرا اس ایک

اشارے میں سمٹ آیا۔

کمرے کی تو سچ مچ کایا کلپ ہو گئی تھی۔ اب وہ وکٹوریائی طرز والا گمبھیر ایوان نہیں رہا تھا جہاں راجہ امیر پور ثقہ قسم کی پارٹیوں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ وہاں جو منقش فرنیچر تھا وہ اب اٹھ گیا تھا۔ روشنیوں پر کاغذ چڑھا دیئے گئے تھے اور یوں روشنی مدہم ہو گئی تھی۔ قالین اٹھا دیا گیا تھا اور چوبی فرش کو ڈانسنگ کی خاطر پالش کر کے چمکا دیا گیا تھا۔ کونے میں ایک تختہ لگا کر اس پر بیئر کی بوتلوں میں موم بتیاں لگا کر روشن کر دی گئی تھیں۔ موم بتیاں اس وقت کیا خوب جھلملا رہی تھیں۔

رنجیت کا ذاتی خدمت گار ہری اچکن ڈالے نارنجی پگڑی باندھے بار کے پیچھے کھڑا تھا۔ یہ لباس اس کی سفید لمبی کڑھی ہوئی داڑھی اور راجپوتی سورماؤں والے طور کے ساتھ لگا نہیں کھا رہا تھا۔

"رضا علی چکرا جائے گا۔" کمال بولا "وہ تو اس جگہ کو پہچان ہی نہیں پائے گا۔"

سیتا منہ بنا کر بولی "رضا علی کو تھوڑے ایسے ذہنی دھچکے لگنے چاہئیں۔ وہ اتنا شریف آدمی ہے کہ اسے دیکھ کر میرا چیخ مارنے کو جی چاہتا ہے۔"

سلیم بولا "اپنی چیخوں کو دبانے کے لیے تمہیں بہت زیادہ مشق کرنی پڑی ہوگی؟"

سیتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رنجیت نے بار میں سے آواز لگائی "دوستو! پینے پلانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"مجھے تو بس تھوڑی وہسکی دے دیں پلیز!" سلیم نے جواب میں کہا۔

کمال بولا "ادھر بھی یہی ہو جائے۔"

ان دونوں کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ سکول سے بھاگے ہوئے دو لڑکے ہیں۔ انہوں نے تو یہ سیکھا تھا کہ بڑوں کے سامنے نہیں پینی چاہیے۔

"میرے لیے جملٹ" سیتا بولی "جن میں اچھی بات یہ ہے کہ وہ بالکل پانی کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ ہماری ماتا جی بس ایک ہی بات سے مجھے روکتی ہیں۔ پینے سے۔ میرا خیال یہ ہے کہ میرے بھیا کو مدہوش دیکھ دیکھ کر اس چیز سے نفرت کرنے لگی ہیں۔ کہا کرتی ہیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "آپ کیا لیں گے" تو یہ سب سے خطرناک فقرہ ہے۔"

رنجیت نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا "نادرہ اور لیلیٰ! آپ لوگ کیا لیں گے۔"

"شکریہ، ہم کچھ نہیں لیں گے۔"

"نیک بچیاں ہیں۔" سیتا چہک کر بولی۔

نادرہ کا منہ غصے سے لال ہو گیا۔ اور میں نے کہا "نادرہ! آؤ چلیں۔ ذرا اپنے کوٹ اتار آئیں۔"

ہم چمکتے دمکتے برآمدے سے گزر کر ڈریسنگ روم میں پہنچے۔

جب ہم اپنے جوتے بدل رہے تھے تو نادرہ یکا یک بولی" مجھے یہ بی بی زہروں بری لگتی ہے۔ دماغ تو عرش پہ ہے، اور رضا علی سے جو سلوک کرتی ہے اس سے تو وہ مجھے بہت ہی بری لگتی ہے۔ اسے ایسا سمجھتی ہے جیسے کوئی پالتو کتا ہو۔ کبھی تھپک دیا کبھی ہت کہہ کے دور کر دیا۔ جس وقت جیسا موڈ ہوا۔ اور مجھے رضا کی بھی یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ اس نے کیوں اسے یہ اجازت دے رکھی ہے۔ میں تو یہاں آ کے پچھتا رہی ہوں۔ سارا تصنع کا ماحول ہے۔ میں تو یہاں اکھڑی اکھڑی لگ رہی ہوں۔ میں ڈانس تو کرتی نہیں، پھر تو میں یہاں اُلو ہی لگوں گی۔"

"نادرہ! ارے ایسی بھی کیا بات ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ وہ میری افسردگی کی بھی تو ترجمانی کر رہی تھی" ارے بہت مزہ آئے گا۔ ہم تو ان کی حرکتیں دیکھیں گے اور اپنی باتیں کریں گے۔ اور آخر تم سیتا کو دیکھ کر اکھڑ کیوں جاتی ہو۔ ویسے جیسا سخت مزاج وہ اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہے ویسی وہ ہے نہیں۔ یہ تو بہروپ ہے۔ اور اس بہروپ کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔ اور ایک بات اور ہے۔" اب مجھے اسے چھیڑنے کی سوجھی" کم از کم یہاں ایک ذات شریف ایسے ضرور ہیں کہ تمہاری خاطر یہاں ہیں۔ اگر تم یہاں نہ آتیں تو یہ محفل اس پر بہت بھاری گزرتی۔"

نادرہ اس بات پر بہت بگڑی۔ مگر جس طرح وہ شرمائی اور سٹپٹائی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ بگڑنا بالکل جھوٹ موٹ کا لگتا تھا۔" لیلیٰ تم نے بہت فضول بات کی ہے۔ پتہ نہیں تم نے اپنی طرف سے کیا کیا جوڑ لیا ہے۔"

بس اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سلیم کو چاہتی ہے۔ لیکن میں اندر سے یہ طے کئے بیٹھی تھی کہ جس طرح ٹوٹ کر میں امیر کو چاہتی ہوں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جب ہم دونوں یہاں واپس آئے تو دیکھا کہ رنجیت، کمال اور سلیم بار کے قریب کھڑے کوئی بحث کر رہے ہیں۔ سیتا ایک کونے میں بیٹھی خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ عجیب کیفیت تھی اس کے چہرے پر۔ وہ بے خبری میں پکڑی گئی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اچانک اسے میری موجودگی کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایسا لگا کہ جیسے جلتی روشنی کا کسی نے بٹن دبا دیا ہو۔

رنجیت کہہ رہا تھا" تمہیں تو تھوڑی آسانی ہے۔ تمہارے والدین تو تمہارے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی حد تک چلتے بھی ہیں۔ لیکن میرے والدین تو مجھے ذرا سی رعایت دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ تو تمہاری دنیا اور ہے، میری دنیا اور ہے۔"

"اصل میں ہماری نسل ایک عبوری مرحلے میں آ کر پھنس گئی ہے۔ دو دنیاؤں کی آویزش۔۔۔۔۔" سلیم نے بڑے دانشورانہ انداز میں بات شروع کی تھی۔

"ہاں ہاں یار، میں یہ سب باتیں خوب سمجھتا ہوں۔" رنجیت سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے بیچ ہی میں

سلیم کی بات کاٹ دی" لیکن اگر میں یہ مان بھی لوں کہ کوئی بڑا سماجی مسئلہ ہے جس کا میں حصہ ہوں تو اس سے میں کیا کماؤں گا۔ بھائی، میں آدمی کا بچہ ہوں۔ میں زندگی کا لطف اٹھانا چاہتا ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ یہ بوڑھے لوگ ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اونچی رکھنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہو ان کی مرضی کے مطابق ہو۔ فرض کرو کہ میں بھی اسی انداز سے عیش کرنے لگوں جیسے میرے باپ دادا نے عیش کیے تھے کہ چوک میں کوٹھوں پر بیٹھنے والیوں کے ساتھ وقت گزارا کروں تو معلوم ہے میرے متعلق کیا کہا جائے گا؟ یہی کہ یہ شخص اپنے آپ کو ضائع کر رہا ہے۔ اور اگر میں اپنے دوستوں کی صحبت میں تھوڑا ڈانس کا، تھوڑا پینے پلانے کا شغل کرنے لگوں تو پھر مجھے لوفر کے خطاب سے نوازا جائے گا۔ پتہ ہے مجھے اس پارٹی کا ایسے اہتمام کرنا پڑا ہے جیسے میں کوئی سازش کر رہا ہوں۔ میں نے رضا علی کے ملازموں کو چلتا کیا۔ ہری سنگھ کو لے کر آیا جو ایسا ہے کہ اگر مجھے فون کرتے بھی دیکھ لے تو میرا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ اور مہمانوں کو بلانے میں میں نے ایسا پھونک پھونک کے قدم رکھا ہے جیسے میں مجرم ہوں اور یہ جرم میں میرے شریک تھے۔ جب یہ صورت ہو تو سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔"

اور پھر دکھ بھرے لہجے میں ٹکڑا لگایا" تم نے کم از کم یورپ میں تو جی بھر کے عیش کر لیے۔"

سیتا بولی" کوئی کتنا عیش کرے گا۔ آخر کو تو یہیں واپس آنا پڑتا ہے۔"

" رنجیت یار، حوصلے سے کام لو۔ ذرا سوچو کہ چھپ کر جو تفریح کی جاتی ہے اس سے بے ضرر تفریح میں بھی ایک رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔"

" بے ضرر تفریح؟" رنجیت بولا" ہمارے بڑے بوڑھوں کا تو یہ حال ہے کہ ڈانس کرنے میں اور کسی عورت کے ساتھ کھلے عام منہ کالا کرنے میں ان کی دانست میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔"

نادرہ نے بہت ناپ تول کر بات کی" میرے خیال میں تو یہ ایسی بات ہے جو سمجھ میں آتی ہے۔ سلیم نے صحیح کہا تھا۔ ہم جس چیز کا خمیازہ بھگت رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم دو الگ الگ کلچرز کی پیداوار ہیں۔۔۔۔۔"

" کلچرز؟ تمہارا مطلب ہے ابورشنز (Abortions)۔" رنجیت نے قہقہہ لگایا۔ پھر اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا" میں حیران ہوں کہ رضا علی، لال اور مسز لال کہاں رہ گئے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم جلدی پہنچیں گے۔ لال تو بورا آدمی ہے۔ وہ نہ بھی آئے تو کون اس پر دھیان دے گا۔ لیکن سندر پتنی تو ہر محفل کے لیے پروانہ راہداری کا کام دیتی ہے۔"

کمال نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا" تعجب ہے، رضا علی اب تک کیوں نہیں آیا۔"

" شاید نماز پڑھ رہا ہوگا۔" سیتا نے تمسخر کے لہجے میں کہا۔

" وہ نماز پڑھ رہا ہے تو کیا ہوا۔ نماز پڑھنے میں ہرج کیا ہے۔" نادرہ نے کڑوے لہجے میں کہا۔

" اپنی آواز کو کہاں تک سنو گے۔ کوئی دوسری آواز بھی سنو۔ اسے سن کر شاید زیادہ دل خوش ہو۔"

اور یہ کہتے ہوئے رنجیت نے گراموفون کی طرف قدم بڑھایا۔ سیتا یہ کہتی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی کہ" ریکارڈ

چننے میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔''

جب گانا شروع ہوا تو سیتا نے یہ کہا کہ میرے موڈ کے عین مطابق گانے کا انتخاب کیا۔ اچھا ہوتا کہ کوئی خوشی کا، طرب کا گانا سنوا دیتی۔

دوسری تیسری ہی تان پہ کمال ایک جھٹکے کے ساتھ کرسی سے اٹھا اور گلاس ہری سنگھ کی طرف بڑھایا ''اک ذرا سی وہسکی اور بہت سا سوڈا۔''

اس کی آواز میں مجھے ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا۔ میں نے اسے ایک نظر دیکھا۔ اس کے چہرے پہ دکھ کی ایک اڑتی سی پرچھائیں دکھائی دی۔ میں زیادہ دیکھ نہیں سکی۔ فوراً ہی تو وہ مڑ گیا اور پالش کئے ہوئے چمکیلے برآمدے میں نکل گیا۔

سیتا آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔ بڑے سجاؤ کے ساتھ دھیرے دھیرے گانے کی لے کے ساتھ جھوم رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ کچھ مندی گئی تھیں، سر ایک سمت میں ڈھلک گیا تھا اور لبوں پر خفیف سے تبسم کی لہر۔ پھر جب کمال برابر سے گزر رہا تھا تو اس نے بیساختہ ہاتھ اس کے بازو پہ رکھ دیا اور بولی'' کمال میرے ساتھ ڈانس کرو۔ مجھے یاد ہے کہ تم نے والز کتنا اچھا کیا تھا۔'' یوں اس نے بہت اہتمام سے اپنے لہجے میں ایک خوشی کی لہک پیدا کی تھی لیکن آواز میں خفیف سی لرزش تھی۔

کمال دم بھر کے لیے تو کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور قریب کی کرسی کے ہتھے پہ رکھ دیا۔ پھر آہستہ سے اس کی طرف مڑی۔ اس کی باہیں پھیلی ہوئی تھیں لیکن آنکھوں میں تبسم کی کوئی کیفیت نہیں تھی۔

سلیم نادرہ سے باتوں میں لگا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ اب جو اس نے مڑ کے دیکھا تو گھڑی بھر کے لیے تو بالکل بت بن گیا۔ پھر اس نے ادھر سے منہ موڑا اور پھر بہت تیز تیز باتیں کرنے لگا۔

اپنی دانست میں تو مجھے سیتا پر غصہ آنا چاہیے تھا، مگر اس کے بجائے میرا جی یہ چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کے روؤں۔

وہ بہت خاموش ڈانس تھا۔ کچھ عجب سا لگ رہا تھا۔ پھر ہنسی کی آواز سنائی دی جس میں کسی قدر تمسخر کا رنگ بھی شامل تھا۔ بس پھر وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ مسز لال دروازے میں کھڑی تالی بجا رہی تھیں سر سے پاؤں تک سیاہ پوش۔ ایسی گدرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں جیسے تانبے کے پیالے میں نرم نرم پھولے پھولے اودے انگور رکھے ہوں۔

''نہیں بھئی نہیں۔ رکو نہیں۔ جاری رہو۔'' وہ لپک کر بولی۔ لیکن ڈانس رک گیا تھا۔ بس ریکارڈ بجے جا رہا تھا۔

''رنجیت! معاف کرنا، دیر ہو گئی۔'' وہ اس کی طرف اس ادا سے بڑھ رہی تھی کہ اس کے نازک ہاتھ

پھیلے ہوئے تھے اور کچھ ایسی نظروں سے رنجیت کو دیکھ رہی تھی جیسے اسے کسی پروگرام کے لیے آنا تھا اور اس کے دیر سے آنے میں اس پروگرام میں تاخیر ہوگئی'' میں اپنے پتی جی کا انتظار کر رہی تھی۔ انہیں امیر پور ہاؤس سے بلاوا آ گیا۔ راجہ صاحب کی شاید کچھ طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر کی پتنی ہونا بھی ایک مصیبت ہے۔ آخر میں چلی آئی۔ پیغام چھوڑ آئی ہوں کہ جلدی سے جلدی پہنچنے کی کوشش کرو۔''

''مجھے لگتا ہے کہ رضا علی اور امیر نہیں آسکیں گے۔'' رنجیت کہنے لگا ''بہت افسوس کی بات ہے۔ رام جانے ہم پھر کب اکٹھے ہوں۔''

''شاید کچھ دیر بعد آ جائیں۔'' اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔

''امید تو رکھنی چاہیے۔'' رنجیت بولا۔

میرے دل و دماغ میں امید اور آرزو اس طرح کروٹیں لینے لگیں جیسے نوکیلی چھپکلیاں رڑک رہی ہوں۔ اس کے بعد تو وقت ایسے گزرنے لگا جیسے جھٹکے لے کر آگے بڑھ رہا ہو۔

اس وقت یہاں اتنے لوگ تھے کہ کھوئے سے کھوا چھل رہا تھا۔ گانا بجانا، قہقہے، ڈانس۔ ارد گرد کیسی چہل پہل تھی، مگر میری دنیا خاموش تھی۔ اس خاموش دنیا میں مَیں اکیلی کھڑی تھی۔

میں اور نادرو زیادہ وقت ان بڑے بڑے دریچوں سے لگے بیٹھے رہے جہاں سے جھیل کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ آسمان پر آج چاند نکلا ہوا نہیں تھا۔ تاروں کا ہجوم تھا جو سارے آسمان پر اور کہکشاں کے ارد گرد لاکھوں کی تعداد میں بکھرے نظر آ رہے تھے۔ جا بجا چمکتے ستاروں کے جھرمٹ تھے اور ان کے بیچ بیچ یوں لگتا تھا کہ جیسے ستاروں کا دودھیا برادہ بکھرا ہوا ہو۔ انگلش کلب کی روشنیوں کے پس منظر میں کھاڑی کے موڑ پر بجروں کے سائے تیز تیز حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ جھیل کے ادھر سے بازار کا شور آتا سنائی دے رہا تھا۔ کشتیوں کے کالے کالے سائے سطحِ آب پر متحرک تھے۔ ان کے چلنے سے پانی میں جو اتھل پتھل ہو رہی تھی اس کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ اندر ایوان میں ڈانس کرنے والے حرکت میں تھے۔ بار پہ اس وقت بہت رش تھا۔

اپنے معمول کے خلاف میں ایک بے تعلقی کے ساتھ اس منظر کو دیکھ رہی تھی کہ کمال اور سیتا کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل رہے ہیں۔

مسز لال آج کچھ زیادہ ہی سرور میں تھیں۔ پروانوں میں گھری ہوئی تھیں مگر وہ چور نظروں سے مستقل کمال اور سیتا کو دیکھے جا رہی تھیں۔

ڈاکٹر لال اُس وقت آئے جب ڈنر خاتمے پہ تھا۔ وہ اکیلے آئے تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ راجہ صاحب کو اپنڈکس کی شکایت ہے لیکن فوری آپریشن والی صورت نہیں ہے۔ کلکتے سے کسی سپیشلسٹ کو بلایا گیا ہے۔ اس پہ وہ چیں بہ جبیں نظر آ رہے تھے۔

رضا علی اور امیر کے بارے میں کسی نے نہیں پوچھا۔ گویا اب یہ طے تھا کہ وہ نہیں آئیں گے۔ لیکن مجھے صبر نہیں آ رہا تھا۔

ایک اور گھنٹہ گزر گیا، اور کتنا مر مر کے گزرا ہے۔ کتنی کتنی دیر تک میرے منہ سے کوئی ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ مگر نادرہ نے اس لمبی چپ پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ تو بہت مگن تھی۔ سلیم جو اس پر اس قدر توجہ دے رہا تھا۔ بار بار دوسروں سے کٹ کر وہ اس کے پاس آ بیٹھتا۔ ابھی وہ اس کے پاس سے اٹھ کر ڈانس کے لیے گیا تھا، تو اب وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ میں اپنی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی ہنسی سے اس میں کھنڈت پڑ گئی۔

''ارے تم دیکھو تو کچھ بھی نہیں رہی ہو۔ بس تکے جا رہی ہو۔''

میں نے تھوڑا جھنجھلا کر کہا ''میں ڈانس دیکھ رہی تھی۔''

''اگر آپ کان بند کر لیں اور موسیقی سننے سے انکار کر دیں تو یہ بات بہت بے ڈھب لگتی ہے۔ اف توبہ! لوگوں نے کیا دھکم پیل مچا رکھی ہے۔ بہت ناشائستہ بات ہے۔ ہمارے بڑے بوڑھے اگر ایسی حرکتوں پہ ناک بھوں سکوڑتے ہیں تو ٹھیک ہی کرتے ہیں۔''

میں نے مختصر سا جواب دیا۔ ''ارے ان اعتراض کرنے والوں میں بہت سوں کی حالت یہ ہے کہ عورت برقع میں بھی نظر آ جائے تو باولے ہو جاتے ہیں۔''

موسیقی تھم گئی۔ مسز لال دروازے میں آ کر اس طرح کھڑی ہو گئیں جیسے فریم میں جڑی کھڑی ہیں۔ پھر وہ ناز سے چلتی ہوئی ہماری طرف آئیں۔ انہوں نے تیزی سے پورے برآمدے پر ایک نظر ڈالی۔

''لڑکیو، تم یاں اندھیرے میں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ کیا کچھ راز کی باتیں ہو رہی ہیں؟'' جھک کر دریچے سے باہر جھانکنے لگیں۔ ان کے بدن میں ایسے خم آ گیا جیسے کوئی بلی انگڑائی لے رہی ہو۔

''ارے کتنی تازہ خوشگوار ہوا ہے۔ اندر تو دھواں بھرا ہوا ہے۔ تم نے اچھا ہی کیا کہ یاں آ کر بیٹھ گئیں۔'' پھر انہوں نے میٹھا سا لہجہ اپنایا اور بولیں۔

''میں سمجھ رہی تھی کہ سیتا بھی تمہارے ہی پاس آ کر بیٹھ گئی ہے۔''

''سیتا نے تو گھنٹوں ہو گئے ادھر کا رخ نہیں کیا۔'' نادرہ بولی۔ ''وہ تو ڈانس میں غرق ہیں۔''

''ڈانس تو کوئی نہیں کر رہی۔ بہت دیر سے فلور سے غائب ہے۔'' مسز لال کے لہجے میں کچھ کینے کا بھی رنگ شامل تھا۔ اور جب وہ یہ بات کہہ رہی تھیں تو ان کی نظریں اس مقام کو تک رہی تھیں جہاں جھیل کا پانی گڑے ہوئے لکڑی کے شہتیروں سے ٹکرا رہا تھا۔ پھر انہوں نے مڑ کر اس شخص کو دیکھا جو پیچھے کھڑا بڑے صبر کے ساتھ ان کی توجہ کا منتظر تھا۔

''وہ ادھر جو بھید بھری جگہ نظر آ رہی ہے وہاں کتنی کشتیاں بیکار کھڑی ہیں۔ آؤ چل کے بوٹنگ ——

کریں۔ بہت لطف آئے گا۔ سر جو بھاری ہو رہے ہیں وہ بھی۔۔۔۔۔''

وہ بول رہی تھیں کہ سلیم آن دھمکا اور ان کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔'' سونا، اس ڈانس کے ختم ہونے کے بعد ایک ہماری بھی باری ہو جائے۔ میرے ساتھ تو ایک زمانہ ہو گیا تم نے ڈانس نہیں کیا۔ آج میں نہیں ٹلوں گا۔''

ویسے تو وہ بڑے مزے میں بول رہی تھی لیکن میں نے تاڑ لیا، اس کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ اس کی اور مسز لال کی دونوں ہی کی نظریں کمال کو ڈھونڈ رہی تھیں اور کمال دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں بوٹ ہاؤس کے کونے کونے سے واقف تھی۔ باتھ روم میں ایک چوبی زینہ تھا جو نیچے ایک باغیچے میں جا کر نکلتا تھا۔ باتھ روم کے دروازے کی کنڈی کھلی تھی۔ میں جلدی جلدی ان پرانی دھرانی سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ وہاں اندھیرا تھا۔ سڑک کے کھمبوں والے قمقموں کی روشنی درختوں کی ٹہنیوں سے چھن چھن کر لال پاکھی چھت پر اور سبز چوبی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر میں رک کر کھڑی ہو گئی اور دبی دبی آواز میں پکارنے لگی۔

''سیتا سیتا!'' جواب ندارد۔ میں نے پھر آواز دی۔

''سیتا!'' بس چوبی شہتیروں سے پانی کے ٹکرانے کی آواز تھی، باقی سناٹا تھا۔ مجھے ڈر لگنے لگا اور بھاگ کر ڈریسنگ روم میں آ گئی۔ وہاں آ کر دھم سے کوچ پر بیٹھ گئی۔ میرے سر میں اب واقعی درد ہونے لگا تھا۔ برابر ایوان میں جو موسیقی ہو رہی تھی اس کا شور بھی سر میں دھمک پیدا کر رہا تھا۔

باتھ روم کی سمت والا دروازہ کسی نے چپکے سے کھولا۔ یہ سیتا تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ مجھے دیکھ کر تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد وہ بڑی ڈھٹائی سے دروازہ کھول کر اندر آئی۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور چہرہ سونت گیا تھا۔

''کسی نے دروازے میں تالا لگا دیا ہو گا۔'' میں نے اپنے آپ پر بساط بھر قابو پانے کی کوشش کی۔

اس نے کاندھوں کو جھکایا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے بکھرے بال سنوارنے لگی۔ آئینے میں میرا عکس پڑ رہا تھا۔ وہ عکس سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

''مجھے ایسے کیوں گھور رہی ہو؟''

''سیتا، تم اسے اس کے حال پر نہیں چھوڑ سکتیں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ اس کی ساری ڈھٹائی ایک دم سے ڈھے گئی۔

''تم نہیں سمجھو گی، تم سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ محبت کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔''

میں دل ہی دل میں خوش ہو کر سوچنے لگی کہ بی بی، جتنا اس کا مجھے پتہ ہے اتنا تجھے کیا پتہ ہو گا مگر خیر

میں نے جواب اور کچھ دیا اور کہا کہ "تم نے آج نرالے ہی طریقے سے اس کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"اور کوئی طریقہ تھا ہی نہیں۔ ویسے میں نے سوچا یہی تھا کہ مجھے اس سے دور رہنا چاہیے کیونکہ امید کی تو کوئی صورت ہے ہی نہیں کیونکہ ہمارا ملاپ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"اس نے تم سے شادی کا سوال ڈالا تھا۔ تم نے ٹکا سا جواب دے دیا۔"

"اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ میں نے بیتا نے اس شخص سے جس کا نام کمال ہے، پریم کیا۔ اب بھی کرتی ہوں۔ ہم دو آدم زاد، نرناری مگر شادی ہماری نہیں کسی اور سے ہوتی تھی۔ یہ شادی تو اس لڑکی کی ہوتی تھی جو میرے ماں اور باپ کی بیٹی ہے۔ اس لڑکے سے جو اپنے ماں باپ کا بیٹا ہے۔ دونوں کا الگ الگ بیک گراؤنڈ ہے، الگ الگ آگا پیچھا، الگ الگ مذہب۔ ایک بھاری بھر کم سماجی مشین میں دو پرزے فٹ کرنے تھے۔"

"اگر تمہیں اس سے محبت ہوتی تو پھر اس طرح نہ سوچتیں۔"

"میں نے اس پرکار اسی لیے سوچا کہ مجھے اس سے پریم تھا۔ ہمارا پریم ہماری اپنی چیز ہے، وہ ہمارے اندر ہے، لیکن ہمارا بواہ ہمارے باہر کی چیز ہے۔ بواہ کسی کا بھی ہو وہ اس کے اندر کا معاملہ نہیں، اس کا باہری معاملہ ہے۔ میں نے اس پر بہت سوچ بچار کیا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ اس سے تو مر جانا زیادہ آسان ہے۔"

"تم نے کچھ زیادہ ہی سوچ بچار کر ڈالا۔ اگر تم نے دماغ کے بجائے دل سے اسے چاہا ہوتا۔۔۔۔۔"

"تمہیں کیا پتہ کہ میں اس سے کتنا پریم کرتی ہوں۔" وہ بات کاٹتے ہوئے تڑپ کر بولی۔ "تم کیا جانو کہ میں کس آگ سے گزری ہوں۔ اس پریم کے کارن ہی تو مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اسے باندھ کے مت رکھو۔ اسے اس بندھن سے آزاد کر دو۔"

"پھر پورا آزاد کیا ہوتا۔ تم چند دن کے لیے اور صبر نہیں کر سکتی تھیں۔" میں اسے الزام دینے لگی "وہ تو اب یاں سے جا ہی رہا ہے۔"

اس نے پھر رونا شروع کر دیا "اسی لیے تو" وہ رو کر بولی "اسی لیے کہ اب میں جس طرح دیکھ رہی ہوں اس طرح پھر کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی۔ میں آزادی کے ساتھ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکوں گی۔ اب تک تو یہ معاملہ تھا کہ چاہے وہ میرے سنگ نہ بھی ہو اس کے بارے میں آزادی سے سوچ تو سکتی تھی، اسے دھیان میں لا سکتی تھی۔"

پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سپاٹ لہجے میں بولی "میرا بواہ ہونے والا ہے۔"

"اچھا تو تمہارا بیاہ ہونے والا ہے۔" میں نے میکانکی سے انداز میں کہا۔

"اور نہیں تو میرے ماتا پتا تو خوش ہی ہو جائیں گے۔ انہوں نے میرے لیے ایک بھلا سا بر ڈھونڈ لیا ہے اور میں نے ہاں بھی کر دی ہے۔"

مجھے کوئی ٹوہ نہیں ہوئی کہ وہ کون ہے اور کیا ہے۔ میں تو اصل میں سناٹے میں آ گئی۔ ''سیتا، کیا تم واقعی سچ کہہ رہی ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم بغیر جانے بوجھے ۔۔۔۔۔۔'' اس کی نظروں کو دیکھ کر میں نے فقرہ بیچ ہی میں چھوڑ دیا۔

''میں اس سے ایک دفعہ ملی تھی۔ ہزار بار بھی اس سے ملتی تو کیا فرق پڑتا۔ کسی بھی ہونے والے بر سے بے شک ہزار بار ملوں کیا فرق پڑے گا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں نے ماتا پتا کے کئے ہوئے رشتے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ نہیں، یہ میری اپنی پسند ہے۔ میں پریم کی شادی نہیں کر سکتی۔ اور میں یہ سوانگ بھی رچانا نہیں چاہتی کہ جس سے میرا بیاہ ہو رہا ہے اس سے مجھے پریم ہے۔ سو اگر یہ بات ہے تو میرے ماتا پتا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون نوجوان میرا پتی بننے کے زیادہ لائق ہے۔ ان کے سامنے بر چننے کی بہت گنجائش ہے۔ گنجائش تو وہاں کم ہوتی ہے جہاں پریم کا معاملہ ہو، بلکہ پریم میں تو گنجائش رہتی ہی نہیں۔ سامنے ایک ہوتا ہے کوئی دوسرا ہوتا ہی نہیں۔ اگر کمال سے میں نے پریم نہ کیا ہوتا تو میں اس انداز سے سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دنیا کا کوئی بھی مرد میرا پتی بن سکتا ہے۔ یہ کہ جتنے مرد ہیں سب میرے ہونے والے پتی ہیں۔''

''یہ جو تم کہہ رہی ہو بہت غلط بات ہے، مکروہ بات ہے۔ سیتا! تم ایسا نہیں کر سکتیں۔'' میں جیسے اپنے معاملے کو سامنے رکھ کر یہ دلیل و حجت کر رہی تھی۔'' اس سے تو بہتر ہے کہ تم شادی ہی نہ کرو۔ تم یہ بھی تو کر سکتی ہو کہ کوئی کام ۔۔۔۔۔''

''وہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے منّے کو ختم کرنا ہے۔ اس طرح تو میں لو لگائے بیٹھی رہوں گی۔ مجھے تو ایسا بندوبست کرنا ہے کہ کسی طرح کی امید رکھنے کی آزادی ہی مجھے میسر نہ رہے۔''

''سیتا! میری مانو۔ کمال سے آنکھیں بند کر کے شادی کر لو۔ زیادہ سوچ بچار مت کرو۔ زیادہ سوچ بچار کرو گی تو یہی ہو گا کہ ہر طرح کے شک اور اندیشے پیدا ہوں گے۔ باقی آگے کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ اگر تم اپنے ارادے میں پکی رہو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ہونا چاہیے۔''

''لیلیٰ! میں کوئی سادھو سنت نہیں ہوں۔ نہ کوئی شہید و ہید ہوں۔ جب مجھ پر اعتراض ہوتے ہیں اور مجھے نفرت کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو میں ظاہر تو نہیں کرتی مگر اس کا مجھ پر اثر ہوتا ہے۔ مجھے اپنے پریم کو سنبھال کر رکھنے دو۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر انتظار کروں کہ میں نے جو پریم کا پاپ کیا ہے، اس کے بارے میں پنچ لوگ کیا فیصلہ سناتے ہیں۔ تمہیں خوب پتہ ہے کہ اس کے بعد تمہارے چچا اور چچی مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔ کیا یہ صحیح بات ہو گی کہ میں کمال کو ان کانٹوں میں گھسیٹوں جہاں ایک طرف میرا پریم ہو اور دوسری طرف اس کے ماتا پتا کی نفرت۔ نفرت اور محبت کی اس کشتم کشتا میں اسے کیوں پھنسایا جائے۔''

''تم اس سے پوری محبت نہیں کرتیں۔'' اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں بھرپور محبت کرنے کا جگر رکھتی ہوں۔ بس میں نے فوراً اس پر الزام جڑ دیا۔

''تمہیں کیا معلوم۔ تم یہ کیسے فیصلہ کر سکتی ہو؟'' وہ بھڑک اٹھی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ایسی خونخوار نظروں سے دیکھا جیسے کسی عاشق کے مسئلے پر ہم دونوں میں لڑائی ٹھن گئی ہو۔

''ارے تم یہاں ہو!'' دروازے سے سونالال کی ترش و شیریں آواز سنائی دی۔ مسکراتے ہوئے اس نے تمسخر آمیز نظروں سے سیتا کو دیکھا۔ یہ مسکراہٹ بس اس کے ہونٹوں پر کھیل کر رہ گئی۔ اس کی بھاری ہوتی آنکھوں میں تو اس کی کیفیت نظر آئی نہیں۔ ''وہاں لوگوں کی نظریں تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔''

سیتا نے اچانک جس طرح کینچلی بدلی، اس پر تو میں ہکا بکا رہ گئی۔ پھر ویسی ہی بن گئی جیسی وہ نظر آیا کرتی تھی۔ خود اعتمادی کی تصویر، شوخ و شنگ، چٹاخ پٹاخ۔ میں حیران تھی کہ یا الٰہی ابھی جو کچھ ہو رہا تھا کیا وہ محض میرا تصور تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور ایسے ظاہر کیا جیسے میرے سر میں درد ہو رہا ہے اور سر کے آرام کے لیے اسے دبا رہی ہوں۔

''اچھا لو میں تو خوشی سے پھول کر کپا ہو گئی۔'' سیتا بولی۔ ''مجھے کب گمان تھا کہ لوگوں کو میرے بارے میں اتنی فکر رہتی ہے۔''

''کسی کو بھی یہ کہاں پتہ ہے کہ دوسرے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟'' یہ کہتے کہتے مسز لال آئینے کے پاس آئیں اور اپنی ساڑھی کی چنٹوں کو درست کرنے لگیں۔ اور جب سیتا دروازے کی طرف جا رہی تھی تو سرسری سے انداز سے بولیں۔ ''آج صبح ہی رضا علی کی بیگم تمہارا ذکر کر رہی تھیں۔''

یہ تو بہت دلچسپ بات ہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ انہیں مجھ سے اتنی دلچسپی ہے۔''

''دلچسپی انہیں تم سے نہیں، رضا علی سے ہے۔''

ان کی آوازیں ایسے لگ رہی تھیں جیسے خنجر چل رہے ہوں لیکن ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھیں۔

مسز لال سپاٹ لہجے میں کہنے لگیں ''عورت کو اگر یہ پتہ چلے کہ جو اس کی چیز تھی وہ اس کے ہاتھوں سے نکلنے لگی ہے تو آگ کے انگاروں پر لوٹنے لگتی ہے۔''

''جو چیز اس کی تھی وہ تو شاید اس کے ہاتھوں سے نہیں نکل رہی ہے۔ فرض کر لیں کہ رضا علی کو میں پسند ہوں۔ چلئے کہہ لیجئے کہ وہ مجھ سے پریم کرتا ہے۔ تو پھر بیگم رضا علی کا تو کچھ نہیں جاتا۔ اس نے تو شادی اس کے نام، دولت اور اس کے بچے جننے کے لیے کی تھی۔''

''سیتا ڈیئر! بات یہ ہے کہ جلاپے کی کوئی منطق نہیں ہوتی۔''

سیتا اس دکھ کر میٹھے سے انداز میں مسکرائی اور یہ کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ''جی تو نہیں چاہتا کہ ایسی منجھی ہوئی بی بی سے ایسی دلچسپ بات چیت کا سلسلہ توڑا جائے لیکن اُدھر جو وہ لوگ بے قرار ہو

رہے ہیں انہیں بھی تو جا کر ڈھارس دینی ہے۔"

مسز لال ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھیں۔ ان کے شانے کسی قدر جھکے ہوئے تھے۔ کچھ بدحواس سی اپنے بیگ میں کچھ ٹٹول رہی تھیں۔ میں نے آئینے میں ان کے چہرے کو ایک نظر دیکھا۔ بس ایک صدمہ سا ہوا جیسے کسی کا ڈھکا چھپا راز مجھ پر کھل گیا ہے۔ یہ ایک ادھیڑ عمر عورت کا چہرہ تھا جس پر شکست کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ جن آنکھوں کی چمک دلوں کو موہ لیتی تھی، وہ چمک ماند پڑ گئی تھی۔ اب وہاں ناکامی کا احساس جھلک رہا تھا۔ وہ لب و دہن جو کبھی ہیجان انگیز تھے اب ایک تلخی کی چغلی کھا رہے تھے۔ لو ایک اور نقاب اتر گیا۔ پہلے سیتا کا نقاب اترا تھا، اب اس کا اترا جو دیکھنے میں بڑی ٹھسے والی عورت تھی۔

میں وہاں سے خشم پشم اٹھی اور چلنے لگی مگر کوئی دو قدم چلی ہوں گی کہ انہوں نے مجھے تیز سے لہجے میں پکارا "لیلی!" پھر معمول کے لہجے پر آ گئیں۔ "سوری۔ ذرا میرا نیکلس تو دیکھو۔ یہ کم بخت ساڑھی کے بورڈر میں جا کر الجھ گیا ہے۔"

میں نے جھک کر ساڑھی میں پھنسے ہوئے نیکلس کو درست کیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ موصوفہ نے کچھ زیادہ ہی پی لی ہے۔

"اب ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں سیدھی ہوئی اور چلنے لگی مگر مسز لال شاید یہ نہیں چاہتی تھی کہ میں انہیں اکیلا چھوڑ کر چلتی بنوں۔ "تمہارا کیا خیال ہے میں ٹھیک لگ رہی ہوں ناں؟ میں اپنی لپ اسٹک بھول آئی۔ افسوس کہ تمہارے پاس بھی نہیں ہوگی۔ تم اس کا استعمال جو نہیں کرتیں۔" آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر برا سا منہ بنایا اور ٹھنڈا سا سانس بھرا۔ "جوانی بہت سندر ہوتی ہے لیکن سادہ بھی ہوتی ہے۔ ایک احمقانہ بھولپن اور اپنے آپ پر مان۔ میری ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ معصومیت اور مان دونوں ہی موسم کا مال ہیں۔ انہیں ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا۔ موسم گزرنے کے ساتھ ہی یہ مال سڑنا گلنا شروع ہو جاتا ہے۔"

انہوں نے کیس سے سگریٹ نکالا لیکن کن مشکلوں سے اسے سلگایا ہے۔ ایک ماچس گھسی وہ بجھ گئی۔ دوسری گھسی وہ بجھ گئی۔ ارادتاً ایک سرسری لہجہ اختیار کیا اور آئینے میں میری صورت دیکھ کر کہنے لگیں۔ "تمہیں کمال سے بہت لگاؤ ہے۔ ہے ناں؟"

"جی، بالکل ہے۔"

"کیا خیال ہے تمہارا؟ وہ سیتا کی محبت میں گرفتار ہے ناں؟"

"یہ مجھے کیا پتہ۔" میری زبان لڑکھڑا گئی۔

"بس یوں ہی مجھے ذرا ٹوہ تھی۔" کاندھوں کو مچکاتے ہوئے کہا۔ "آخر وہ تمہاری سہیلی ہے۔"

دروازے کے اُدھر سے ان کے پتی جی کی آواز سنائی دی جو شراب کے اثر سے بھاری بھاری سی ہو گئی تھی۔ آواز دے رہے تھے۔ "سونا، سونا!"

نفرت کی ایک کیفیت نمودار ہوئی جس سے چہرے پر کرختگی آ گئی۔ پی کی پکار کا جواب تو دیا نہیں، بس اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہ جو پی کو دور دفان کہنے کا خاموش طریقہ تھا، یہ میرے لیے سیدھے سادھے اظہارِ تنفر سے زیادہ پریشان کن تھا۔ کمرے سے نکلتے نکلتے بولیں "سیتا کو کوئی بتائے کہ اپنے آپ پر بہت زیادہ گھمنڈ خطرناک ہوتا ہے۔"

مجھے ایسے لگا جیسے درد میرے سر سے سرک کر بدن تک بوٹی بوٹی میں سرایت کر گیا ہے۔ میں جلدی جلدی برآمدے کی طرف ہولی۔

ایوان کے باہر والے گوشے میں کوئی شخص ایک طرف کونے میں بیٹھا دریچے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو دھندلی روشنی میں مجھے بس ایک ہیولا سا دکھائی دیا لیکن پھر میری نظروں نے کام کرنا شروع کیا۔۔۔۔۔وہ تو جانے پہچانے خدوخال تھے۔

"امیر!" میں روہانسی ہوگئی۔

"لیلیٰ!" وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا اور میرے پھیلے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اب میں اپنے آپ کو کتنا محفوظ محسوس کر رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

ہم اکٹھے دریچے کے پاس جا بیٹھے اور ہمارے اردگرد رات سطحِ آب پر اور چاروں طرف پھیلی پہاڑیوں پر اپنا جادو جگا رہی تھی۔ اور وہ جو تھوڑے فاصلے پر ایک غیر اہم سی دنیا تھی وہاں سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں اور موسیقی کا شور آ رہا تھا۔

"مجھے آنا تو بہر حال تھا چاہے ایک منٹ ہی کے لیے سہی، مگر جب تک دوسرے لوگ سو نہ جاتے، میں وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اور مجھے ڈر یہ تھا کہ کہیں تم چلی نہ جاؤ۔"

"مجھے پتہ تھا کہ تم آ ؤ گے۔ لیکن مجھے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ میرے اور نادرہ کے گھر واپس جانے کا وقت ہوگیا ہے اور میرے لیے زیادہ انتظار کرنا ممکن نہیں تھا۔۔۔۔۔"

"یہ تو آج رات مجھے پتہ چلا ہے۔ اس سے پہلے تو یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ایک گھنٹہ کتنے سیکنڈ کا ہوتا ہے اور ایک سیکنڈ میں کتنے گھنٹے ہوتے ہیں۔" اس کے لہجے میں افسردگی تھی، اگرچہ وہ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔" اور لوگوں سے نفرت کس طرح شروع ہوتی ہے۔ ہاں کل میری تم سے تنہائی میں ملاقات ہونی چاہیے۔"

"میں گھر سے کیسے نکل سکتی ہوں۔"

"تمہیں نکلنا ہوگا۔ کوشش کریں پلیز۔"

"کروں گی۔ دس بجے کے لگ بھگ، نکڑ والی کتابوں کی دکان پر۔"

"شکریہ، میں انتظار کروں گا۔"

نواں باب

صبح ہی صبح گھر سے اکیلے نکلنا مجھے بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ وجہ میرے اپنے وسوسے تھے لیکن پتہ چلا کہ یہ تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک کام کرنا تھا اور وہ بہت ضروری کہ صبر اور خاموشی کے ساتھ دوسروں کے باہر جانے کا انتظار کروں۔ ایک ایک کر کے جب سب نکل گئے تو میں بھی نکل کھڑی ہوئی۔

زیادہ رستہ تو میں نے دوڑ دوڑ کر طے کیا۔ پہاڑی سے اتری اور ان گلیوں میں ہولی جہاں کا نقشہ یہ تھا کہ بھنبھناتی مکھیاں، تعفن، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر، تھوک اور پیک، میلے کچیلے لوگوں کی بھیڑ۔ ان گلیوں سے گزر کر بازار میں گئی جہاں دونوں طرف کا یک تما مکان جھکے گئے تھے جو دھوئیں سے کالے ہو گئے تھے۔ چھتیں خستہ حال تھیں، اور ایسے بودے کہ اب گرے اور اب گرے۔ اس بازار سے گزرتی گزرتی اس کی بڑی اور چوڑی سڑک پر آ گئی۔

میں نے دیکھا کہ امیر ڈھلان پر اُس مقام پر کھڑا ہے جہاں یہ بازار ختم ہوتا تھا اور صاف ستھرا فیشن ایبل علاقہ شروع ہوتا تھا۔

آسمان کو دیکھ کر لگتا تھا کہ فرشتوں نے رنگوں کو مل دل کر پھیلا دیا ہے جس سے آسمان نیلا ہو گیا ہے اور اب ان فرشتوں کے دمکتے شہپروں کی چھوٹ اس پر پڑ رہی ہے۔ لیکن میرا سانس پھولا ہوا تھا اور منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ہانپتے ہوئے حیران ہو کر بس اتنا ہی کہا۔ ''تم یہاں کھڑے ہو!''

اور اس نے مسکرا کر کہا ''ہاں بالکل میں یہاں کھڑا ہوں۔ تمہارا کیا خیال تھا کہ میں تمہیں یہاں نہیں ملوں گا۔''

''ہاں ۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔''

''میں ذرا پہلے آ گیا تھا کہ تمہیں انتظار نہ کرنا پڑے۔ پھر مجھے اپنی گھڑی پر بھی تو اعتبار نہیں تھا۔ کم بخت بہت سست چل رہی تھی ۔۔۔۔۔ آسانی سے نکل آئیں؟ کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟''

''نہیں۔ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔''

''اب میں خوش ہوں۔ پہلے مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ میں نے کیوں تم سے یہ خطرہ مول

لینے کا تقاضا کیا۔"

"بس اتنی احتیاط کرنی پڑتی ہے کہ کوئی قضیہ کھڑا نہ ہو جائے اور کوئی ایسی بات مت کرو کہ لوگ خواہ مخواہ تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں۔"

"اچھا بس یہاں سے پھوٹ لیں۔"

میں نے نادانستہ اِدھر اُدھر نظر ڈالی کہ آس پاس کوئی جاننے والا تو نظر نہیں آ رہا۔ ہماری ذات سے باہر کی دنیا ایک مرتبہ پھر ہماری نظروں کے سامنے آ گئی۔ قلیوں کا ایک ہجوم اپنی اپنی ڈانڈیاں لے کر ہماری طرف لپکا۔ آواز لگا رہے تھے۔ "حضور ڈانڈی چاہیے۔ ڈانڈی حضور۔" اور ایک دوسرے کو دھکیل کر ہم پر یلغار کر رہے تھے۔

"نہیں بھئی نہیں۔"

انہوں نے فقیروں کی طرح بدن پر چیتھڑے لادے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک بیچ میں سے نکل کر سڑک کے کنارے جا کھڑا ہوا اور جنگلے کا سہارا لے کر جھک گیا۔ اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اس کے نقاہت زدہ پیلے پھدق چہرے پر تشنج کی کیفیت طاری تھی۔

میں نے اس کی طرف سے رخ پھیر کر کہا۔

"ذرا غور کرو کہ یہ آدمی سواری کو لے کر اوپر پہاڑی پر جائے گا۔ یہ تو گویا اس بیچارے کو قتل کرنا ہے۔"

"لیکن" اور امیر بولا "اگر سب اسی طرح سوچنے لگیں تو اس شخص کا گزارہ کیسے ہوگا۔ یہ لوگ خوددار اتنے ہیں کہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے اور غریب اتنے کہ ان کا گزارہ مشکل ہے۔ یہ اس طرح کے سوال ہیں جن کے جواب آسان نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔ خیر حوصلہ کرو۔ ایسا منہ تو مت بناؤ کہ جیسے تم ہی ان کی مصیبتوں کی ذمہ دار ہو۔" اور اس آدمی کے قریب جا کر اس نے اس کے ہاتھ میں ایک سکہ تھما دیا اور کہا "جاؤ جا کر ہمارے لیے دو گھوڑے لے آؤ۔"

"ہم دونوں گھوڑوں پر سوار خاموش چلے جا رہے تھے۔ ہم نے لمبے رستے کو چھوڑ کر شارٹ کٹ اپنایا تھا۔ رستہ بہت تنگ اور پتھریلا تھا اور سیدھی چڑھائی تھی۔ کبھی کبھی رستے کے بالکل برابر بہت گہری کھائی دکھائی دیتی تھی۔ کبھی ایسا رستہ آ جاتا کہ آسمان دکھائی دیتا۔ دونوں طرف دیودار اور شاہ بلوط کھڑے ہوئے اور ہم ہیں کہ اطمینان سے ان کے سائے میں چلے جا رہے ہیں۔ چاروں طرف ایک گونجتی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈھلانوں پر کائی اور پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا اور اونچے اونچے درخت سایہ کر رہے تھے۔ ان کے پتے گر گر کر سارے رستے میں پھیل گئے تھے۔ کہیں دور سے چٹانوں کے بیچ بہتی کسی ندی کا شور سنائی دے رہا تھا اور ہوا ایسے چل رہی تھی جیسے آہیں بھر رہی ہے۔ سڑکیں، مکان، کھیل کے میدان سب نظروں سے اوجھل تھے

اور ایسے اوجھل تھے کہ اب دھیان میں بھی نہیں تھے۔

ایک طرح کی شانتی کا احساس میری رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا۔

ہم پتلی ستواں پہاڑی پر چلے جا رہے تھے۔ بیچ میں کوہان جیسی جگہ آ گئی، اسے عبور کیا پھر بہت احتیاط کے ساتھ گھوڑوں کو دوسری سمت موڑا۔ یہاں آدمی کے نام بس کچھ ایند ھن جمع کرنے والے دکھائی دے رہے تھے یا اکا دکا پیدل مارچ کرتے سیلانی، یا حسن فطرت اور گوشۂ تنہائی کے متلاشی۔ بہر حال سوشل زندگی کے رسیاؤں اور محفل بازوں میں سے یہاں کوئی نظر نہیں رہا تھا۔

صنوبر کے درختوں کے بیچ ایک چاندر میں پہنچ کر ہم گھوڑوں سے اترے۔ ایسے کتنے صابر و شاکر گھوڑے تھے جو موسم گرما میں انجانے سواروں کو گھماتے پھرتے ہیں اور موسم سرما میں اناج اور ہر طرح کا مال ڈھوتے رہتے ہیں۔ امیر نے انہیں لے جا کر ایک درخت کی شاخ سے باندھ دیا۔ گرجا گھر کے ستونوں جیسے بلند و بالا تنوں کے درمیان میں کھڑی امیر کے واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ان توانا تنوں اور نوکیلے پتوں کے گچھوں کی نفاست کو دیکھ کر ایک مقدس حسن کا سا احساس ہوتا تھا۔ میں نے بنا بولے، بنا کوئی لفظ منہ سے نکالے خاموشی کے ساتھ دعا کی کہ الٰہی میری اس خوشی کو قائم رکھیو۔ میرے اندر ایک انجانا خوف پل رہا تھا۔ بس میں اپنی خوشی کو اس خوف سے بچا کر رکھنے کے لیے دست بدعا تھی۔

''ہم تھوڑا پیدل چل کر ایسی جگہ جا پہنچے جہاں ایک چٹان کچھ اس طرح سے پھوٹ کر پھیلی ہوئی تھی کہ ایک چوڑا چکلا چھجا سا بن گیا تھا۔ یہاں سے دور تک منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ ایک خاموشی کے ساتھ ہم نے دور تک پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلوں کا نظارہ کیا۔ لگتا تھا کہ دور کھڑی برفانی چوٹیوں کی طرف بڑھتی پھیلتی ہوئی لہریں ہیں کہ پتھرا گئی ہیں۔ ان کی خواب صفت چوٹیاں حدت و حرارت کے پھیلے غبار سے بلند ہو کر آسمانوں کو چھو رہی تھیں۔ تعریف اور بیان سے ماورا ایک مقدس سکون کی حامل، خوابوں اور خواہشوں کا نقطۂ عروج، اپنے آپ میں گم مگر جیسے اشارے بھی کر رہی ہوں۔ ہر طرح کی کشاکش اور دکھ درد کی قید سے رہائی کا نشان، الوہیت سے ہمکنار۔

جس لمحے میں امیر نے مجھے چوما تھا، وہ پل کب شروع ہوا تھا۔ اس کا تو کوئی آغاز ہی نہیں تھا۔ اس میں ان برفانی چوٹیوں والی پاکیزگی اور ابدیت تھی جن کا ہم نے ایک گہرے کام کرتے سکوت کے عالم میں نظارہ کیا تھا۔ اس پل سے پہلے جتنے پل گزرے تھے وہ ان سب پلوں میں شامل تھا۔ یہ وہ پل تھا جس کے لیے میں پیدا ہوئی تھی، جس کے ناطے میں اس وجود کا جزو بن گئی جو مجھ سے پہلے بھی تھا اور میرے بعد بھی رہے گا اور جس کے ناطے میں نے اس وجود کے معنی و مقصود کو جانا، اور یہ جانا کہ اس مقصود کی تکمیل کیوں کر ہوتی ہے۔ میں نے جانا کہ میں اب پوری ہو گئی ہوں۔ ایک تکمیل اور طمانیت کا احساس۔ بس یہ لگا کہ میں زمین ہوں، آسمان ہوں، روشنی ہوں، برفانی چوٹی ہوں۔

کوئی گھوڑا ہنہنایا اور ہمارے عقب والے رستے میں کسی درخت پہ کسی کھٹ بڑھیا نے شاخوں اور پتوں کے بیچ تیزی سے کھٹ کھٹ کرنا شروع کر دی۔ ہم جو زمان و مکان کی حدوں کو پار کر کے دور کسی عالم میں نکل گئے تھے واپس اپنی حدوں میں آ گئے۔

''میں تمہیں چاہتا ہوں، بہت، بے حد۔'' اس نے کہا اور میں شرما گئی۔ پھر اس کے یہ لفظ'' جانے سے پہلے مجھے تمہیں یہ بتا دینا تھا۔''

''جا رہے ہو؟'' ایک دنیا تھی کہ بکھر کر ریزہ ریزہ ہوگئی۔

''ہاں مجھے واپس جانا ہے۔ چند دن ہوئے والد صاحب کا خط آیا تھا کہ اب واپس آ جاؤ لیکن میں جواب دینے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ تاہم کل رات جب راجہ چچا کی طبیعت خراب ہوئی تو رضا علی نے کہا کہ ہمیں واپس لکھنؤ جانا ہوگا۔ تو ہم کل روانہ ہو رہے ہیں۔''

اس کے والد۔۔۔۔۔ اس کے فرائض اور ذمہ داریاں۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگی کہ یا اللہ اس کی تو اپنی الگ ایک زندگی ہے جس کا مجھے پتہ ہی نہیں تھا، جس طرح میری اپنی زندگی کا اسے اتہ پتہ نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت مجھے یہ سوچ کر ہوئی کہ ہم ماہ و سال کو پیچھے چھوڑ کر سفر کی منزلیں طے کرتے اکٹھے اُس مقام پر آن پہنچے تھے جہاں سارے فرق مٹ گئے تھے۔ مَن تُو شدم تُو مَن شدی۔ مگر اب وہ جا رہا تھا اس لیے کہ کل رات۔۔۔۔۔ کسی دوسرے شخص کی بیماری۔۔۔۔۔

''کل؟۔۔۔۔۔ اتنی جلدی؟!'' میں مایوسانہ لہجے میں بولی۔

بے شک یہ سفر کسی صورت ملتوی نہیں ہو سکتا۔ پوری انتظامی مشینری سفر کا بندوبست کرے گی۔ سیٹوں کی ریزرویشن اور بکنگ کرائے گی۔ بے شک اس کی خاطر دوسروں کو اس گاڑی پر اپنی نشستیں چھوڑنی پڑیں اور اپنے سفر کے پروگرام بدلنے پڑیں۔ آخر ہمارے لیے بھی تو گاڑیوں کے چلنے میں تاخیر ہوا کرتی تھی۔ تو یہ تھے راجہ امیر پور۔

کہنے لگا'' آج اسی وجہ سے تمہیں یہاں بلانا پڑا کہ پھر خدا جانے کب دوبارہ ملنا نصیب ہو۔''

اس نے میری آنکھوں کو چوما جن میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور میرے ہاتھوں کو جنہوں نے اس کے ہاتھوں کو جکڑ رکھا تھا۔

''جب سے میں نے یہ جانا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں تب سے جانے کیا کیا کچھ سوچتا رہا۔ شاید آغاز اس پل سے ہوا جب تم میری باہوں میں آن گری تھیں۔''

اس کی شرارت پر میں مسکرا دی۔

''لیکن لیلیٰ میرے پاس پیش کرنے کے لیے سوائے محبت کے اور کچھ نہیں ہے۔''

''اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیے؟''

''میں غریب آدمی ہوں۔ میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تمہارے لوگ مجھے قبول نہیں کریں گے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ کمال اور سلیم مجھے پسند کرتے ہیں مگر وہ بھی اس موقع پر عملی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سوچیں گے۔ اور آخر وہ کیوں اس زاویے سے نہ سوچیں۔''

''تم دوسروں کا ذکر کیے جا رہے ہو، آخر کیوں؟ میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ سوال تو میری زندگی کا ہے۔''

''سب سے بڑھ کر تو میں نے تمہارے ہی بارے میں سوچا ہے۔ میں تمہیں چاہتا ہوں اور تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔ یہ سوچتا ہوں کہ تمہاری بہتری کس بات میں ہے۔''

''یہ بات تھی تو تم مجھے یہاں کیوں لے کر آئے۔ تم نے مجھ سے کیوں کہا کہ تم مجھے چاہتے ہو۔'' میں بڑے تلخ لہجے میں بول رہی تھی۔'' مجھے بہت افسوس ہے۔ مجھے معاف کرنا۔ میں تو تم سے محبت کرتی ہوں اور تم ہو کہ اس بات کو خاطر ہی میں نہیں لا رہے۔''

''لیلیٰ کیا تمہیں پتہ ہے کہ یہ بات تم نے پہلی مرتبہ کہی ہے۔ اور اب میں حیرت میں ڈوبا ہوا ہوں۔ میں ہی کیوں؟ آخر کیوں؟ اس کے باوجود میں تمہاری محبت کو جانتا ہوں اور اس لیے اب میں وہ بات کہہ سکتا ہوں جو مجھے کہنی چاہیے۔''

سیتا۔۔۔۔۔ مجھے پھر سیتا کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے اس کے دکھ کو محسوس کیا اور اس دکھ کے خلاف میں جھنجھلا اٹھی۔'' یہ نہیں ہو سکتا کہ محبت سے ہمیشہ ہی انکار کیا جائے۔ پھر ہم کریں کیا؟''

''لیلیٰ! تم میرا انتظار کرو گی نا؟ میں جان لڑا دوں گا۔ شاید کوئی بہتر صورت نکل آئے۔ ایک بات بتاؤں؟ کتنی مرتبہ میرا جی چاہا کہ کاش میں غیرت کو تھوڑی دیر کے لیے بالائے طاق رکھ سکتا اور راجہ چچا سے گزارش کرتا کہ قبلہ مجھے کوئی سرکاری ملازمت دلوا دیجئے۔ لیکن وہ میری طالب علمی کے دن تھے اور میں اور اسد ایسی باتوں پر لعنت بھیجتے تھے۔''

''امیر! تم میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ میری دانست میں پیسہ اور پوزیشن ہی سب کچھ ہیں؟ تم مجھے گرا کر اسی سطح پر لے آئے ہو جس سطح پر باقی لوگ ہیں۔'' اس وقت میرے ذہن میں زہر اتھی اور اپنی پھپھیاں۔'' جو کچھ بھی ہو، میں تمہاری زندگی میں تمہاری شریک بننے کی تمنا لیے بیٹھی ہوں۔''

''اسی بات نے تو مجھ میں حوصلہ پیدا کر دیا اور اسی لیے میں نے تم سے کہا ہے کہ تمہیں تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ تو اگر میرے یہ کہنے کے بعد بھی تم اپنے یقین میں پکی ہو، اگر اس کے بعد بھی تم اسی طرح محسوس کرتی ہو تو پھر سمجھ لو کہ ہم مل کر پوری دنیا سے لڑیں گے۔''

ہاں۔ میں نے سوچا کہ سب سے لڑیں گے۔ زندوں سے بھی اور مُردوں سے بھی اور میں نے

جواب دیا ''میرا یقین پکا ہے۔''

اب اس نے وہ بات کہی جو شاید اپنے آپ سے کتنی بار کہہ چکا تھا ''اپنی پڑھائی جاری رکھو۔ اس کا مطلب ہے مزید دو سال۔ اور وہ تین سال بھی ہو سکتے ہیں۔ اس وقت تک میرے لیے کوئی نہ کوئی سبیل پیدا ہو جائے گی۔ اگر ہمارا ایک دوسرے پر اعتبار ہے تو انتظار کی یہ کوئی لمبی مدت نہیں ہے۔''

''امیر! سیدھی بات یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تو مجھے تو انتظار کرنا ہی کرنا ہے۔''

اس گھڑی یہ بات کہنی کتنی آسان تھی کیونکہ ملاپ کی اس گھڑی میں وقت کیا بیتتا تھا۔ ہم تو اس فضا میں سانس لے رہے تھے جو وقت سے ماورا ہے۔ اس گھڑی سارے اندیشے اور وسوسے بے معنی نظر آ رہے تھے۔

دسواں باب

میں نے بی۔اے سے آگے پڑھنے کی نیت سے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ چچا جان نے ایک سرد مہری کے ساتھ اجازت دے دی تھی۔ ہماری چچی جان اس حق میں نہیں تھیں مگر وہ خاموش رہیں۔

الیکشن سر پر کھڑے تھے اور ہمارے چچا جان نے سیاسی جوڑ توڑ میں سر گاڑی پیر پہیہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی اس پوزیشن کو قبول کر لیا تھا کہ ولی الدین کے مقابلے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ سو اب انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ تعلقہ داروں کے نمائندے کے طور پر الیکشن میں کھڑے ہوں۔

ایسا لگتا تھا کہ وہ شطرنج کھیل رہے ہیں یا جمع تفریق کا کوئی سوال حل کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی سیاسی جذبہ کام نہیں کر رہا تھا۔ بس ایک ظالمانہ خواہش اقتدار نے انہیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔

ہماری چچی جان کی زندگی عین مین اپنے میاں کی زندگی کا عکس تھی۔ وہ عورتوں میں اپنی لیڈری کو مستحکم بنانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھیں۔ جن نسوانی تنظیموں میں اب تک وہ اور ان کی سہیلیاں چھائی ہوئی تھیں، اب وہاں حریفوں کا ایک نیا طبقہ اُبھر رہا تھا۔

سلیم نے عدالتوں میں جانا شروع کر دیا تھا مگر بڑی بے دلی سے۔ دل تو اس کا سیاست میں پڑا رہتا تھا۔ ایک تو رضا علی سے اس کی بڑھتی ہوئی دوستی اور دوسرے نادرہ سے تعلق خاطر ان دو چیزوں نے مل کر اس کے نظریات و خیالات کا رخ ہی بدل دیا۔

رضا علی نے بڑے عزم و بالجزم کے ساتھ مسلم لیگ کے لیے کام شروع کر دیا تھا۔ سیتا کے سامنے تو موصوف ایسے شرمائے شرمائے رہتے تھے کہ زبان سے ایک حرف نہیں نکلتا تھا۔ اب یہاں وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہونے والے مسلمانوں کے دشمنوں کے خلاف گرجتے برستے تھے۔ وہ نرم و نازک جسم اور وہ بھولی بھالی صورت اور اس پر نیم فوجی وردی۔ بھلا اس جثے پر یہ وردی کہاں پھبتی مگر رضا علی نیشنل گارڈز کا کمانڈر تھا۔ سو یہ وردی زیب تن کرتا اور پھر نوجوانوں سے اس تنظیم میں بھرتی ہونے کی اپیلیں کرتا۔

نادرہ نے اپنی اماں کے الیکشن کے لیے بہت کام کیا۔ اس مہم نے اس کو ایک سرگرم سیاسی کارکن بنا دیا۔ وہ ماں کے ساتھ ان تنگ گلیوں اور محلوں میں ان چھوٹے چھوٹے گھروں میں جاتی جن کے وجود کا پہلے اسے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ وہاں وہ جلسوں میں تقریریں کرتی اور عوام کے اس طبقے کے دلوں کو جیتنے کی

کوشش کرتی جس سے وہ اب سے پہلے بس نظریے کے حوالے سے واقف تھی۔

ترقی پسند اس کی اماں کو مورد الزام ٹھہراتے کہ وہ سرمایہ دار ہیں، فرقہ پرست رجعت پسند ہیں۔ کٹر مذہبی لوگ یہ اعتراض کرتے کہ یہ خاتون پردہ نہیں کرتی اور اس نے مغرب کی تخریب اخلاق طور طریقے اپنا رکھے ہیں۔

نادرہ اور سلیم میں جتنا قرب پیدا ہوتا گیا، اتنی ہی میں نادرہ سے دور ہوتی چلی گئی۔ وجہ خیالات کا اختلاف تھا کہ ایک دوسرے کے بالکل ہی متضاد تھے۔ کالج کے دنوں میں جب ہم بحث برائے بحث کیا کرتے تھے تو وہ اب سے کہیں زیادہ روشن خیال نظر آتی تھی۔

اس وقت کی تو خیر دوسری بات تھی جب سلیم اپنے سیاسی موقف کی تبلیغ پر اترا ہوا تھا۔ باقی اوقات میں میری سلیم کے ساتھ اب بھی اچھی نبھتی تھی لیکن پھر بھی کمال جتنا مجھ سے قریب تھا اتنا وہ نہیں تھا۔ سلیم اپنی رایوں اور تعلقات دونوں میں اپنی ذات کو ملحوظ رکھتا تھا۔ کسی دوسرے کی ضرورتوں اور تقاضوں کا اس کے یہاں کوئی پاس لحاظ نہیں تھا۔ نادرہ کو وہ بے شک خلوص دل سے چاہتا تھا لیکن اس کی ذات یہاں بھی اس پر حاوی رہتی تھی۔ اس کی برہمی کا مطلب ہمیشہ ایک ہی ہوتا تھا کہ اس کی انا کو ٹھیس پہنچی ہے۔ اس کے برخلاف کمال کا جو بھی ردعمل ہوتا، وہ کسی مسئلے، کسی غیر ذاتی وجہ سے ہوتا۔

میں جانتی تھی کہ کمال نے درد کو قبول کر لیا ہے اور یہ سوچ کر قبول کیا ہے کہ اس پر قابو پانے کا یہی طریقہ ہے۔ اس نے جو مجھے یہ خط لکھے تھے ان کے واسطے سے مجھے یہ بات معلوم تھی لیکن وہ اپنے کام سے خوش نظر آتا تھا اور اس وجہ سے بھی خوش تھا کہ اس کام کے واسطے سے اسے اپنے ملک اور اپنے لوگوں کو جاننے کا موقع میسر آیا ہے۔

گھر کا پھیرا وہ کبھی کبھار ہی لگاتا تھا اور یہ پھیرا مختصر ہوتا تھا۔ لیکن ان مہینوں میں جب وہ یہاں ہوتا تو ان بحثوں میں جو یہاں گرم رہتیں وہ کبھی حصہ نہیں لیتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی طرف سے یہ تاثر بھی نہیں ملتا تھا کہ اس کا کوئی نقطۂ نظر نہیں ہے یا یہ کہ زندگی کے بارے میں اس کا رویہ تفریحی ہے۔ اس کی خاموشی کھوکھلی خاموشی نہیں تھی۔ اس خاموشی کے پیچھے ایک ذاتی عقیدے کی طاقت تھی۔۔۔۔۔ ایسے ذاتی عقیدے کی جس کا اعلان کبھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ جب وہ ہمارے درمیان ہوتا تھا تو یہ لگتا تھا کہ ہمیں سانس لینے کی مہلت مل گئی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے آوازوں سے ان کی خشونت رخصت ہو جاتی تھی۔ ہنسنے مسکرانے کا موقع میسر آ جاتا تھا۔ پھر یہ مکان سیاسی ہیڈ کوارٹر نہیں بنا رہتا تھا بلکہ گھر بن جاتا تھا۔

گیارہواں باب

باتیں کر رہی ہوتی یا کوئی کام کر رہی ہوتی یا کچھ سوچ رہی ہوتی، کوئی بھی حالت ہوتی، ہر حالت میں اب میں دو مختلف سطحوں پر زندگی بسر کر رہی تھی۔ اکثر اوقات جب تخیل پہ بیٹھا ہوا پہرہ سست پڑ جاتا تھا تو خارج کی دنیا، جس میں امیر کا کوئی عمل دخل نہیں تھا، دھندلاتی چلی جاتی اور اندر کی دنیا جس میں بس میں اور وہ ہوتے، منور ہو اٹھتی۔ کتنی دفعہ میں ایک دنیا سے سنک کر دوسری دنیا میں جا نکلتی۔ اچانک اپنے آپ میں سمٹ جانا اور غائب دماغ ہو جانا، اس کیفیت سے میرے ارد گرد والوں کو بہت جھنجلاہٹ ہوتی۔ کہتے کہ یہ تو کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتی یا یہ کہ اس کا تو دماغ ہی حاضر نہیں رہتا، یا یہ کہ خود پرست ہے۔ بہر حال جیسا موڈ ہوا اس کے حساب سے اعتراف جڑ دیا۔

عجب بات ہے کہ جس نے اصل بات کو کچھ کچھ بھانپا وہ نندی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ بھی پرخلوص تھی اور میرے ساتھ بھی پرخلوص تھی۔ جب وہ جھوٹی سچی سنا رہی ہوتی اور بے پر کی اڑا رہی ہوتی تو بولتے بولتے ایک دم رک جاتی اور کہتی "لیلی بٹیا! تم پھر کہیں کھو گئیں۔ ارے ہمیں بھی تو بتاؤ کون ہے جو تمہیں لے اڑا۔ تم کس دنیا میں ہو بٹیا، واپس آ جاؤ۔"

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نندی جان جاتی تو اس محبت کو سراہتی، بالکل نہیں۔ اس میں محبت کرنے کا جتنا بھی جذبہ تھا، اتنی ہی اب اس کے یہاں تنگی تھی۔ "مردوں کی محبت کا حال بھی جانوروں والی محبت کا سا ہے۔ کلموا مرد تو چوم چاٹ کے چمپت ہو جاتا ہے کیونکہ جو اس کے بعد ہونا ہے وہ تو اسے بھگتنا نہیں پڑتا۔ اللہ میاں کا یہ انصاف تھوڑا ہی ہے کہ اکیلی عورت کو ساری بھگتنی پڑتی ہے۔"

نندی کی موجودگی میں مجھے اعصابی تناؤ سے نجات مل جاتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ جس بے تکلفی سے وہ مجھ سے باتیں کرتی تھی، میں اُس بے تکلفی سے اس سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ یہ احساس بہر حال رہتا تھا کہ وہ نوکرانی ہے۔

میں نے تو اس سے کہا نہیں تھا، اس نے خود ہی میرا وہ سارا کام سنبھال لیا جو کبھی سلیمن کیا کرتی تھی۔ باپ کی خدمت اور بے ماں کی بچیوں بچوں کی دیکھ بھال سے جو وقت بھی نکال سکتی، نکالتی اور آ کر میرے سارے کام کر ڈالتی۔

نندی دوسری نوکرانیوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ ان سے الگ ہی شے تھی۔ کپڑے وہ بہت موٹے جھوٹے پہنتی تھی مگر دھج کچھ ایسی تھی جیسے کانسی کا کوئی قدیم مجسمہ ہو اور سنگ تراش نے اس پر لباس سلوٹیں دے کر اس نفاست سے تراشا ہو کہ بدن کے توانا سڈول خطوط کچھ کچھ دکھائی دے رہے ہوں۔ تیز نظریں، پیاری سی ہنسی، لگتا تھا کہ وہ دوسروں کا مذاق اڑا رہی ہے۔

سلیمن کا وہ بہت کم ذکر کرتی تھی لیکن ایک روز میرے پاس آئی۔ آنکھیں بھاری بھاری ہو رہی تھیں۔ "رات میں نے سلیمن کو خواب میں دیکھا۔ سر پہ کوئی بھاری پتھر رکھا ہوا تھا۔ اسے اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اس کے پاس گئی کہ کچھ اس کی مدد کروں تو منہ پھیر لیا اور پرے ہٹ گئی۔ بٹیا اس کو مجھ پہ غصہ آ رہا تھا کہ جب اسے مدد کی ضرورت تھی تو اس وقت تو میں نے اس کی مدد نہیں کی۔"

میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا "تو اپنے آپ کو خواہ مخواہ الزام دے رہی ہے۔ تو بھلا کیا کر لیتی۔"

"اس نے بہت غصے سے سر ہلایا۔ سر ہلا کر مجھے منع کر دیا۔ جب اسے مدد چاہیے تھی، اُس وقت تو کسی نے اس کی مدد نہ کی۔ اور یہ کوئی انصاف ہے کہ جس آدمی نے اسے مار ڈالا، وہ مزے میں جی رہا ہے۔ سانپ کو تو مار ڈالنا چاہیے۔ بٹیا تمہیں پتہ ہے کہ سلیمن کے ساتھ چکر کیا تھا؟" وہ ایسے فراٹے سے بول رہی تھی کہ کوئی اسے بیچ میں ٹوک ہی نہ سکے۔ "اسے بیچاری کو ڈر لگا رہتا تھا اور اپنے ڈر کو اس نے چھپایا بھی نہیں، ظاہر کر دیا۔ یہ کام کبھی نہیں کرنا چاہیے۔ زندگی میں آدمی کے پیچھے گیدڑ لگے رہتے ہیں۔ اگر تم ڈر گئے تو پھر وہ شیر چیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر اس گھڑی تم نے اپنا ڈر ظاہر کر دیا تو بس سمجھو کہ تمہاری ہڈی بوٹی چبا جائیں گے۔ مگر اگر تم پلٹ کر ایک دفعہ انہیں ڈپٹ دو، بس ذرا انگلیاں چٹخا دو تو پھر وہی گیدڑ کے گیدڑ۔ دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔"

نندی تھوڑے دنوں تک تو بہت موڈ میں رہی، پھر میں نے دیکھا کہ اس کی چال ڈھال کچھ بدل رہی ہے۔ پہلے وہ غلام علی سے کتراتی تھی، اب وہ بڑے میٹھے لہجے میں اس سے بات کرتی اور دھلوانے والے کپڑوں کی گٹھڑی لے کر خود اس کی طرف جاتی۔

جب نندی کپڑوں کی گٹھڑی سر پر ٹکا کر چلتی تو اس کی چھاتیوں میں تناؤ آ جاتا، کولہے جیسے آہستہ آہستہ جھولا جھول رہے ہوں بلکہ پورا بدن ہی اس انداز سے متحرک ہوتا جیسے کوئی رس میں ڈوبا گیت گایا جا رہا ہے۔ غلام علی تو اس کا بندۂ بے دام بن گیا۔ اپنے حسن پر نازاں وہ اسے ادائیں دکھا دکھا کر لبھاتی تھی، ستاتی تھی۔

غلام علی نے باقی نوکروں کو تو ہمیشہ حقارت ہی سے دیکھا لیکن اب وہ پٹڑی سے اترتا نظر آ رہا تھا۔ کسی نے بھی نندی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا حالانکہ بات اس کی طرف سے شروع ہوئی تھی۔ بس چھوٹی چھوٹی شکایتیں، اکا دکا بات، بس انہی نے ڈھیر ے ڈھیرے اکٹھا ہو کر ایسی فضا پیدا کر دی کہ نوکروں چاکروں کے

یہاں غلام علی کے خلاف جو اندر ہی اندر مواد پک رہا تھا، وہ آخر پھٹ پڑا۔

نظامن اور آیا جو چچی جان سے آ آ کر شکایتیں کیا کرتی تھیں، اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ چچی جان سن تو لیتی تھیں لیکن نوکرانیوں کی جھوٹی سچی باتوں میں آ کر وہ گھر کے اچھے بھلے چلتے انتظام میں اکھاڑ پچھاڑ کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

لیکن نندی نے کوئی جلد بازی نہیں دکھائی۔ اس کی نفرت میں سوچ سمجھ بھی شامل تھی۔ اس نے بہت صبر سے موقع کا انتظار کیا۔ بس اچانک ایک رات نندی کی چیخیں سنائی دیں۔ ایک مجنونانہ انداز میں چیخ چیخ کر وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ سرونٹس کوارٹرز میں سوئے ہوئے لوگوں کی ایک پوری قطار تھی۔ وہ سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ انہیں یہ پتہ ہی تھا کہ نندی آج اپنے کوارٹر میں اکیلی ہے۔ اس کا باپ کسی رشتے دار کی راکھ گنگا جی میں بہانے کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہ سب بھاگے دوڑے وہاں پہنچے۔ نندی پاگل بنی ہوئی تھی۔ چیخ پیٹ رہی تھی اور سنا رہی تھی کہ کس طرح رات گئے غلام علی اس کی کوٹھری میں آن گھسا اور اس کی عزت لوٹنے کے لیے زبردستی کرنے لگا۔ جب اس نے شور مچایا تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

غلام علی کتنے برسوں سے اپنی لاٹ صاحبی کے زعم میں ان غریب نوکروں چاکروں کو رگید رہا تھا، آج وہ اڑنگے میں آ گیا۔ یہ نوکر چاکر عزت و عصمت کے محافظ بن کر اس پر پل پڑے۔ جب اس نے کہا کہ نندی جھوٹی ہے تو انہیں اور تاؤ آیا اور انہوں نے اس کی اور زیادہ ٹھکائی کی۔

اس موقع پر ہمارے چچا جان بھی بے بس ہو گئے۔ ویسے تو انہیں یقین تھا کہ نندی نے جھوٹ بولا ہے مگر وہ اسے سزا کیسے دیتے اور غلام علی کا بچاؤ کیسے کرتے۔ نندی تو اس وقت ہیروئن بنی ہوئی تھی۔ غلام علی کے دور دفان ہو جانے کے بعد وہ کس مزے سے گنگنا رہی تھی اور لپک جھپک کام کر رہی تھی۔

بارہواں باب

باتیں کرنے کا تو اب کوئی روادار ہی نہیں تھا۔ جسے دیکھو بحث پہ تلا ہوا ہے اور بحث تھی اس ڈھب سے کہ اس شہر کی شائستہ روایات کا کوئی پاس لحاظ نہیں۔ یہ تو وہ شہر تھا جہاں گفتگو کو ایک فن لطیف کا درجہ حاصل تھا۔ لفظوں کو کس چاؤ سے برتا جاتا تھا کہ جیسے یہ تو بس فنکارانہ اظہار کے لیے بنے ہیں۔ اور جو زبانی بحثیں ہوتی تھیں ان سے اسی طور لطف اٹھایا جاتا تھا جس طور آتش بازی کے کھیل میں بکھرتے اڑتے رنگ برنگے ستاروں اور چمکتے پھولوں کی بارش کو دیکھ کر لطف اٹھایا جاتا تھا۔ مگر اب تو بحثوں سے یہ لگتا تھا کہ کسی نے بارود کو دیا سلائی دکھا دی ہے۔ جو وار اور جوابی وار کیے جاتے اس میں کوشش یہ ہوتی کہ حریف کو گھائل کر دیا جائے۔

اب تو یہاں مہمان بھی بحث مباحثہ کرتے ہوئے آتے تھے۔ اس گھر میں اب ایک اور ہی قسم کی مخلوق آتی جاتی دکھائی دیتی تھی۔ کٹر قسم کے وڑھیل لوگ اور جنونی قسم کے نوجوان، یہ دو مخلوقات سلیم سے ملنے بہت آتی تھیں۔ اُجڈ گنوار و زمیندار اور ان کے ساتھ ان کے جی حضوریے، یہ وہ لوگ تھے جو ہمارے چچا جان سے ملاقات کے لیے آتے تھے۔ علامتی طور پر سلیم نے اپنی ٹائی کو اور چچا جان نے اپنے دستانوں کو اتار پھینکا تھا۔ شائستہ و مہذب ٹی پارٹیوں اور ڈنر پارٹیوں کا چلن اب بہت کم ہو گیا تھا اور گورنمنٹ ہاؤس کے استقبالیوں کی حیثیت اب وہی تھی جو تھیٹر میں انٹرول کی ہوتی ہے۔

اب گھر پہ جب کھانے کا اہتمام ہوتا تو وہ گھڑیاں بھی بہت کٹھن گزرتی تھیں۔ لگتا تھا کہ کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔

باپ سیر تو بیٹا سوا سیر، دونوں اپنے اپنے نقطۂ نظر پہ اڑے رہتے تھے۔ اگر ان میں تھوڑی سی بھی رسانیت ہوتی تو شاید لفظی جنگ و جدل اتنی نہ ہوتی۔ حامد چچا کے خیال میں سلیم پر یہ واضح کرنا بہت ضروری تھا کہ اس کا فرض اولین کیا ہے اور انہیں یہ دیکھ کر بھی بہت تکلیف ہوتی تھی کہ سلیم کا جو اپنا پیشہ ہے اس کے کام کی طرف سے وہ غفلت برتتا ہے۔

ہمارے چچا جان اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں چار دن کے دورے پر تھے۔ ان کی واپسی پر آج چار دن کے بعد ہم کھانے پر اکٹھے ہوئے تھے۔ میں جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سلیم کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ آتش دان کے پاس اس شان سے کھڑا تھا کہ دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے،

اپنی ایڑیوں پر اس طرح کھڑا ہو جاتا جیسے جھول رہا ہو، اس شان سے کھڑا وہ بول رہا تھا۔

حامد چچا اپنی مرغوب کرسی پر دراز تھے۔ ان کا سر پیچھے کرسی کی پشت پر ٹکا ہوا تھا۔ تھکن کی وجہ سے ان کے چہرے کی لکیریں اور گہری ہو گئی تھیں۔ سائرہ چچی اونچے پیتل والے لیمپ کے برابر بیٹھی بُننے میں مصروف تھیں۔ میں لیمپ کی روشنی کی حد سے ذرا ہٹ کر صوفے کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گئی۔

سلیم رواں تھا ''آخری تجزیے میں یہ بات واضح ہو کر سامنے آئے گی کہ آپ کو جس صورت حال سے سابقہ ہے، وہ یہ ہے کہ بورژوازی اقتدار پر قبضے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اور یہ جو تحریک ہے یہ کوئی کسانوں کی تحریک نہیں ہے۔ بہر حال جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا وقت آتا ہے تو طبقاتی مفادات بھی فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ جو چار سو ساڑھے چار سو تعلقہ دار ہیں، انہوں نے اس پر زور دیا کہ جو ہزاروں زمیندار ہیں ان کے مقابلے میں برطانیہ کو انہیں زیادہ نمائندگی دینی چاہیے۔''

''سوال خالی تعداد کا نہیں ہے۔'' حامد چچا سنبھل کر بیٹھ گئے اور پائپ کو اس طرح سے گردش دی کہ جیسے اس سے وہ تردید کا کام لے رہے ہیں۔ ''ہم تعلقہ داروں کو قدیمی حقوق و مراعات حاصل ہیں۔ ایک خصوصی چارٹر کے ذریعے ہمیں یہ حقوق و مراعات دیئے گئے تھے۔ ان کا ہمیں تحفظ کرنا ہے۔''

''آج ان مراعات کے کیا معنی ہیں؟'' سلیم نے حقارت آمیز لہجے میں کہا: ''انگریزوں نے وفاداری کے انعام میں یہ مراعات عطا کی تھیں اور اب چونکہ عوام سیاسی طور پر باشعور ہو گئے ہیں اس لیے وہ اس طرح کے حقوق کے بارے میں سوال اٹھائیں گے کہ یہ کس خوشی میں عطا ہوئے تھے۔ انہیں یہ لڑائی لڑنی ہوگی۔''

''ہمارے حقوق کا عوام کے حقوق کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہے۔ روایت تو یہ چلی آ رہی ہے کہ ہم نے ہمیشہ ان کے حقوق کی پاسبانی کی ہے۔'' حامد چچا نے پائپ کا رخ اس انداز سے سلیم کی طرف کیا جیسے وہ اس کو ملزم ٹھہرا رہے ہیں۔ ''تم شعور اور تعلیم کی بات کرتے ہو۔ تو واقعہ یہ ہے کہ اس شہر کی تعلیمی درس گاہیں ہمارے عطیوں کے فیض سے چل رہی ہیں۔ ہم سال کے سال لاکھوں کی رقم ان درس گاہوں کے لیے اور دوسرے خیراتی کاموں کے لیے دیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن تم اور تمہارا بھائی بھی اس شہر کے لیے اور اس شہر کے لوگوں کے لیے اتنا ہی کچھ کریں گے جتنا تمہارے بزرگوں نے ان کے لیے کیا تھا۔''

سائرہ چچی نے تائید میں سر ہلایا اور مسکرائیں جیسے انہیں یہ احساس گدگدا رہا ہو کہ اس کارِ خیر میں ان کا بھی حصہ ہے۔

کیا ان کے تصور میں اینچیوں کے اس دلکش محبوب شہر کے باغ اور سبزہ زار گھوم رہے تھے، اور گنبد و محراب، ندی اور پل، ندی کے شاداب کنارے اور شائستگی و شاعری۔

''بالکل، یقیناً روایت کا احترام واجب ہے۔ آدمی اپنے لیے، اپنے مفادات کے لیے لڑتا ہے۔

لیکن آپ کسانوں سے یہ توقع نہ کریں کہ اس وجہ سے آپ لوگ بھی ان کے محبوب بن جائیں گے۔''

''اور اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نام نہاد اصلاحات ان نجی رشتوں کو جو زمیندار اور کسان کے درمیان ہوا کرتے تھے، ملیامیٹ کئے دے رہی ہیں۔ آخر حکومت کے اور اس کے ان افسروں کے، جن کے آئے دن تبادلے ہوتے ہیں، کسانوں سے نجی قسم کے یا روایتی رشتے تو قائم نہیں ہو سکتے۔ عوام کا مستقل ربط ضبط کس کے ساتھ ہوتا ہے؟ زمینداروں کے ساتھ یا سیاسی لیڈروں کے ساتھ۔'' یہ تو کوئی دلیل نہیں تھی۔ حامد چچا بس ایک جواز پیش کر رہے تھے زندگی کے اس طور کا جو سلیم کے لیے جانی مانی چیز تھی۔

''حقیقت میں یہ لیڈر ہیں کون؟ وہ لوگ جو کھوتے کچھ نہیں کماتے بہت کچھ ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ بس وہ لمبے چوڑے وعدے کر چھوڑتے ہیں۔ میں تمہیں بتادوں کہ ان سے صرف زمینداروں ہی کو نہیں ملک کو بھی خطرہ ہے۔'' حامد چچا نے یہ بیان اس شان سے دیا کہ ایک ایک لفظ پر کرسی کے ہتھے پر مکا مارتے تھے'' انگلستان کے حوالے سے مت سوچو۔ وہاں صدیوں کے عمل کے بعد لوگوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کرنا سیکھا ہے۔''

''مگر یہاں بھی کسی نہ کسی وقت تو اس کام کا آغاز کرنا ہی ہوگا۔''

حامد چچا نے اس دخل در معقولات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ بدستور جاری تھے'' زمینداروں کو اس خیال سے پریشانی ہونی ہی چاہیے کہ اتنے اختیارات افسروں کو ایسے وقت میں دیئے جا رہے ہیں جب یہ پتہ نہیں کہ سیاسی اقتدار کے مالک کون لوگ بنیں گے۔'' انہوں نے پائپ کا رخ سلیم کی طرف اس طرح کیا جیسے وہ پائپ نہ ہو سکول کے ماسٹر صاحب کا رولر ہو۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ایک پیمبرانہ شان کے ساتھ گویا ہوئے'' مستقبل کی کسی بھی حکومت کو کھلی چھٹی ہوگی کہ وہ قانونی تحفظات کے باوجود زمینداری نظام کو یکسر ختم کر دے۔''

''جو چیز ہماری ہے اسے وہ ہم سے کیسے لے سکتے ہیں۔ زمین تو ہماری ہے۔'' سائرہ چچی نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ان کے لیے تو یہ سیدھی سی بات تھی۔

ڈنر کی گھنٹی عجب بے تکی بجی کہ جاری گفتگو میں کھنڈت پڑ گئی۔ سائرہ چچی نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولیں'' ڈنر تیار ہے۔''

حامد چچا بے چین ہو کر بولے'' کوئی بات نہیں۔ ڈنر ہمارا تھوڑا انتظار کر سکتا ہے۔''

''نہیں'' سائرہ چچی نے گرم ہو کر کہا'' تمہاری بحث انتظار کر سکتی ہے۔ ڈنر کے معاملے میں انتظار نہیں ہو سکتا۔''

''بحث؟'' حامد چچا پھٹ پڑے'' یہ بحث ہے؟ یہ ہمارے وجود کا سوال ہے۔''

''کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' سائرہ چچی اپنے موقف پر ڈٹی رہیں۔ وہ دروازے کی طرف چل دیں۔

سلیم ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ میں انتظار کرتی رہی کہ حامد چچا اٹھیں تو میں بھی اٹھوں۔ سلیم کو عجب سی سوچ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بہت بے دلی سے اٹھے۔ انہوں نے اس وقت اپنی دانست میں جان توڑ کوشش کی تھی کہ بیٹے کو اپنے موقف کا قائل کرلیں۔

کھانے کی میز پر جا کر ہم بہت خاموشی سے اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کلف دار سفید میز پوش پر سجے گلدان میں گلاب کے سرخ پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ نازک ونفیس فانوس سے روشنی چھوٹ رہی تھی اور روز ووڈ پر پڑ رہی تھی۔ چاندی اور تانبے کی اشیاء اس سے چمک اٹھی تھیں۔ شیشے اور بلور کے ظروف جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ چینی کے پلیٹ اور ہاتھ دانت کی دیواروں پر آویزاں تصویریں اس روشنی سے اجل گئی تھیں۔ زردی مائل سبز رنگ کے بیل بوٹوں والے پردوں کو چنٹیں اس کے اثر سے گہری گہری دکھائی دے رہی تھیں۔ حامد چچا کا یہ کہنا کہ یہ ہمارے وجود کا سوال ہے، کتنا غیر حقیقی نظر آ رہا تھا۔ جن چیزوں کی کچھ حقیقت اور اصلیت تھی وہ تھے حسن و جمال کے معاملات، امیر اور میرے معاملات۔

سلیم کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ایک بحث کھڑی ہو اور گرم ہونے سے پہلے اس میں کھنڈت پڑ جائے۔ تو اس نے بات یوں شروع کی" پاپا! آپ نے جو یہ ارشاد فرمایا تھا کہ زمینداروں کو زمینداری نظام کی تنسیخ کا اندیشہ ہے تو اصل معاملہ یہی ہے۔ انہیں یہ ڈر ہے کہ ان کا وجود مٹ جائے گا۔ جونئی پارٹی بنی ہے اس کی بنیاد یہی ڈر ہے۔ یہ پارٹی چاہتی ہے کہ حالات جوں کے توں رہیں۔ وہ 'سٹیٹس کو' کی حامی ہے۔ اس تصور کو برطانوی حکومت کی حمایت حاصل ہے۔ یہ تصور بنیادی طور پر ترقی پسند قومی تحریکوں کی نفی ہے۔" یہ کہنے کے بعد سلیم کو سکون آ گیا۔ اب وہ مزے سے کھانا کھا رہا تھا اور اپنی آواز سے جیسے لطف اٹھا رہا ہو۔

حامد چچا طنز بھرے لہجے میں بولے" یہ مسلم لیگ ہے ناں جس میں تمہیں بہت دلچسپی ہے۔ اسے نیشنلسٹ مسلمان فرقہ پرست اور رجعت پسند کہتے ہیں۔ میں نے اپنے کانوں سے انہیں یہ کہتے سنا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اکثر راہنما، جن میں سے بہت سے میرے دوست ہیں، اس قسم کے لوگ ہیں جو تمہارے سیاسی نظریات کی رُو سے رجعت پسند ٹھہرتے ہیں۔"

سلیم لال بھبھوکا ہو گیا" میں سمجھتا ہوں کہ کانگریس کی صفوں میں ایسے لوگ گھسے ہوئے ہیں جو مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے خلاف منظم ہونا چاہیے۔ یہ خطرہ اس وجہ سے زیادہ سنگین ہے کہ یہ عناصر چھپے ہوئے ہیں۔ جب انگریزوں سے لڑنے کا مرحلہ تھا تو ترقی پسند طاقتیں پیش پیش تھیں۔ لیکن اب جب کہ اقتدار سنبھالنے کا مرحلہ آیا ہے تو یہ کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے عناصر اپنا سر اٹھا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے خلاف اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہیے۔"

میں نے چپکے سے کہا" دنیا کے مسلمانو ایک ہو جاؤ۔" اصل میں سلیم بہت بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ تو ایک تو میں ویسے ہی بور ہو رہی تھی، پھر میں نے سلیم کے یہ تیور دیکھے تو میں نے سوچا کہ اس کے غبارے سے تھوڑی

ہوا نکالی جائے۔ جو باتیں وہ کر رہا تھا وہ پہلے کتنی مرتبہ کہی جا چکی ہیں، کب سے ان باتوں کو دہرایا جا رہا ہے۔

سلیم کی بھویں تن گئیں۔ وہ میرے پاس سے تھوڑا سرک گیا۔ اور اب وہ مجھ سے بے رخی برت رہا تھا۔

''ہندوؤں کی اکثریت یہ بھول نہیں پائی ہے کہ مسلمانوں نے ان پر صدیوں تک حکومت کی ہے۔ وہ اس قصور کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اب وہ جمہوریت کے راستے اس کا انتقام لیں گے۔ انگریزوں کی مثال سامنے ہے۔ انہوں نے تو یہاں صرف دو سو سال حکومت کی ہے مگر دیکھ لو کہ ان کے خلاف کتنی نفرت پک رہی ہے۔''

سائرہ چچی اچانک بول اٹھیں ''ڈیئر! ہندوؤں کی حکومت سے تو کہیں بہتر یہ ہے یہاں انگریز ہی رہیں۔''

حامد چچا کا پیمانۂ صبر اب لبریز ہو چلا تھا۔ درشت لہجے میں بولے ''سلیم، تم نے بہت جلدی بہت زیادہ جان سمجھ لیا ہے۔ میرا اندازہ ہمیشہ سے یہی چلا آ رہا ہے کہ ہندو اور مسلمان سیاسی سطح پر مل کر چل سکتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر دوستانہ تعلقات کی بنیاد پر مل جل کر رہ سکتے ہیں۔''

''پاپا! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے بہترین دوست ہندو ہی ہیں لیکن اس وقت مفادات کا اتنا شدید تصادم نہیں تھا جتنا اب پیدا ہو گیا ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ آپ کا سیاسی تجزیہ اُس زمانے کا ہے جو اب دم توڑ رہا ہے۔ آپ کا رویہ جاگیردارانہ ہے۔''

''خالی لفظ، نظریے، غیر ذمہ دارانہ گفتگو'' حامد چچا پھٹ پڑے ''میں جاگیرداری کا حصہ ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔ میں اس کی حمایت میں لڑوں گا۔ یہ میرا ورثہ ہے۔ ویسے تمہارا بھی ہے۔ اچھا ہے کہ میں تم پر یہ جتا دوں اور ساتھ میں یہ بھی جتاتا چلوں کہ تم اس کے رجعت پسندانہ فوائد سے فیض یاب ہو رہے ہو۔ تم بڑی چرب زبانی سے اس کو نیست و نابود کر دینے کی باتیں کرتے ہو مگر تمہارا سارا عیش اسی کے وجود کا مرہونِ منت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تمہاری گزر بسر کا واحد وسیلہ ہی یہ نظام ہے۔''

''یہ جائز بات نہیں ہے۔'' سلیم نے طیش میں آ کر احتجاج کیا ''بحث کو ذاتی سطح پر لے آنا کوئی جائز بات نہیں۔''

''بحث؟ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں بحث برائے بحث کا قائل نہیں ہوں۔ میں جو بات کرتا ہوں اس پر ایمان بھی رکھتا ہوں۔''

''پاپا! میرا معاملہ بھی یہی ہے۔''

''تو پھر جو تمہارے عقائد ہیں ان کے مطابق چلو۔ قربانیاں دینے کے لیے کمر کسو۔ اپنے ایمان کے ساتھ جینے کی ہمت پیدا کرو۔ رجعت پسندی کی زندگی بسر کرنا ترک کر دو۔'' حامد چچا کے چہرے پر غصے سے تشنج کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

روز کسی نہ کسی بات پر کسی نہ کسی مرحلے پر پہنچ کر پارہ چڑھ جاتا اور غیظ و غضب کا مظاہرہ ہونے

لگتا۔ میرے اندر تو ایک تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ سائرہ چچی نے اپنے میاں اور اپنے نورِ نظر کو دکھ بھری نظروں سے دیکھا۔ لگتا تھا کہ بھڑکتی آگ کے سامنے کھڑی ہاتھ مل رہی ہیں۔

نوکر چاکر آ جا رہے تھے۔ پلیٹیں اٹھا رہے تھے اور رکھ رہے تھے۔ کبھی پانی لے کر دوڑتے، کبھی کھانا لیے چلے آ رہے ہیں۔ چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں، بس جیسے مشین میں چابی بھری ہوئی ہو اور وہ حرکت میں ہو۔

سلیم کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ وہ اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ ظاہر ہونے نہیں دینا چاہتا تھا کہ اس کی خودداری کو ٹھیس پہنچی ہے" پاپا! میں آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کسی سہارے زندگی گزارنے کا سوال نہیں ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہوں۔ اگر آپ اس طرح سے سوچتے ہیں۔۔۔۔ مجھے تو یہ گمان نہیں تھا۔۔۔۔ لیکن ایسا ہے تو میں یہاں سے اپنا بستر بوریا باندھ لوں گا اور اپنے لیے کوئی کام ڈھونڈ لوں گا۔"

سائرہ چچی نے حامد چچا کو ایسے دیکھا جیسے بولے بنا ان سے التجا کر رہی ہوں کہ بس کرو لیکن ان کا غصہ تو خود ان کی اپنی ہٹ دھرمی سے تقویت پکڑ کر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

"کام تو تمہارے پاس موجود ہے، اگر تم اس پر دھیان دینے کی ضرورت سمجھو تو۔"

سلیم کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔ پتلیاں جیسے پتھرا گئی ہوں اور جب اس نے سامنے سے پلیٹ زور سے پیچھے ہٹائی تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آج کی رات اس نے گفتگو کا آغاز بڑے اعتماد اور گرم جوشی کے ساتھ کیا تھا لیکن اس وقت وہ گرم جوشی اور اعتماد غائب ہو چکا تھا۔ اس نے کوشش کر کے اپنے لہجے میں آہستگی پیدا کی اور بولا" میں اپنے کام کو چھوڑنے کی کوئی نیت نہیں رکھتا تھا۔ آخر دو مشاغل ساتھ ساتھ بھی تو چل سکتے ہیں۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ جن سوالات کے حوالے سے یہ الیکشن لڑے جا رہے ہیں، وہ ہمارے مستقبل کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ جتنا میرے بس میں تھا اتنا میں نے کر دیا۔ بہر حال اب جو کام کا دباؤ ہے وہ تو عارضی ہے۔"

"اپنے کیریئر کو تم چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے مگر تم نے اس کا آغاز ہی کب کیا تھا۔ آخر تم نے تربیت کس کام کے لیے حاصل کی تھی؟ وکیل بننے کے لیے یا الیکشن ایجنٹ بننے کے لیے؟"

جو کچھ ہو رہا تھا بہت برا ہو رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ چیخنا شروع کر دوں۔ بیچاری سائرہ چچی کی دبی دبی دکھ بھری آوازیں نکل رہی تھیں۔

باپ کی طعن و تشنیع، اوپر سے غصہ، اس دوہرے حملے سے سلیم کے صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہو گیا۔ بس اب چھلکا اور اب چھلکا۔

"بیگم وحید کو ضرورت تھی کہ ان کا کوئی ہاتھ بٹائے۔"

''یہ ضرورت تو میری بھی تھی۔''

''مگر پاپا آپ نے مجھ سے کہا ہوتا۔''

''میں تم سے درخواست کرتا، کہتا۔ میں نے اپنے بیٹوں سے کبھی کسی قسم کا تقاضا نہیں کیا۔ انہیں پڑھا لکھا دیا، اس کے بعد یہ ان کا کام تھا کہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ویسے بھی میں یہ ہرگز گوارا نہ کرتا کہ تم میری خاطر اپنے کام سے غفلت برتو۔ مگر بیگم وحید کو اس کا کیا حق تھا۔ ان کی بلا سے تمہارا کیریئر بنتا ہے یا بگڑتا ہے۔ وہ کون سی تمہاری کفالت کرتی ہیں۔''

آخر پیمانہ چھلک گیا۔''اور نہ آپ کرتے ہیں۔ میں آپ سے اور کچھ نہیں چاہتا۔ صرف وہ چاہتا ہوں جو بیٹے کی حیثیت سے میرا حق ہے۔ بیگم وحید کو اب تک میرے کیریئر سے بے شک غرض نہ ہو مگر آئندہ انہیں اس سے غرض ہوگی۔ میں ان کی بیٹی سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

سائرہ چچی چیخ پڑیں''سلیم!''

میرے اندر جو ایک اینٹھن سی ہو رہی تھی، اس میں اچانک نرمی آ گئی۔ جیسے مجھے آرام آ گیا ہو۔ اس میں کوئی گھٹیا پن یا چھچھورپن نہیں تھا۔ یہ معاملے کی بات تھی۔

حامد چچا دم بھر کے لیے تو ششدر رہ گئے اور زبان کو تالا لگ گیا۔ پھر انہوں نے میز پر مُکا مارا''تم جس سے چاہو شادی رچاؤ، میری بلا سے۔ جو تمہارے جی میں آئے کرو مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔ جب تک میں اس گھر کا والی ہوں اُس وقت تک یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے کہ یہاں کون رہے گا۔''اور کرسی کو زور سے پیچھے دھکیل کر کھڑے ہوئے اور کمرے سے نکل گئے۔ ادھر سلیم نے تلخ لہجے میں کہنا شروع کیا''میں آپ کے اس حق کو چیلنج نہیں کروں گا۔ ہاں جس گھڑی میں یہ محسوس کروں گا کہ اس گھر میں اب مجھے برداشت نہیں کیا جا رہا، میں اسی گھڑی یہاں سے بستر باندھ لوں گا۔''

ملازم نے، جس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا، کرسی کو اٹھا کر پھر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ میں نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

سائرہ چچی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں''سلیم! تمہیں غصے میں آ کر ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

''میں نے کوئی غیر ذمہ دارانہ بات نہیں کی لیکن پاپا نے جو کچھ کہا۔۔۔۔۔''

''تمہارے پاپا کو اس وقت صدمہ ہوا ہے۔ غصے میں کہہ رہے تھے، مطلب ان کا یہ نہیں تھا۔''

''لیکن میرا مطلب وہی تھا جو میں نے کہا۔''

''لیکن بیگم وحید۔۔۔۔۔۔ کے بارے میں نادرہ کے بارے میں۔۔۔۔۔'' چچی جان ایسی سٹپٹائی ہوئی تھیں کہ ان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

''ہاں یقیناً نادرہ کے بارے میں۔ سب سے بڑھ کر تو میں نے اسی کے بارے میں۔۔۔۔۔''

''لیکن یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے۔''

''پھر اور کون سا طریقہ تھا؟ بہانہ بازی، شعبدہ بازی؟ لیلیٰ کے ذریعے پیام و سلام بھیجتا؟''

''ان لوگوں کو۔۔۔۔۔انہیں پتہ ہے؟ تم نے بیگم وحید کو بتایا ہے۔۔۔۔۔اور نادرہ کو۔۔۔۔۔؟'' ان کی آواز کھینچتی چلی گئی۔ اس طرح سے بات کرنا ان کا طریقہ نہیں تھا۔

''نہیں، یقیناً نہیں بتایا۔ یہ بات یہاں تو اس لیے کہی کہ مجھے کہنی پڑ گئی۔ نادرہ کی والدہ ماجدہ بھی تو آپ سے ایسی مختلف نہیں ہیں۔ اگر ان سے سیدھے سچے طریقے سے یہ بات کہہ دی جائے تو انہیں بھی سخت ذہنی طور پر دھچکا لگے گا۔ وہاں تو بات کہنے کے لیے اتنے سارے تکلفات سے گزرنا پڑے گا۔ جھوٹ موٹ کا یہ تاثر دینا پڑے گا کہ یہ تجویز آپ کی ہے اور یہ کہ آپ کے نیک پاک بچے ایسی بے شرمی کی بات سوچ بھی نہیں سکتے کہ اپنی شادی کے متعلق خود فیصلہ کریں لیکن آج کے اس واقعے کے بعد معاملے کی صورت بدل گئی ہے۔ اب تو یہ ہے کہ جونہی مجھے کوئی ملازمت ملی اور نادرہ بھی رضامند ہو گئی تو کسی ٹیم ٹام کے بغیر فوراً ہی شادی کر ڈالوں گا۔''

''نہیں سلیم نہیں۔ تمہیں جلدی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ وہی ہو گا جو تم چاہو گے، بس ذرا صبر سے کام لو۔ نادرہ اچھی لڑکی ہے۔ وہ خاندان بے شک ہماری توقعات پر پورا نہ اترے مگر نادرہ بہت پیاری لڑکی ہے۔ ہر کام قاعدے اور قرینے سے ہو گا۔''

''آپ کو قاعدے قرینے کی پڑی ہے۔'' سلیم آگ بگولا ہو گیا ''یہ جو اتنی باتیں ہوئی ہیں وہ آپ کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں؟ مجھے انہوں نے طفیلیہ کہہ دیا۔ یہ کہہ دیا کہ تم ہم پر بوجھ ہو۔ اتنا کچھ ہو گیا اور آپ ہیں کہ قاعدے قرینے کو لیے پھر رہی ہیں۔''

سائرہ چچی چلا پڑیں ''سلیم! تمہیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ ایسی بہت باتیں غصے میں کہی جاتی ہیں۔ ان کا یوں کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ تمہارے پاپا تمہیں بہت چاہتے ہیں۔'' ان کے رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے۔ وہ رومال ٹٹولنے لگیں۔ سلیم نے اپنا رومال نکال کر آنسو پونچھے اور بڑی رسانیت سے کہا ''امی روئیے مت۔ میں آپ کو روتا دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ کو چوما اور اٹھا کر اسے اپنی آنکھوں پر رکھ لیا'' تم ہم سے بہت دنوں تک الگ رہے ہو۔''

سلیم نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ سائرہ چچی نے اس کا ہاتھ پکڑ کے منت کرتے ہوئے کہا ''اپنے پاپا کے پاس جاؤ اور جا کر سوری کہو۔''

''جا کے کہوں کہ آئی ایم سوری لیکن۔۔۔۔۔''

''وہ تمہارے باپ ہیں۔۔۔۔۔بڑوں کا ادب کیا کرتے ہیں۔''

"لیکن بات ان کی طرف سے شروع ہوئی تھی۔"

"ان کا دل دکھا ہوا تھا۔"

"اور ہاں گھر چھوڑنے کی بات آج کے بعد کبھی تمہاری زبان پر نہیں آئے گی۔"

"لیکن بات میری طرف سے تو شروع نہیں ہوئی تھی۔"

"اچھا اس قصے کو ختم کرو۔" سائرہ چچی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انہی آنسوؤں کے بیچ وہ مسکرانے بھی لگیں اور پھر سلیم کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

تیرہواں باب

میں نے منصوبہ یہ بنایا تھا کہ دسمبر کی چھٹیوں میں عابدہ پھپھی کو دیکھنے جائیں گے۔ مگر پھر امیر کا خط آ گیا کہ میں ہفتے بھر کے لیے آ رہا ہوں۔ رضا علی کے پاس ٹھہروں گا۔ مگر کن تاریخوں میں؟ یہ ابھی طے نہیں ہے۔ اب میں یہ تو نہیں کر سکتی تھی کہ وہ ادھر آئے اور میں کہیں باہر چلی جاؤں۔ سو میں نے عابدہ پھپھی کو لکھا کہ پڑھائی کا کام بہت سر پہ آ پڑا ہے۔ اسے پورا کرنا ہے، اس لیے میرا یہاں سے نکلنا مشکل ہو گا۔

انہوں نے اس خط کا بہت شفقت بھرا جواب بھیجا۔ یہ جواب پڑھ کر میں پانی پانی ہو گئی۔ ایک احساسِ جرم نے مجھے آ گھیرا۔ لیکن میں کیا کرتی، کوئی طاقت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

جب تک امیر نہیں آیا تھا انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گزارتی تھی اور جب وہ آ گیا تو سو طرح کے بہانے بنانے پڑتے تھے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔ منہ سے جو بات نکالتی، جو بھی نظر اٹھاتی، جو قدم اٹھاتی، غرض ہر بات میں سخت احتیاط برتتی کہ کہیں ہماری کوئی خفیف سی حرکت ہمارے معاملے کی چغلی نہ کھا جائے۔ دن کا ہر ہر گھنٹہ کتنا طول پکڑتا چلا جاتا اور یہ سارے گھنٹے اس انتظار میں گزرتے کہ کب وہ لمحے آئیں گے کہ جو باتیں میں سوچ رہی ہوں وہ حقیقت کا روپ اختیار کریں گی۔ کب وہ صورت نظر آئے گی، کب وہ میٹھی آواز سنائی دے گی، کب لمس کی لذت حاصل ہو گی۔ سارا شہر بھرا بھرا لگتا تھا اس لیے کہ وہ اس شہر میں موجود تھا۔ ہر کوچہ، ہر گلی کے موڑ پر گمان ہوتا تھا کہ ابھی وہ آ نکلے گا۔

خلوت ہمیں کہاں میسر آتی تھی۔ بڑی مشکلوں سے پل دو پل ایسے مل جاتے تھے جیسے ہم نے انہیں وقت کے بیچ میں سے چرا لیا ہو۔ یہی پل دو پل ہمارے لیے سچائی کے پل ہوتے تھے لیکن مستقل دھڑکا لگا رہتا کہ اب کوئی آیا، اب کوئی آیا۔ تو ہم ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہتے تھے کہ جیسے ہی کسی کی آہٹ ہو گی ہم تیزی سے اپنے من کی دنیا سے نکل کر لوگوں کی دنیا میں، حقیقتوں کی دنیا میں آ جائیں گے۔

جب سائرہ وچچی موجود ہوتیں تو لگتا کہ وہ ہمیں تاڑ رہی ہیں۔ جیسے اندھے بھینسے کا کھیل ہو رہا ہو کہ ذرا چوک ہوئی اور پکڑے گئے۔ امیر سے وہ کچھ زیادہ ہی خوش اخلاقی سے پیش آتی تھیں۔ اندر سے تو اس کو برا ہی جانتی تھیں۔ شاید یہ خوش اخلاقی بھی اس چیز کو چھپانے ہی کا ایک طریقہ تھی۔ ملاقات کے ہم کیسے کیسے ہوائی منصوبے بناتے تھے۔ ملنے کا سب سے اچھا اور سب سے طویل موقع وہ ہوتا تھا جب ہم اکٹھے نادرہ اور

سلیم کے ساتھ فلم دیکھنے جاتے تھے۔ کس طرح آنکھ بچا کر چوری چوری بالکل بچوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے۔

آخر اس کے واپس جانے کا دن آ گیا۔ کتنی باتیں ان کہی رہ گئی تھیں۔ ابھی تو ایسا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ کوئی گھڑی ایسی بھرپور گزاری ہی نہیں تھی کہ بعد میں اس کے تصور کے زور پر جدائی کی گھڑیاں گزارتے۔ تو پھر سے جدا ہو جانے کا خیال ہم پہ بہت شاق گزر رہا تھا۔

اس کی گاڑی رات کو ذرا دیر سے روانہ ہونی تھی، اور میں اس پہ تلی ہوئی تھی کہ جانے سے پہلے کسی صورت اکیلے میں ملاقات کرنی ہے۔ مجھے اس کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ دیکھو میں سٹوڈنٹس ہوسٹل میں ایک فرینڈ سے ملنے جا رہی ہوں، تم وہاں ٹھیک چھ بجے آ ؤ۔ میں گیٹ پہ کھڑی ملوں گی۔ ویسے بھی اس وقت اندھیرا ہو گا۔ عجب سی بات ہے کہ آدمی ایک دفعہ دل پہ دھر لے کہ یہ کام کرنا ہے تو پھر اس کا ذہن خود ہی اس کے لیے بہانے تراشتا چلا جاتا ہے۔ میں نے سائرہ چچی سے کہا کہ میری کالج کے زمانے کی ایک سہیلی ایک دن کے لیے آئی ہوئی ہے۔ اس نے شام کو مجھے ہوسٹل بلایا ہے۔ آج ہی موقع ہے۔ پھر اس سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ تو آپ کا کیا خیال ہے، میں چلی جاؤں؟ کار مجھے وہاں ڈراپ کر دے گی اور اُدھر سے مجھے کوئی گھر پہنچا دے گا۔ اور اب میرا دل دھکڑ پکڑ کرنے لگا کہ چچی جان مجھ سے کچھ پوچھیں گی۔ میرے جھوٹ نے خود ہی اپنے اردگرد شک کا ایک جالا پور لیا تھا۔ لیکن چچی جان اپنے قصوں قضیوں میں مبتلا تھیں۔ انہوں نے بس اتنا کہا "ہاں ہاں ٹھیک ہے۔" اور اس طرح مجھے احساس ہوا کہ یہ بھی کیا حماقت ہے کہ اک ذرا سی بات کے لیے چچی جان کو پریشان کیا جا رہا ہے۔

سارے دن میرا دل ہولتا رہا۔ ہزار طرح کے وہم دماغ میں چکر کاٹتے رہے کہ کہیں یوں نہ ہو جائے اور ووں نہ ہو جائے۔

چھ بج کر پانچ منٹ پر ڈرائیور نے مجھے اس اونچے گیٹ کے سامنے اتار دیا۔ اس اندھیری سنسان بغلی سڑک پر کوئی اور کار نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں وہاں انتظار میں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں پورچ کی طرف چلی۔ پہریدار کوئی اجنبی تھا جسے میں بالکل نہیں پہچانتی تھی۔ چلو یہ اچھا ہوا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں فلاں پروفیسر صاحب سے ملنے آئی ہوں جس کے متعلق مجھے پتہ تھا کہ ان کی تو یہاں سے مہینوں پہلے رخصتی ہو چکی ہے۔

جا کر میں پھر واپس گیٹ پہ آ گئی اور اس طرح ظاہر کیا کہ پروفیسر کے نہ ملنے سے میں بہت مایوس ہوئی ہوں۔ یہاں اب بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بوڑھا آدمی میرے قریب آیا۔ اسے تھوڑا تجسس بھی تھا۔ جاڑے کی وجہ سے اس نے اپنے کندھے سکیڑے ہوئے تھے۔ کہنے لگا "آپ کی موٹر تو چلی گئی۔ اندر آ جائیں، بیٹھ کے تھوڑی دیر انتظار کر لیں۔"

میں نے اسے اطمینان دلانے کی غرض سے کہا" وہ ابھی واپس آ جائے گا" میرا دل اندر سے دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

آخر ایک آہستہ آہستہ آتی ہوئی کار کی روشنیاں نظر آئیں۔ اضطراب کا وہ بے پایاں عالم تمام ہوا۔ دشمن اندھیرے کے چنگل سے نکل کر میں کار کے اس نرم گرم گوشے میں امیر کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ بوڑھا آدمی گیٹ پہ کھڑا بڑے تجسس سے ہماری کار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور کار ایک فراٹے کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

امیر کا بازو میری کمر میں حمائل ہو گیا۔ اس بازو کی نرم سی گرفت میں آ کر ایسا لگا کہ میں کسی محفوظ گوشے میں آ گئی ہوں۔ وہ گھبرائے لہجے میں بولا" ارے تم تو کانپ رہی ہو۔"

نادانستہ میرے لہجے میں بہت تیزی آ گئی۔" تم نے اتنی دیر کیوں کی؟"

" زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کی دیر ہوئی ہوگی۔ ریلوے کراسنگ پر رکنا پڑا۔"

ہم اب شاہراہ پر آ گئے تھے۔ سامنے سے آتی گاڑیوں کی روشنیوں سے جھجک کر میں جلدی سے نیچے جھک گئی اور سمٹ کر بالکل نیچے کھسک گئی۔

" کہاں چلنا ہے؟"

" مجھے کیا پتہ ہے، جانے کی کون سی جگہ ہے؟"

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

" پلیز لیلیٰ، پلیز، رو مت۔ اب تو ہم ساتھ ساتھ ہیں۔۔۔۔۔"

" اب تو وحشت ہونے لگی ہے۔ سخت وحشت۔۔۔۔۔ جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ اور چھپ کر۔۔۔۔۔ جیسے ہم کوئی برا کام کر رہے ہیں۔"

" لیلیٰ، میں بہت شرمندہ ہوں۔ واقعی شرمندہ ہوں۔ مجھے یہ نہیں چاہیے تھا کہ۔۔۔۔۔"

" اس میں نہ میری خطا ہے، نہ تمہاری خطا ہے۔ مگر یہ سارا قصہ کچھ بہت مکروہ سا ہو گیا ہے۔"

وہ خاموش تھا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو چپ کرایا۔

کار اب جھٹکے کھاتی اچھل اچھل کر چل رہی تھی۔ نیچے جہاں میں جھکی بیٹھی تھی وہاں سے اب سڑک کی روشنیاں بھی کم نظر آ رہی تھیں اور درختوں کی منور چوٹیاں تیزی سے گزرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ کار رک گئی۔ امیر نے ملائمت سے کہا" اٹھو، اطمینان سے بیٹھو۔"

ہم ندی کی اس سمت میں چل رہے تھے جہاں بس کچا پکا رستہ تھا۔ جھینگروں اور مینڈکوں کی گونجتی آوازوں کا ایک تار سا بندھا ہوا تھا جو کہیں ٹوٹتا نہیں تھا۔ یہ گونج دار شور بھی ندی کے سناٹے ہی کا ایک جزو تھا۔ دور چمکتی روشنیاں تاریکی کو مزید ابھار رہی تھیں۔

امیر نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ میں نے امڈتے آنسوؤں کو جیسے پی لیا اور اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"لیلیٰ! مت پوچھو کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔"

"امیر! میں بھی تمہیں بہت چاہتی ہوں۔"

اس کے بازو ایک حفاظتی حمائل بنے ہوئے تھے۔ اور اس کے ہونٹ، بس جیسے میرے ہونٹوں پر ایک نرم سی مہر لگی ہو۔ اس آن ہم یک جان تھے اور اس عالم میں ایسی کامل پاکیزگی تھی کہ دنیا دائرۂ ادراک سے باہر سرک کر کہیں تحلیل ہو گئی تھی۔

تاریک سکوت میں ایک شگاف نمودار ہوا۔ کسی کار کی روشنیاں ایک چکا چوند کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں پھر غوطہ کھا کر نیچے چلی گئی اور امیر نے تیزی سے انجن کو اسٹارٹ کیا۔ کار کے ہارن دینے میں ایک تضحیک کا سا رنگ تھا۔ وہ گرد اڑاتی برابر سے گزرتی اور پیچھے گرد کے مرغولے چھوڑ گئی۔ میں نے پھر رونا شروع کر دیا۔

امیر نے انجن کا سوئچ آف کیا اور بالوں کو تھپکنے لگا "نہیں، پلیز، یہ مت کرو۔۔۔۔۔"

"ہم کیا کریں، ایسا کیوں ہے۔ آخر کب تک؟ کیوں؟" میرے اندر ابال اٹھ رہا تھا۔

"پھر میں ان سے یہ بات کرتا ہوں۔۔۔۔۔"

"کیا بات کرو گے؟ کون سی بات ہے کرنے کے لیے؟"

"یہی کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آخر اس میں چھپانے کی کون سی بات ہے۔ ہم نے کوئی غلط کام تو کیا نہیں ہے۔"

"اس کا فائدہ کیا ہوگا۔ تم ابھی مجھ سے شادی تو کر نہیں سکتے۔ یہی تم نے کہا تھا۔ اور اس وقت تک اگر کہیں درمیان میں انہیں پتہ چل گیا تو؟ اور یہ بات ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تو پھر ان کے ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ میں ان لوگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔"

"تو ہم شادی کر لیں۔ کہیں نہ کہیں بندوبست کر لیں گے۔"

اور جب اس نے یہ بات کہہ دی تو مجھے سکون ہو گیا۔ یہ میں ناسمجھی کی بات کر رہی تھی اور اب مجھے اپنی بات پر شرمندگی ہونے لگی۔

"ہاں اور کیا۔" اس نے دکھ سے کہا "میں کوئی ملازمت ڈھونڈ لوں گا۔"

"بات اصل میں یہ ہے کہ اس روز روز کے جھوٹ سے میں سخت بیزار ہوں۔ یہ سارا قصہ بڑا گھناؤنا دکھائی دینے لگتا ہے۔ جیسے کسی پاک صاف چیز پر گندگی اچھال دی جائے۔"

امیر نے بڑھ کر میری بھیگی آنکھوں کو چوم لیا۔ "تم کتنی پاک صاف، کتنی حسین ہو، سوچ کر مجھے کتنی

حیرت ہوتی ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، مجھ ناچیز سے۔"

"تم ناچیز ہو؟ نہیں۔"

اچانک ہم نے ایک دوسرے کے مغموم چہروں کو دیکھا اور ہم نے ہنسنا شروع کر دیا۔"

پھر بہت ملائم اور اداس لہجے میں بولا" چلو اب میں تمہیں گھر پہنچا آؤں۔"

"اتنی جلدی؟" میں چلا اٹھی" ابھی تو ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا ہے۔"

"ہو گیا ہے۔" ملائمت سے بولا" میں تمہیں دیر تک روک کر کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ اتنے کے لیے بھی میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔"

"میں بھی۔۔۔۔۔ سچ، واقعی۔"

"جب میں تمہیں گیٹ پہ چھوڑ دوں تو مڑ کے مت دیکھنا ورنہ پھر میں تمہارے پیچھے پیچھے اندر آ جاؤں گا۔" وہ اب مجھے چھیڑ رہا تھا۔ ہماری جھوٹ موٹ کی ہمت و دلاوری پر جو مایوسی کھنڈ گئی تھی اسے بھی تو دور کر رہا تھا۔

"یا میں بھاگ کے تمہارے پاس آ جاؤں گی۔"

"ہم یہ بہانہ بنائیں گے کہ میں چند دنوں کے لیے گھر جا رہا ہوں۔"

اچانک اس کی آواز بھرا گئی۔ اپنے بازو میرے گرد حمائل کر دیئے جیسے اسے کسی بات کا ڈر ہو" لیلیٰ! وہ تمہیں کہیں غائب تو نہیں کر دیں گے۔ انہیں ایسا مت کرنے دینا۔ مجھے چھوڑ نا مت۔"

"میں سدا تمہارے سنگ رہوں گی۔" میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ اس وقت میں اپنے آپ کو طاقتور محسوس کر رہی تھی، اس وقت جب اسے واقعی میرے طاقتور ہونے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے میری پیشانی کو چوما۔ پھر میری آنکھوں کو" ذرا مسکراؤ تو لیلیٰ! جب تم مسکراتی ہو تو مجھے بہت پیاری لگتی ہو۔"

لیکن میں رستے بھر روتی رہی۔

چودہواں باب

بیگم وحید کے الیکشن میں ایک ہفتہ باقی تھا کہ ان کی حریف کی کنویسنگ کی غرض سے اسد لکھنؤ آن پہنچا۔

میں اپنے کمرے کے برآمدے میں سورج کی طرف پشت کئے بیٹھی بال سکھا رہی تھی۔ جاڑے دھیرے دھیرے سرکتے چلے جا رہے تھے۔ چپکے چپکے گرمی آ رہی تھی، اور ہوا میں جو ایک جان فزا کیفیت تھی وہ زائل ہو چلی تھی۔ باغ میں پھول کچھ کمھلائے کمھلائے دکھائی دے رہے تھے۔

اسد پیچھے سے ایسا چپکے چپکے آیا اور میرا نام لے کے ایسی آواز نکالی۔ بھوت پریت کی سی آواز کہ ڈر سے میری چیخ نکل گئی۔ اسے دیکھ کے دم میں دم آیا اور خوشی سے میں نے اسے خوب گلے لگایا۔ زبان پر ایک ہی کلمہ تھا ''اسد! ارے اسد! ارے یہ تو کمال ہو گیا۔ کمال ہو گیا۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے تمہیں دیکھ کے۔''

ابھی تک اس کی وہی سادھوسنت والی ادا تھی جیسے کوئی نوعمر سادھو ہو۔ ایک تو اس کا دبلا پن، پھر اس کا موٹا جھوٹا کھادی کا پہناوا، حساس چہرے کی نکلی ہوئی ستواں ہڈیاں، خوابی کیفیت والی آنکھوں کے گہرے گڑھے۔ ان سب باتوں نے مل کر اس کی سادھو والی شان کو دوبالا کر دیا تھا۔ اس وقت جب وہ سن بلوغ کو پہنچ رہا تھا اس کے سارے طور طریقے بے ڈھنگے تھے۔ اس کے مقابلے میں اب اس کی صورت شکل نکل آئی تھی۔

اسد میرے جوش و خروش کو دیکھ کر سٹپٹایا سا دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑا جھینپ گیا اور کہنے لگا ''لیلیٰ تمہیں دیکھ کے تو میں ہمیشہ ہی خوش ہوتا ہوں۔ تم چاہے جہاں بھی ہو اور جیسے بھی ہو۔''

''ارے ہم ملتے ہی کہاں ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا کہ تم یہاں سے جاتے ہی نا۔ جی چاہتا ہے کہ تم واپس آ جاؤ۔'' میں نے بے ساختہ چاؤ میں آ کر اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

''کم از کم اس خواہش کو تو پورا نہیں کیا جا سکتا۔'' وہ ہنسا۔ پھر اس کا موڈ بدل گیا۔ افسردہ لہجے میں کہنے لگا ''حیرت! بڑی حیرت ہوتی ہے۔ آخر یہ وہی گھر ہے جو برس ہا برس تک میرا گھر رہا ہے۔ گھر نہیں بدلا ہے۔ اس کے باوجود ہر چیز بدل گئی ہے۔ اب یہ دوبارہ میرے لیے گھر کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ مجھے یہاں سے گئے ہوئے کتنے سال ہوئے ہیں۔ زیادہ زمانہ تو نہیں گزرا حالانکہ لگتا یہی ہے کہ بہت زمانہ گزر گیا۔

''میرے خیال میں اس بات کو پانچ برس ہوئے ہیں۔ جب بابا جان اللہ میاں کو پیارے ہوئے

ہیں، میں اس وقت پندرہ کی تھی۔"

"اور میں انیس کا تھا۔"

"اور اب میں بیس کی ہوں اور تم تیس کے ہو۔" ارے! ہماری تو بہت عمریں ہو گئی ہیں، بوڑھے ہو گئے ہم۔"

"لیکن 1937، تو جوان ہے اور پُر ارمان ہے۔ کس تیزی سے ہر چیز بدل رہی ہے اور آگے ہی آگے جا رہی ہے۔" پھر اس نے اپنے آپ کو تھاما اور شرارت کی ہنسی ہنستے ہوئے بولا" عمر تمہیں تو بہت راس آئی ہے۔ پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو۔"

"اسد! عمر تو تمہیں بھی راس آئی ہے۔ ابھی تک تم جوگی نظر آتے ہو لیکن خوبصورت جوگی۔"

اس نے میرے ساتھ مل کر ہنسنا شروع کر دیا۔ پھر اپنی کرسی پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا "میں کوئی جوگی ووگی نہیں ہوں۔ میں سیدھا سچا آدمی ہوں۔ آخر تم کیوں ہمیشہ مجھ سے ایسا برتاؤ کرتی ہو جیسے میں آدمی نہیں، کوئی اور شے ہوں۔ تم کبھی میرے بارے میں اور میری شاعری کے بارے میں باتیں کیا کرتی تھیں، اور ایسے باتیں کرتی تھیں جیسے میں شاعر نہیں ہوں، اپنی لکھی ہوئی کوئی نظم ہوں۔ اور اب جب تم مجھے میرے کام کے بارے میں خط لکھتی ہو یا مجھ سے باتیں کرتی ہو تو بھی مجھے کچھ اسی قسم کا تاثر ملتا ہے کہ جیسے میں کوئی کارکن نہیں ہوں بلکہ کارکن کا کیا ہوا کام ہوں۔ یہ بہت تکلیف دہ بات ہے۔"

اس کی آنکھوں میں اس وقت ایک غیر معمولی چمک تھی۔ اس کی انگلیوں نے میری انگلیوں کو جکڑ لیا تھا۔ اچانک میں گھبرا گئی۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچا اور تولیے سے اپنے بال رگڑنے شروع کر دیئے، اس طرح سے کہ میرا چہرہ تولیے میں چھپ گیا۔

پھر میں کہنے لگی "اسد، فضول باتیں مت کرو۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں تمہارے کام کی قدر کرتی ہوں۔"

"میرے کام کی؟" اس نے آہستہ سے میرے لفظ دہرائے اور ہلکی سی آہ سرد کے ساتھ کرسی پر پشت ٹیک لی۔

میں نے جلدی سے موضوع بدلا "بغیر اطلاع کے چوروں سازشیوں کی طرح آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔"

"میں دوسروں سے ابھی ملنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ سو میں پچھلے دروازے سے آیا۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ خاندان والے مجھ پر کاٹھی ڈالیں، مجھے تم سے مل لینا چاہیے۔" وہ مسکرانے لگا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ باقی لوگ مہم پہ نکلے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو قائل کرتے پھر رہے ہیں کہ ہم تمہاری خدمت کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔ اسد! مجھے بالکل ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں جنم جنم سے کسی

بدبودار اندھیری کوٹھری میں مقید ہوں۔ تم دوسرے لوگوں کی طرح فوں فاں تو نہیں دکھاتے، نہ بہت پھولتے ہو۔ ارے لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ پھولے پھولے پھرتے ہیں جیسے بڑے سے غبارے میں بھاپ بھری ہوئی ہو۔"

"ان غباروں میں ذرا سوئی چبھو دیا کرو۔" اسد ہنسنے لگا۔

"یہ ایسے لوگ ہیں کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو مہر بستہ کر لیا ہے۔" پھر رک کر بولی "عجیب بات ہے کہ اس وقت میں ہنس رہی ہوں۔ ویسے تو مجھے اس بات پہ دل لگی کی سوجھتی نہیں۔ بس کھولتی رہتی ہوں۔ کبھی کبھی خوفزدہ بھی ہو جاتی ہوں۔ کیسی کیسی نفرتوں کو ہوا دی جاتی ہے۔ اگر ہر وقت فرقہ وارانہ اختلافات ہی کا پرچار ہوتا رہے تو پھر ہم مل جل کر ایک قوم کے طور پر کیونکر رہ سکتے ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ سلیم کو اس خطرے کا احساس کیوں نہیں ہے۔"

"آخر سلیم ہی کی تخصیص کیوں کی جائے۔ کم از کم وہ اپنے عقائد کے معاملے میں ایماندار تو ہے۔ بیشک مجھے اس سے اتفاق نہ ہو۔ ہاں میرے بھائی کو اس سے اتفاق ہے۔"

"لیکن سلیم نے بھی انہی سیاسی نظریوں سے اثرات قبول کئے تھے جن سے میں نے کئے تھے۔ کتنے برس تک تو وہ ایسے ملک میں رہا ہے جہاں جمہوریت اور رواداری۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس بات کا کیسے اظہار کیا جائے۔"

"جہاں تم جذباتی ہوئیں اور گڑبڑائیں۔ میں اس بات کو سمجھتا ہوں اس لیے کہ مجھے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ یورپ میں رہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر وہاں بھی ایسے نوجوان ہیں جو فسطائیت میں ایمان رکھتے ہیں۔ ویسے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ سلیم فسطائیت پرست ہے۔"

"فاشزم" "یہ" "ازم" "اور وہ" "ازم"۔ "یہ" "ایت" "اور وہ" "ایت" "یہ سب نظریوں کا کھیل ہے۔ ہم ان کے بارے میں پڑھ چھوڑتے ہیں، ان پر بحثیں کرتے ہیں۔ میں پولیٹیکل سائنس کے مطالعے کی بہت قائل تھی، لیکن اس کا حاصل کیا ہے۔ جو لوگ اقتدار میں ہیں یا اقتدار میں آنے کی امید میں جی رہے ہیں انہیں جب میں باتیں کرتے دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ میں نے کچھ پڑھا لکھا نہ ہوتا تو اچھی رہتی۔ بیگم وحید نے، ولی الدین صاحب نے یا اگروال جی نے کبھی کسی سیاسی یا اقتصادی نظریئے کے بارے میں کوئی کتاب پڑھی ہے؟ نہ سہی اس حوالے سے، ویسے کبھی کوئی کتاب پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہے؟" میں بس ابل پڑی۔

"لیکن وہ کم از کم جمہوریت کی بات تو کرتے ہیں۔ انہیں ووٹ مانگنے کے لیے عوام کے پاس جانا پڑتا ہے۔ ان سے بات کرنی پڑتی ہے۔ حامد چچا اور ان کے دوست لوگوں کے پاس کتنی مرتبہ گئے، کتنی مرتبہ بات کی؟ ان حضرات نے یہ کام کم از کم ان سے زیادہ کیا ہے۔ یہ خود آگے کی طرف ایک قدم ہے۔"

"سب بکواس۔ یہ لوگ محض نعرہ بازی کرتے ہیں اور ہمارے سفلی جذبات کو اپیل کرتے ہیں۔

ہمارے تعصب اور کٹر پن کو، اس خوف کو جو ہمارے اندر پل رہا ہے۔''
اسد مسکرایا اور بڑے سکون سے کہنے لگا ''تمہارے پاس جو اپنی ایک نظر ہے اسے تو کوتاہی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے ملک میں نئی اور خیال انگیز باتیں بھی بہت سی ہو رہی ہیں۔''
''میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ اس سارے جھگڑے نپٹنے سے جان چھڑا کے کہیں بھاگ جاؤں۔''
''لیکن اپنے خیالات سے، اور جو کچھ تم ہو اُس سے بھاگ کے کہاں جاؤ گی۔''
''پھر میں کیا کروں۔'' میں نے تڑپ کر سوال کیا۔
''بس کچھ کرو، کوئی بھی کام ورنہ بے چین ہی رہو گی اور تمہارا دماغ مختل رہے گا۔''
''کچھ کرو، تمہارے لیے یہ کہنا کتنا آسان ہے۔ میں کر کیا سکتی ہوں۔'' میں غصے سے بولنے لگی ''میرے جو حالات ہیں ان میں بھلا میں کیا کر سکتی ہوں۔''
''لیلیٰ معاف کرنا۔ میں کوئی وعظ نہیں دے رہا ہوں۔ ایسی میری کوئی نیت نہیں ہے۔ میں نے تو بس جو میں سمجھتا ہوں وہ کہہ دیا۔''
''سوری اسد'' میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا ''میرا خیال ہے کہ مجھے اندر ہی اندر اپنے آپ پر جو غصہ آتا رہتا ہے اس غصے کو نکال رہی تھی اور تمہارے تحمل سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔''
''یاد رہے کہ میں گوشت پوست کا آدمی ہوں۔ کوئی مجرد شے نہیں ہوں۔'' وہ اُنسیت بھرے انداز میں مسکرایا۔
میں جھینپ گئی۔ کہنے لگی ''جب کبھی دوسروں کی پابندی سے نجات ملے گی اور اپنی زندگی بسر کرنے کا موقع میسر آئے گا تو اس وقت میں جیسا چاہتی ہوں ویسی زندگی گزارنے کی کوشش کروں گی۔''
اب ایک خاموشی چھا گئی کہ ہم دونوں اپنی اپنی دنیا میں چلے گئے، ہماری اپنی تمناؤں اور پچھتاوؤں کی دنیا۔ پھر اسد کسی قدر جھجکتے ہوئے بولا ''یہاں آنے سے پہلے چند ایک دن میں نے امیر کے ساتھ گزارے۔''
میرے اعصاب کھنچنے لگے۔ ایک خواہش نے مجھے آن دبوچا کہ اسد سے امیر کے متعلق ساری بات کہہ دی جائے۔ آپ ہی آپ میری نظریں اسد کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اسے سب کچھ معلوم ہے۔
''اس نے۔۔۔۔۔ امیر نے۔۔۔۔۔ کچھ کہا تھا؟'' میری زبان لڑکھڑا گئی۔
''نہیں۔'' اسد نے سکون سے کہا ''نہیں۔ آدمی مشترکہ دوستوں کے بارے میں جتنی بات کرتا ہے اس سے زیادہ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے اور یہ بات عجب سی لگے لیکن یہ واقعہ ہے کہ کوئی مجھے تمہارے متعلق کچھ بتاتا نہیں۔ بس مجھے خود ہی احساس ہو جاتا ہے اور میں سب کچھ جان لیتا ہوں۔''

میں اس بات پہ بہت پریشان ہوئی۔ اندر ہی اندر ایک کوشش سی تھی کہ میرے بارے میں اسد کے جو واقعی محسوسات ہیں ان کا مجھے پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ اس کے ساتھ میں جس قسم کا تعلق رکھنا چاہتی تھی وہ اب خطرے میں نظر آ رہا تھا اور میں اس پر بہت ناخوش تھی۔

''اسد! میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ دل کی ساری بات تم سے کہنا چاہتی تھی۔ اور تو کوئی ہے نہیں جس سے میں اپنے دل کی بات کروں۔ تم میرے اتنے اچھے دوست ہو۔''

اسد کی آنکھوں میں ایک پرچھائیں سی لرزتی دکھائی دی۔ ہچکچاتے ہوئے بولا ''تمہیں پورا یقین ہے نا اس کے بارے میں۔ امیر کے بارے میں؟''

''بالکل۔ یہ تم پوچھ کیوں رہے ہو؟''

''یہ تو میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی بات سے کوئی تکلیف پہنچے۔ تم تو ذرا سی بات پہ دکھی ہو جاتی ہو۔''

''مجھے کیوں تکلیف پہنچے گی۔ کیوں آخر سوائے اس کے کہ امیر۔۔۔۔۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا'' وہ جلدی سے بولا ''میرا مطلب یہ تھا، میرا مطلب تھا کہ اس میں جو مشکلات ہیں۔ دوسرے لوگ۔۔۔۔۔''

''دوسرے لوگوں کا اس میں کیا دخل ہے۔''

''اگر تم نے اس کے بارے میں اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے تو۔۔۔۔۔'' اس کی آواز رینگتی رینگتی خاموشی میں تحلیل ہو گئی۔

''دوسرے لوگ؟'' میرے تصور میں ان لوگوں کی شکلیں بننے ابھرنے لگیں۔ کتنے لوگ بیچ میں کود پڑتے ہیں اور دوسرے کی زندگی میں دخل دے کر اپنی طرف سے شرطیں عائد کرنے لگتے ہیں۔ یہاں سے ''دوسرے لوگ'' حامد چچا تھے اور سائرہ چچی۔ ان کی ناپسندیدگی کی غماز بے مہر نظریں، جلے کٹے فقرے۔ وقت آنے دو، میں ان سب کا مقابلہ کروں گی۔ وہ وقت کب آئے گا، انتظار کے دن کب ختم ہوں گے۔۔۔۔ کب تک؟

پندرہواں باب

جس چھوٹے سے سٹیشن پر جا کر میں اُتری وہاں سے عابدہ پھپھی کا گاؤں پانچ میل دور تھا۔ اور وہ گاڑی الٹی توبہ! سارے رستے کچھوے کی چال چلی ہے۔ رستے بھر چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں پر رکتی رہی۔ بیس میل کا فاصلہ اس نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔ گاڑی ہر سٹیشن پر بہت سے چیخ پکار کرتے، گونگوں والے اشاروں سے کام لیتے، بدحواس کسانوں کو ان کے بیوی بچوں کو اور گٹھریوں پوٹلیوں کو انڈیل دیتی، اور ہر سٹیشن پر ان سے بھی بڑھ کر بدحواس چیخ پکار کرتے، گونگوں والے اشارے سے کام لیتے کسانوں کو ان کے بیوی بچوں کو اور گٹھریوں پر پوٹلیوں کو سمیٹ لیتی۔ سٹیشن کی گھنٹی کی ٹن ٹن، گارڈ کی سیٹی کی مضطرب آواز اور انجن کی چیخ سن کر یہ لوگ ایسے بھاگتے دوڑتے نظر آتے جیسے ڈر کر مویشی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ جو کمپارٹمنٹ پہلے دکھائی دیتا اس کی طرف لپکتے۔ اسے ٹھسا ٹھس بھرا دیکھ کر دوسرے کمپارٹمنٹ کی طرف دوڑتے۔ بس اس ٹوہ میں ہوتے کہ کسی بھی کمپارٹمنٹ میں گھسنے اور ٹھنس ٹھنسا کر بیٹھنے کی جگہ مل جائے۔

ہر سٹیشن کے ہر گرد آلود پلیٹ فارم پر جہاں ہوا کے جھکڑوں سے جھاڑو دی ہوتی، مرد عورتیں بچے پسرے دکھائی دیتے۔ ان کے آس پاس گٹھڑ، بستر بوریا، کاٹھ کباڑ بے ترتیبی سے پڑا نظر آتا۔ وہیں لیٹے بیٹھے ہیں، سو جاگ رہے ہیں، کھا پی رہے ہیں اور گاڑیوں کو آتا جاتا دیکھ رہے ہیں۔ لگتا کہ جنم جنم سے یہ اس گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں جو کبھی نہیں آئے گی اور اس سفر کے لیے تیار بیٹھے ہیں جس کے آغاز کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

جو ملازم میرے ساتھ بھیجا گیا تھا وہ ہر سٹیشن پر اتر کر میرے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑا ہو جاتا، اپنی وردی اور کلغی والے پگڑ کے رعب داب کے ساتھ۔ اُن گنواروں کو، جو فرسٹ اور سیکنڈ کلاس والوں کے ملازموں کے کمپارٹمنٹوں کی طرف لپکتے نظر آتے، آگے ہنکا دیتا۔ میرے کمپارٹمنٹ میں کسی نے قدم نہیں رکھا۔ سو میری خلوت میں خلل نہیں پڑا۔ میں اطمینان سے بیٹھی باہر کا نظارہ کرتی رہی۔ کھیت، کھلیان، درخت، ڈھوک، ڈیرے نمودار ہوتے، قریب آتے جاتے، پھر گزر جاتے اور ایک دائرہ سا بناتے ہوئے نظروں سے دور ہوتے چلے جاتے۔ ادھر میرے خوابوں اور پٹری پر دوڑتے پہیوں کی ڈگا ڈگ کے بیچ ایک آہنگ قائم ہو گیا تھا۔

عابدہ پھپھی کے میاں سٹیشن پر کھڑے میری راہ تک رہے تھے۔ انہوں نے اب داڑھی اس شان سے بڑھائی تھی کہ اس کی نوک نکلی ہوئی تھی اور نفاست سے ترشے ہوئے سفید بالوں نے ان کے چہرے کے خدوخال کو ایک وقار بخش دیا تھا۔ انہوں نے بنچے تلے جملوں میں خوش آمدید کہا، وعا دی، حامد چچا کی اور سب اہلِ خاندان کی خیر و عافیت رسمی آداب کے ساتھ دریافت کی۔ پھر باقی رستے خاموش رہے۔ ہماری دقیانوسی کار دھول میں اٹی اس سڑک پر، جس پر پہیوں کے گہرے گہرے نشان نظر آ رہے تھے، کھڑ کھڑ کرتی دوڑتی رہی۔

یہ معزز بزرگ اپنی وضع قطع، اپنے طور طریقوں سے پرانی طرز کے آدمی نظر آ رہے تھے۔ انہیں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اور سٹیرنگ گھماتے دیکھ کر ایک انمل بے جوڑ پن کا احساس ہوتا تھا۔ وہ تو بگھی چلاتے زیادہ اچھے لگتے یا تخ تخ کرتے کسی پھسڈی گھوڑے پر سوار ہوتے تو وہاں سجتے۔ اور میں بھی کھلی کار میں ان کے برابر بیٹھی کون سی سج رہی تھی۔ مجھے تو برقعے میں لپٹ لپٹا کر کسی پالکی یا ڈولی میں جس کے چاروں طرف پردے تنے ہوتے ہیں، بیٹھا ہونا چاہیے تھا۔ یہاں تو اب بھی بہت سی عورتیں اسی سواری میں بیٹھ کر سٹیشن سے اپنے گاؤں کا اور گاؤں سے سٹیشن تک کا سفر کرتی تھیں۔

میرا ذہن اپنے سفر پر گامزن تھا۔ ہماری زندگیوں کی بھاگتی دوڑتی صدیاں تھیں۔ انہی کے بیچ وہ بھی اپنا سفر کر رہا تھا۔ اردگرد وہی جانا پہچانا منظر، کھیت، درختوں کے جھنڈ، دھول مٹی اور گوبر، مفلسی کا نقشہ اور اسی کے ساتھ امن وسکون کی ایک فضا، وہی زندگی کے سارے وہی نقشے جو ابدالآباد سے اسی طرح چلے آ رہے ہیں۔ اس سارے منظر کو دیکھ کر میرے اندر نوسٹلجیا کی ایک لہر اٹھی۔ مجھے حسن پور کے نوسٹلجیا نے آ لیا۔ اس نوسٹلجیا نے بڑھتے بڑھتے ایک بے پناہ خواہش کی شکل اختیار کر لی۔ یہ کہ عابدہ پھپھی ہوں اور ان کے کولہے سے لگی میں بیٹھی ہوں۔ اس حقیقت نے جلدی ہی حقیقت کا روپ دھار لیا۔ میں گھر پہنچی اور انہوں نے بڑھ کر کس چاؤ سے گلے لگایا۔ عابدہ پھپھی کے پیچھے حکیمن بوا کھڑی تھیں۔ انہوں نے کس طرح تڑپ کر مجھے چھاتی سے لپٹایا کہ ساتھ میں ان کی بوڑھی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔ میرے سر اور چہرے پہ ایسے ہاتھ پھیر پھیر کر بلائیں لیں کہ ان کی انگلیاں چٹ چٹ بول رہی تھیں۔ اور ساتھ میں دعاؤں کی بوچھار کر دی۔''

عابدہ پھپھی کے پیچھے پیچھے میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی۔ زینہ بہت تنگ تھا اور سیڑھیاں سیدھی چلی گئی تھیں۔ عابدہ پھپھی اوپر ہی کی منزل میں رہتی تھیں۔ وہیں مجھے ٹھہرنا تھا۔ ان کے کمرے سادہ وصاف ستھرے تھے۔ بس یہاں آرائش کی ایک ہی چیز نظر آ رہی تھی۔ بھوری پتی ہوئی دیواروں پر قرآنی آیات خوبصورت خطاطی کی صورت نظر آ رہی تھیں۔ کتابوں سے بھری ایک الماری سے اوپر ان کے ابا جان یعنی ہمارے بابا جان کا فوٹو آویزاں تھا۔ آہنی سلاخوں والی کھڑکیوں میں سے کھیت اور درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے جو افق تک پھیلے ہوئے لگتے تھے۔

عابدہ پھپھی کے کمرے میں جا کر پھپھی اور میں دونوں تخت پہ بیٹھ گئے۔ حکیمن بوا پھسکڑا مار کر فرش پر

بیٹھ گئیں۔ ان کی آنکھیں مجھ پہ اس طرح جمی ہوئی تھیں جیسے ان کی ساری جمع پونجی ان کے سامنے ڈھیر کی صورت رکھی ہے۔

ہم ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے سارا بیتا زمانہ ہمارے سامنے بکھرا پڑا ہے۔ خاندان کی باتیں ہوتی رہیں۔ عزیزوں رشتہ داروں کا ذکر چل نکلا۔ اُن کا جو لکھنؤ میں ہیں اور اُن کا بھی جو پردیس چلے گئے ہیں۔ ایک ایک کر کے ان سب کا ذکر ہوا جن کا اس گھر سے، جس پر کبھی باباجان کی حکمرانی تھی، تعلق رہا تھا۔ اس وقت بالکل خیال نہیں آیا، بعد میں خیال آیا کہ میں نے عابدہ پھپھی کے بارے میں تو کوئی بات ہی نہیں کی۔ یوں اس وقت ان کا سونتا ہوا پیلا پھدق چہرہ خوشی اور محبت کے جذبات سے دمک اٹھا تھا۔ مگر اس خوشی اور محبت سے پیدا ہونے والی چمک کے پیچھے مجھے ایک اداسی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی، جیسے اداسی کا یہاں مستقل ڈیرا ہو۔ لیکن میں تو خود غرض بنی ہوئی تھی۔ ہر سوال کا یہاں ایک ہی جواب تھا کہ محبت کرو اور محبت کرواؤ۔

دوپہر کے کھانے کا وقت کچھ بہت ہی جلدی آ گیا۔ ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے گئے اور اس کے ساتھ اپنی نجی دنیا سے باہر نکل آئے۔

یہ گھر بہت سیدھے سادے انداز کا بنا ہوا تھا۔ بیچ میں ایک چوکور آنگن تھا۔ اس کے چاروں طرف عمارت تھی۔

برآمدے میں ایک بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا۔ اسی پہ دسترخوان بچھایا گیا تھا۔ عابدہ پھپھی کے میاں اور گھر کے دوسرے افراد پہلے ہی دسترخوان کے گرداگرد آئے بیٹھے تھے۔ وہ تو آج میری خاطر زنان خانے میں آ کر کھانا کھا رہے تھے۔ آخر میں مہمان تھی اور پہلی مرتبہ اس گھر میں آئی تھی۔ اس کے بعد ان کا وہی پرانا دستور رہا کہ باہر مردانے میں دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ میں نے دیکھا کہ عابدہ پھپھی تخت کے ایک کنارے پہ بیٹھی ہیں اور دور دوسرے کنارے پر ان کے میاں بیٹھے ہیں۔ والدہ کے ہوتے ہوئے دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش ہیں۔ یوں نظر آ رہا تھا کہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ یہ دو اکائیاں ہیں۔ میرے تصور میں یہ بات نہیں آ پا رہی تھی کہ یہ دو اکائیاں کبھی یکجا بھی ہوتی ہوں گی۔ اور میں نے حیران ہو کر سوچا کہ جس انداز سے میں شادی کا خواب دیکھتی ہوں کیا پھپھی جان نے بھی اس انداز سے شادی کا خواب دیکھا ہوگا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں عورتوں اور لڑکیوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہوں۔ میں ان کی طرف دیکھ بھی نہ رہی ہوں تب بھی ان کی نظریں مجھ ہی پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ ان کا تجسس کسی رکھ رکھاؤ، کسی حجاب کا قائل نظر نہیں آتا تھا۔ ویسے میں ان سب سے خاندان کی مختلف تقریبوں میں کسی نہ کسی موقع پر مل چکی تھی۔ اعجاز بھیا کی والدہ کا حال یہ تھا کہ سوکھی چمرخ، آنکھیں اور کان کم و بیش جواب دے چکے تھے۔ اور ان بڑی بی کی بیوہ بہن موٹی تھل تھل، دمے کی مریضہ۔ بھیا کی جو

سب سے بڑی بیٹی تھیں وہ بیوہ تھیں۔ سخت ترش رو۔ منہ میں یہ لمبی گز بھر کی زبان۔ ان کی بٹیا بیچاری تلخ مزاج ماں سے دب کر رہ گئی تھی۔ عمر میں مجھ سے چھوٹی تھی مگر دیکھنے میں بڑی لگتی تھی۔ کچھ دبی ہوئی ہونے کی وجہ سے بھی اس پر عمر برسنے لگی تھی۔ سوکھی نچڑی، رنگ و آب سے محروم عورتیں، ڈھل ڈھل کپڑے پہنے ہوئے، لمبے دوپٹوں میں لپٹی لپٹائی، لگتا تھا کہ زندگی کا سوگ منا رہی ہیں۔

ہاتھ دھونے کے بعد میں تخت کی طرف بڑھی جہاں سب آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں۔ اعجاز پھپھا کی صاحبزادی اپنی کڑوی کسیلی آواز میں بولیں "ارے تم یاں کیسے بیٹھوگی۔ تم تو میز کرسیوں پہ بیٹھنے والی ہو۔"

عابدہ پھپھی نے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ نرم لہجے میں بولیں "لیلیٰ تم ہمیشہ میرے پاس آ کے بیٹھا کرتی تھیں۔ تو آؤ، میرے پاس آ کے بیٹھو۔"

میں نے بھانپ لیا کہ رشتوں کے حساب سے ظاہری رکھ رکھاؤ اپنی جگہ مگر اس ظاہری رکھ رکھاؤ کے پیچھے بہت کٹا چھنی چل رہی ہے۔

اعجاز پھپھا مجھ سے حامد چچا کے الیکشن کی تیاریوں کا حال احوال پوچھنے لگے۔ بڑی بی کے کان میں حامد چچا کا نام پڑا تو اونچی آواز میں بولیں "لیلیٰ کی تو اب اللہ رکھو شادی بیاہ والی عمر ہوگی۔ حامد میاں ہی کے کسی بیٹے سے اس کا بیاہ ہوگا۔ دوسرے بیٹے سے زہرا کا بیاہ ہو جائے گا۔"

ان کی بیٹی انہیں بتانے لگی کہ زہرا کا بیاہ تو ہو بھی چکا۔ اس پر وہ کڑکڑانے لگیں "اے لو، ذرا سوچو تو سہی، خاندان میں لائق لڑکے بیٹھے ہیں اور بیٹی کو غیروں میں بیاہ دیا۔"

اعجاز پھپھا سے رہا نہ گیا۔ تڑپ کر بولے "خاندان کے لڑکے نالائق بھی تو ہوتے ہیں۔"

ان کی صاحبزادی نے بحث میں اپنی ٹانگ اڑائی، بولی "باہر والوں کا کچھ پتہ تو نہیں ہوتا کہ کیسے نکلیں۔" اور عابدہ پھپھی کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں کینہ صاف جھلک رہا تھا۔

اس پر باپ بیٹی میں بحث ہونے لگی۔ فوراً ہی ایسی تیز م تیزی ہوئی کہ اعجاز پھپھا غصے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بیٹی کو روتا دھوتا چھوڑ باہر چلے گئے۔ بڑی بی دہائی دینے لگیں کہ بے آسرا بچی کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ اب عابدہ پھپھی ہیں کہ ایک ایک کو سمجھا بجھا رہی ہیں، چپ کرانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ان صاحبزادی کی بٹیا کا رشتہ اس کے چچا کے بیٹے سے ہونے لگا تھا، لیکن اعجاز پھپھا اس رشتے کے خلاف تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ لڑکا بے پڑھا لکھا ہے۔ گھر کی بیبیوں نے اس کا الزام عابدہ پھپھی کو دیا۔ اشاروں اشاروں میں ایسی باتیں کرتیں جن کا مطلب یہ نکلتا کہ عابدہ پھپھی نے اس گھر میں آ کر اعجاز پھپھا کو ان کے خاندان والوں سے چھڑا دیا۔

بعد کے دنوں میں رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہوا کہ عابدہ پھپھی سے یہاں سب کو کتنا بیر ہے۔ اس گھر میں ایک ایسے کردار کا اضافہ ہوا تھا جو اس گھر والوں کی فہم سے بالاتر تھا۔ یہ بات بھلا انہیں کیسے اچھی لگتی۔ جو

شخصیت ان کی سمجھ سے بالاتر تھی اس پر وہ چھچھوری حرکتیں کر کے حملہ آور ہوتے تھے۔

اس گھر کی عورتوں میں محرومیوں، رقابتوں اور رشک وحسد کا جال کچھ اس انداز سے پھیلا ہوا تھا جیسے اَن دیکھی مکڑیوں نے ایسا جال پور دیا ہو کہ آنکھوں کو نظر نہیں آتا۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت بھی تھی کہ ایک دوسرے کے بغیر ان کے وجود کے کوئی معنی ہی نہیں تھے۔ جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے ان کے جینے کا طور کچھ ایسا تھا کہ سب ایک دوسرے کو روندتے رہتے تھے۔

میں یہ امید لے کر آئی تھی کہ مجھے یہاں امن وسکون کی فضا میسر آئے گی۔ میری ایسی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر زیادہ تکلیف ہوئی کہ عابدہ پھپھی نے اپنی اس زندگی کو قبول کر لیا ہے اور چپ سادھ لی ہے۔

لیکن جب ہم دونوں اکٹھے ہوتے تو بہت سکون کی فضا ہوتی۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ اپنی نکھری ہوئی پرسکون آواز میں وہ شاعری پڑھ کر سناتیں جس کا انہوں نے مجھ میں ذوق پیدا کیا تھا۔ جب وہ میرے سنگ ہوتیں تو مجھے ان کے یہاں ایک خاموش طاقت کا احساس ہوتا اور خدا کی ذات میں ان کے ایمان کا۔ یہی ایمان تو ان کی طاقت کا سرچشمہ تھا۔ لیکن یہ میری خواہش ہی رہی کہ کبھی میں انہیں ایسا دیکھوں کہ ان کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیں نظر نہ آئے۔ وہ عجب سی کیفیت جیسے ان کی نظریں کہیں دور غم کی گھٹا امنڈتی دیکھ رہی ہیں۔

ہاں، جب میرے جانے کا وقت قریب آ گیا تو پھر ان کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ مجھے سینے سے چمٹا کر کیسا پھوٹ پھوٹ کر روئی ہیں۔ اس کے بعد تو میرا ان سے اتنا قرب ہو گیا کہ جی چاہا کہ اپنے سارے راز ان کے سامنے اگل دوں۔ اپنے خواب، اپنے وسوسے اور اندیشے، امیر کے متعلق ساری باتیں۔ لیکن اس کو کیا کرتی کہ روایت نے جو ایک فاصلہ قائم کر رکھا تھا وہ انتہائی قُرب کے لمحوں میں بھی جوں کا توں رہا۔

میں نے کہا کہ اب جب میں پھر انہی لوگوں میں جا رہی ہوں تو میں بہت مغموم ہوں۔ اس پر وہ بولیں: "میں تم سے ایسی بات کی توقع نہیں رکھتی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے آپ میں طاقت پیدا کرو اور فرض شناس بنو۔"

کون سا فرض؟ کس کی طرف سے مجھ پر فرض عائد ہوتا ہے؟ جو بات میں صحیح سمجھتی ہوں، ایک فرض تو اس طرف سے عائد ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کی فرماں برداری کی مجھ سے توقع رکھی جاتی ہے۔ یہ بات میں کہنا چاہتی تھی، کہہ نہیں پائی۔

"تمہارے بڑے تمہارے بہی خواہ ہیں۔ وہی نیک و بد سمجھانے والے ہیں۔ ہمیں ان کا ادب کرنا چاہیے، ان کی فرماں برداری کرنی چاہیے۔"

"لیکن کتنی ایسی باتیں ہیں کہ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔ چیزیں تو بدلتی رہتی ہیں۔ بابا جان

چیزوں کو جس طرح دیکھتے سمجھتے تھے حامد چچا کا انداز نظر اس سے مختلف تھا۔ اور اب ہماری نسل کے لیے چیزوں کے معنی پہلے کے مقابلے میں بالکل بدل گئے ہیں۔"

"کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی نہیں بدلتیں۔ اپنے بڑوں کا کہنا مانو، انہیں کبھی تکلیف مت پہنچاؤ۔"

"لیکن وہ مجھے کیوں تکلیف پہنچاتے ہیں؟"

"تم یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہاری ذات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تم دوسروں کی خدمت بجالا کر ہی اپنا فرض پورا کر سکتی ہو۔"

"لیکن عابدہ پھپھی، یہ فرض ہمیشہ دکھ ہی کے واسطے سے کیوں پورا ہوتا ہے۔"

"دکھ اور سکھ، خوشی اور غم، یہ تو تمہارے اندر ہوتے ہیں۔ تم خوشی کا مطالبہ نہیں کر سکتیں، اور غم کو قبول کرنا تمہیں آنا چاہیے۔"

وہ مجھے رخصت کرنے لکڑی والے دروازے تک آئیں۔ یہ دروازہ باہر کی طرف نکلتا تھا۔ باقی دوسری بیبیاں بھی اس وقت موجود تھیں۔

اور جب انہوں نے کہا کہ "تمہیں اللہ کی حفظ و امان میں دیا" تو ان کی آنکھ ذرا بھی نہیں بھیگی تھی اور آواز پُرسکون تھی۔

حکیمن بوا اور میں، دونوں بلک بلک کر روئے۔

ææææææ

سولہواں باب

میری واپسی کے تھوڑے ہی دنوں بعد نندی بیچاری پہ پھر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ اس کا باپ اور اس کا میاں دونوں یہ کہتے تھے کہ غلام علی ہمارے گیٹ کے آس پاس مستقل منڈلاتا رہتا ہے۔ دھمکیاں دے رہا ہے کہ نندی نے میری عزت خاک میں ملا دی ہے۔ میں اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ اس کی ناک کاٹ ڈالوں گا۔

ان دونوں کی باتوں پر کسی نے کان نہیں دھرا۔ غلام علی تو بہت مہذب بنتا تھا۔ نرم شائستہ لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس کی ذات سے ایسی غیر مہذب حرکت منسوب کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ اور نوکروں چاکروں کو تو ڈراما چاہیے۔ وہ اس بات کے مزے لیتے تھے۔

خود نندی ان دھمکیوں سے بالکل نہیں ڈری۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اکیلی اب کہیں نہیں جاتی تھی۔ انگلیاں چٹخاتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی ''میں بھلا اس کی گیدڑ بھبکیوں میں آنے والی ہوں۔ اگر کہیں کوئی تگڑا جوان میرا خصم ہوتا تو میں غلام علی کو ان دھمکیوں کا ایسا مزہ چکھاتی کہ اسے خصی بنا دیتی۔ اب کبھی کبھی خیال آتا کہ میں نے اس جلتے کانپتے بڈھے کو قبول کیوں کیا۔''

نندی بڑے مبتذل لہجے میں بات کرتی تھی۔ اس کے حسن میں بھی ایک ابتذال کا رنگ تھا۔ یہ دیکھ کے مجھے بہت افسوس ہوتا تھا۔ اس کی اچھی تربیت ہونی چاہیے تھی۔

''اری نندی، تو پھر کسی کے ساتھ بھاگنے کی تو نہیں سوچ رہی۔'' میں اسے چھیڑنے لگی۔

''بٹیا'' اس نے جلے کٹے لہجے میں کہا ''کوئی مرد وا ہے اس جوگا کہ میں اس کے ساتھ بھاگوں۔'' پھر بولی ''بس اب تو ایک ہی حسرت رہ گئی ہے کہ میرے کوئی بچہ ہو گیا ہوتا۔ میں مر جاؤں گی تو مجھے کون کس بہانے یاد کرے گا۔ میں ایسے جاؤں گی۔'' یہ کہتے کہتے اس نے ہوا میں پھونک ماری۔

''ارے تیرا اگلا جنم بھی تو ہوگا۔ یا تو اگلے جنم کو نہیں مانتی۔''

''مانتی ہوں، بٹیا، پر دوبارہ جنم لے لیا تو اس سے ہوگا کیا۔ فرض کرو کہ آج میں مر جاتی ہوں اور اگلے دن میں چڑیا کا جنم لے کے آ جاتی ہوں۔ یہ جو ایک اُلو کی دُم چڑیا روز آ کے تمہارے آئینے پہ چونچیں مارتی ہے، ویسی ہی میں بھی بن جاؤں گی۔ بھلا تم مجھے پہچانو گی؟ میں تو پھر چڑیا ہو جاؤں گی، نندی تھوڑا ہی

رہوں گی۔ نندی تو مر کھپ چکی ہوگی۔ میں نے جب اس بڈھے سے بیاہ کیا تھا تو دنیا پہ مجھے بہت غصہ آتا تھا۔ پر میں سلیمن بننا نہیں چاہتی تھی۔"

پھر اسے غلام علی کا خیال آ گیا۔ اس نے اس کا بہت مذاق اڑایا اور بہت گالی کوسنے دیئے۔

لیکن غلام علی بھی انتقام لے کے مانا۔ اور یہ بھی نہیں کہ اکیلے دکیلے میں واردات کی ہو، واردات اس نے بھرے مجمع میں کی۔

سڑک پہ کوئی کھیل تماشے والا جلوس جا رہا تھا۔ نندی اسے دیکھنے نکل گئی۔ شہر میں ایک سرکس آیا ہوا تھا۔ بینڈ باجے کے ساتھ اس کا اعلان ہو رہا تھا۔ ایک اودھم کے ساتھ سنکھ نفیریاں پھونکی جا رہی تھیں، جھانجھ بج رہے تھے۔ ڈھول پیٹے جا رہے تھے۔ تانگوں اور اکوں پر بڑے بڑے بورڈ لدے جا رہے تھے جن پر لگے پوسٹروں پر ایکٹروں کی تصویریں بنی تھیں، رنگین مناظر دکھائے گئے تھے۔ ان کے آگے آگے مسخرے چل رہے تھے جو نقلیں کر رہے تھے، قلابازیاں کھا رہے تھے۔ پیچھے ایک اونگھتا مرجھلا ہاتھی چل رہا تھا۔ اس پہ بیٹھا ایک آدمی میگافون پہ اپنی موٹی بھاری آواز میں پکار پکار کے کہہ رہا تھا "آ گیا، آ گیا شہر میں سب سے کمال کا شو۔"

سینما کو چھوڑ کر باقی اور کوئی شو شہر میں نہیں ہو رہا تھا۔

ہاتھی پہ بیٹھا آدمی اشتہار بکھیرتا جا رہا تھا۔ لونڈے لپاڑے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے اور اشتہاروں کو لپکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گلیوں کے کتے بھونکتے ہوئے پیچھا کر رہے تھے۔ اتنا اودھم مچا ہوا تھا اور وہ رنگ برنگا سماں تھا کہ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔

اور نندی گیٹ کے سامنے کھڑی ہنس رہی تھی کہ غلام علی نے اس پر ہلہ بول دیا۔ چاقو چہرے پر ترچھا پڑا۔ وہاں سے کاٹتا ہوا نیچے گیا اور اس کے پچھلے بازو پہ گھاؤ ڈال دیا۔ بہر حال چہرے پر ایسا گھاؤ لگا کہ اس کے چہرے کی چمک دمک داغی ہو گئی۔ رخسار سے ٹھوڑی تک داغ پڑ گیا۔

ہجوم نے مشتعل ہو کر اسے دبوچ لیا۔ اس کا اس وقت ایسا حال تھا کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ بال بکھرے ہوئے، کپڑے پھٹے ہوئے۔ یہ وہی شخص تھا جو بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھائے ہماری نقرئی اور بلوریں ظروف سے آراستہ میز پر سلیقے سے بیرے کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔

سترہواں باب

حامد چچا کے الیکشن کا دن آخر کو آ پہنچا۔ دھوپ چمکی ہوئی تھی اور ہوا تیز چل رہی تھی۔ درختوں سے پتے جھڑ رہے تھے، نرم گرم ہوا کے جھکڑوں میں پتے گرد مٹی کے ساتھ گھومتے چکر کھاتے اڑتے چلے جاتے اور کچھ اس انداز سے سمٹتے کہ لگتا سڑک پر جھاڑو دی گئی ہے۔ ان جھکڑوں نے گرمیوں کو دھکیل کر ہمارے سر پہ لا کھڑا کیا تھا۔ سمجھو کہ گرمیاں دہلیز پہ آن پہنچی تھیں۔

کمال کے آ جانے سے جو پچھ ہو رہا تھا اسے سہارنے کی ہمت پیدا ہوگئی۔ وہ پچھلی شام اچانک آن پہنچا تھا۔ مذاق کرنے لگا کہ بڑے میاں کو حوصلہ دینے کے لیے آ گیا ہوں۔ مگر مجھ سے اس نے یہ کہا کہ "مجھے احساس ہوا کہ اس موقعہ پر ان کے قریب رہنے کی ضرورت ہے۔ ہم ایک دوسرے سے بہت الگ تھلگ ہو گئے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ مجھے اپنے نزدیک دیکھ کر وہ خوش ہوں گے۔"

سلیم زوروں میں تھا۔ اپنے آپ کو وہ سیاسی چالوں کا بہت ماہر جانتا تھا۔ ساتھ میں سیاسی تجزیوں کا بہت شوق تھا۔ ذرا چھیڑ دو اور فوراً ایک لمبا چوڑا تجزیہ۔ یہ شوق پورا کرنے کا کیسا زریں موقع ہاتھ آیا تھا۔ وہ کمال کو بڑے فاتحانہ انداز میں بیگم وحید کے الیکشن کا احوال سنانے لگا جیسے کامیابی بیگم وحید کو نہیں، موصوف کو حاصل ہوئی تھی۔

"دوبارہ گنتی میں ہم تھوڑے ووٹوں سے جیت گئے۔ اس سے ہماری اصل طاقت کا تو کوئی پتہ نہیں چلتا، البتہ یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ عوام کے یہاں سیاسی شعور کا کتنا فقدان ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی وہ جمہوریت کے لائق نہیں ہوئے ہیں۔"

کمال نے آہستگی سے جواب دیا "انہیں جمہوریت کو برتنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ یاد دیا گیا ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت کوئی مجرد خیال تو ہے نہیں۔ وہ اوپر سے تو نہیں لادی جا سکتی۔"

"بالکل صحیح بات ہے۔" کمال کی بات سے مجھے شہ مل گئی، سو میں نے بھی ٹکڑا لگا دیا "پہلے اسے جڑ تو پکڑ لینے دو، اس کی نشو و نما ہونے دو، پھر کوئی محاکمہ صادر کرو۔"

سلیم اپنی ہانکے جا رہا تھا "جو مسلمان کانگریس میں ہیں انہیں تو اُلو بنایا جا رہا ہے۔ انہیں دکھا کر یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ کانگریس ایک سیکولر جماعت ہے۔"

''تم بھی خوب بدلے۔'' کمال بولا'' پہلے تو تم یہ کہا کرتے تھے کہ انگریزی حکومت ہندو مسلم جھگڑے کراتی ہے۔ ان میں نفاق ڈالتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ تفریق پیدا کرو اور حکومت کئے جاؤ۔''

اس پر میں نے بھی ایک ٹکڑا جڑ دیا'' اور اب میں یہ سوچ کر حیران ہوتی ہوں کہ یہ کمبخت خود اپنے درمیان کتنی تفریق پیدا کریں گے۔ اس دوری کی تان آخر کہاں جا کے ٹوٹے گی۔''

کمال نے پہلے ہی بھانپ لیا کہ سلیم کیا جواب دے گا۔ اس قیاس کے پیش نظر سرسری سے انداز میں کہنے لگا'' میں تو ہوں سرکاری ملازم۔ جو بھی اقتدار میں ہوگا اس کے احکامات کی تعمیل کروں گا۔ تو میرا معاملے تو یہ ہے۔ خیر اب ذرا چل کر یہ تو دیکھنا چاہیے کہ ہمارے والد بزرگوار الیکشن میں کیسے جا رہے ہیں۔ ویسے تو ان کے لیے یہ آئیڈیل الیکشن ہے۔ نہ پارٹیوں کا ٹنٹا ہے نہ سیاسی جانب داریوں کا قصہ قضیہ ہے۔ بس یار دوست ہی ایک دوسرے کی پیٹھ میں چھرا گھونپ رہے ہیں۔ اصل میں یہ پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا مقابلہ ہے۔''

دو ڈھائی گھنٹے بعد کمال واپس آیا اور مجھے کمرے سے اور میری کتابوں کے بیچ میں سے کھینچ کر نکالا۔ پھر وضاحت کی کہ'' کچھ پردہ نشین خواتین کو گھیر کے لایا گیا ہے۔ یہ تعلقہ دارنیاں ہیں۔ کچھ بیچاریوں کو تو بالکل اندازہ نہیں کہ یہ ہے کیا چکر۔ تو پاپا کہہ رہے ہیں کہ تم جا کر ذرا دیکھو اور جہاں مدد کی ضرورت ہو وہاں مدد کرو۔''

جب ہم گاڑی میں بیٹھ کے جا رہے تھے تو وہ کہنے لگا'' یہ تو ایسے تجربے کا موقع ہاتھ آیا ہے کہ میں تو کسی قیمت پر بھی اسے نہ گنواؤں۔ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو میں تو اس پر یقین ہی نہیں کرتا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اشراف جو ہماری ارسٹوکریسی کی ناک ہیں، ہارس ٹریڈنگ کر رہے ہیں۔ بالکل جیسے گھوڑوں کے تاجر ہوں۔ اپنے ووٹوں کا سودا کر رہے ہیں۔''

'' یہ تو ارسٹوکریٹ تھے۔ میں حیران ہو کر سوچتی ہوں کہ جب دنیا کے اگروال اپنی تاجرانہ ذہنیت کے ساتھ زمامِ اقتدار سنبھالیں گے تو پھر وہ کیا گل کھلائیں گے۔''

بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ میں نے سیتا کے پتا کا نام کیوں لیا۔ جیسے ہی میں نے یہ نام لیا کمال کا منہ اتر گیا اور ہونٹ بالکل سل گئے۔ پھر وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ کاروں تانگوں اور متجسس تماش بینوں کے ہجوم میں سے ڈرائیو کرتا ہوا وہ سفید براق چمکتی دمکتی بارہ دری کے قریب پہنچ گیا۔ گاڑی کو ایک بغلی چبوترے کی سیڑھیوں کے برابر جا کر روکا۔

سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر گئی تو یادوں کے ایک ہجوم نے مجھے گھیر لیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں پہلی مرتبہ امیر سے ملی تھی۔

کمال نے ایک بغلی کمرے کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں چلی جاؤ۔ میں وہاں پہنچی تو دیکھا کہ سفید ساڑھی میں ملبوس ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی صورت سے آشنا تھے۔ پتہ چلا کہ وہ مخالف امیدوار کی طرف سے آئی ہے۔ ادھر اسے بھی بات میرے متعلق معلوم ہوئی۔ تو ہم مسکرا کر ملے تو سہی لیکن یہ

کچھ سٹپٹائی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

مجھے بے چینی سی ہوئی۔ میں بیٹھے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بائیں سمت کے دروازے کی طرف گئی جس کے ادھر کچھ پینٹنگز دکھائی دے رہی تھیں۔ لیکن دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دیکھا اندر ایک بڑی سی میز کے سامنے پڑی آرام کرسی پر ایک موٹا تازہ سرخ سفید چہرے والا آدمی کالے سوٹ میں ملبوس بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ میں دہلیز ہی سے پلٹ آئی۔

لڑکی نے مجھے قیمتی اطلاع سے نوازا کہ ''وہ ڈپٹی کمشنر صاحب ہوں گے۔ وہاں دونوں کے اندراج کے لیے بیٹھے ہیں۔ ووٹروں کا انتظار کر رہے ہیں۔''

اصل میں یہ مسز کاولے تھے۔ میں انہیں اس واسطے سے پہچانتی تھی کہ ان کی بیگم سے میری شناسائی تھی۔ بہت بھلی عورت تھی۔ نرم لہجے میں بات کرتی تھی۔ آرٹسٹ تھی اور ہندوستان سے اسے واقعی ایک لگاؤ تھا۔ اس کے گھر کی فضا بہت پرسکون تھی۔ وہاں بیٹھ کر کتابوں پر اور موسیقی پر متانت اور تہذیب کے ساتھ گفتگو ہو سکتی تھی۔ اور ایک احساس جاگتا تھا کہ اس بحث میں پڑے بغیر کہ زندگی کیسے بسر کرنی چاہیے آدمی خوش اسلوبی سے بسر کر سکتا ہے۔

لڑکی کہنے لگی ''میں تو گھر جانے کی سوچ رہی ہوں۔ یہاں کچھ بھی تو نہیں ہو رہا۔ ویسے بھی میرے ہونے نہ ہونے سے فرق کیا پڑے گا۔ فیصلہ تو لوگ کریں گے۔ مجھ سے تو کہا گیا تھا اس لیے میں آ گئی تھی۔''

''میرا معاملہ بھی یہی ہے۔'' میں نے کہا۔

ہم دونوں بات کر کے خوش اخلاقی سے مسکرائے۔ اس کے بعد پھر چپ ہو گئے۔

جو بارہ تیرہ خواتین ووٹ دینے کے لیے آئیں ان میں سے صرف دو کو پہچانتی تھی۔ ایک تو پھول گاؤں کی رانی تھیں۔ ان کی شخصیت گویا متانت اور دلربائی کا ایک حسین امتزاج تھی۔ اور اس شخصیت کو دیکھ کر ایک اطمینان سا ہوتا تھا کہ بڑی عمر میں جا کر بھی حسن برقرار رہ سکتا ہے۔ دوسری تھیں بیگم قمر زمانی۔ ان کا سلسلۂ نسب شاہانِ اودھ سے ملتا تھا۔ منہ سے جو لفظ نکلتا اپنی جگہ شاعری ہوتا تھا۔ حرکات وسکنات سے شاہانہ وقار ٹپکتا تھا۔ اگر آج انہوں نے اپنے ڈھیلے ہوئے پرانے محل سے برآمد ہونا پسند فرمایا تھا تو یہ گویا دوستانہ مراسم کا احترام تھا۔

لڑکی بولی ''اب میں جا رہی ہوں۔ گڈ بائی۔''

تھوڑی ہی دیر بعد ایک باپردہ کار آ کر رکی اور ایک لمبی لمبی مونچھوں والے کیم شحیم آدمی نے اپنے سے بھی زیادہ ایک کیم شحیم خاتون کو سہارا دے کر موٹر سے اتارا۔ یہ خاتون تھل تھل کرتی چل رہی تھیں۔ پیر ان کے ننگے تھے۔ سر اور چہرہ نقاب سے ڈھکے تھے۔ گہنے پاتے سے کچھ اس انداز سے لدی پھندی تھیں جس انداز سے کوئی دیہاتی عورت شادی بیاہ کے موقع پر گہنا اپنے اوپر لاد لیتی ہے۔ سونے کی پازیبیں ستون ایسے

ٹخنوں میں بجی چھن چھن بول رہی تھیں۔اس شخص کے اندر جانے پر بہت اعتراض ہوئے، احتجاج بھی ہوا۔مگر اس نے ایک نہ سنی۔عذر یہ پیش کیا کہ میں رانی صاحبہ کا مینجر ہوں۔انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔اور یہ کہہ کے ان کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔

چند ہی لمحوں بعد میں نے ایک غصیلی دہاڑ سنی اور پھر دیکھا کہ وہی آدمی الٹے پاؤں بھاگا چلا آ رہا ہے۔منہ سے معافی تلافی کے جملے نکل رہے تھے لیکن ایسے کہ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔پیچھے پیچھے لال منہ والے مسٹر کاولے چلے آ رہے تھے۔آ کر مجھ سے بولے "ذرا اندر آئیں اور رانی صاحبہ کی مدد کریں۔شاید ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ شخص مجھے یہ بتانے کا مجاز نہیں تھا کہ موصوفہ کے ووٹ دینا چاہتی ہیں۔"

رانی صاحبہ ایک صوفے پہ ڈھیر ہوئی بیٹھی تھیں۔جیسے کسی جانور کو کسی نامانوس جگہ پہ چھوڑ دیا جائے تو اس پہ ہراس طاری ہو جاتا ہے، بس اسی قسم کا ہراس ان رانی صاحبہ پر طاری تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا "جو آٹھ نام کاغذ پہ لکھے ہوئے ہیں آپ کو ان میں سے چار کو ووٹ دینا ہے۔"

"ووٹ؟ میں تو کچھ سمجھتی نہیں ہوں۔نہ میں پڑھ سکتی ہوں۔مینجر صاحب کو پتہ ہوگا۔"

کاولے صاحب نے اپنے اوپر جبر کر کے ضبط کیا اور بولے "اس خاتون سے کہو کہ میں نام پڑھ کر سناؤں گا۔جیسے وہ چننے کے حق میں ہیں اس کے نام پر اپنا سر ہلا دیں۔"

کاولے صاحب نے نام پڑھ کر سنائے۔جس نام پر اس خاتون نے سر ہلایا اس پر انہوں نے نشان لگا دیا۔پھر اس خاتون نے دستخط کیے۔اپنا نام اس طرح لکھا جیسے نئے نئے پڑھتے ہوئے بچے اپنا نام لکھتے ہیں۔

"اف!" کاولے صاحب نے اطمینان کا سانس لیا "تو یوں ہے! رانی صاحبہ سے کہیں کہ اب اطمینان سے اپنے گاؤں واپس جائیں۔اپنے جمہوری حقوق کا انہوں نے استعمال کر لیا ہے۔تھینک یو، مائی ڈیئر، تھینک یو۔"

میں ایک میکانکی سے انداز میں مسکرا دی اور اس سیدھی سادھی بھولی بھالی رانی کو باہر لے گئی۔لیکن وہ جو کاولے صاحب کا لہجہ تھا، ایک مشفقانہ سا لہجہ، جو ان کی آواز میں سرایت کر گیا تھا، اس کی طرف دھیان گیا تو میرے اندر ابال اٹھنے لگا۔اس فرنگی کے لوگوں کو یہ بات سمجھنے میں صدیاں لگی تھیں۔اس خاتون سے پھر وہ کیسے توقع کر رہا تھا کہ پہلے ہی دن اس کی سمجھ میں سب کچھ آ جائے گا۔اور میں نے سوچا کہ یہ تو حالات اور تعلیم کا کرم ہے کہ میں نے اس بھاری بھرکم ہانپتی رانی کی راہنمائی کی اور اب میں اسے پردے والی کار میں بٹھا رہی ہوں۔لیکن یہ بی بی اپنی ذات میں زیادہ سچی اور کھری ہے بہ نسبت اُن مصنوعی تبسم فرمانے والی مہذب بیگمات کے جن کے بند دماغوں سے جو کچھ برآمد ہوتا ہے وہ بس چند ماڈرن قسم کے بے معنی جملے ہوتے ہیں۔یہ بی بی ہماری نسبت دیس کے لوگوں سے زیادہ قریب ہے کہ اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سوچنا، محسوس کرنا نہیں

لوگوں کی طرح کا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ باغ اور تہمون، شیکسپیئر اور ایلیٹ کو سر پہ اٹھاتے پھرتے ہیں اور عوام کا لفظ انورنڈ کا ما کے ساتھ زبان پر لاتے ہیں۔

میں ٹیرس پر گھبرائی گھبرائی پھر رہی تھی۔ چاہ رہی تھی کہ کمال آئے اور مجھے یہاں سے نکال کر گھر پہنچا دے۔ مگر یہاں تو بس تانگے اور موٹریں آ جا رہی تھیں۔ موٹروں کے ہارن کی پوں پوں، تانگوں کی گھنٹیوں کی آوازیں، لوگوں کی چیخ پکار، بس یہی کچھ سنائی دے رہا تھا۔

وہ جوارو گرد سنہری بام و در والے مکانات نظر آ رہے تھے انہی میں سے کسی مکان سے کبوتروں کی ایک ٹکڑی اٹھی اور زرد تپتے آسمان پر چکر کاٹنے لگی۔ جس سفید چھت تلے میں کھڑی تھی وہاں ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ پھر پر پھڑ پھڑا کر ایک مذبذب سے انداز میں اڑا اور اس جلیل القدر نیک دل فرنگی حاکم کے اٹھے ہوئے ٹوپ پہ جا بیٹھا جو پیتل کے سانچے میں ڈھلا گھوڑے پہ سوار زمردیں لان کے بیچوں بیچ ڈٹا کھڑا تھا۔ یہاں چڑیوں نے اتنی بیٹیں کی تھیں کہ اس شہسوار کا حاکمانہ شان رکھنے والا سر اور کاندھے سنہری سے سفید ہو گئے تھے۔ اصل میں یہ مہربان چہرہ تو بچپن کے دنوں سے میری نظروں میں کھبا ہوا تھا۔ بابا جان کے کمرے کی دیوار سے آویزاں وہ مجھے تکا کرتا تھا۔ اس شخص کا یہ طور نہیں تھا کہ اپنی حاکمانہ شان میں مگن دوسروں سے الگ تھلگ ہوئے بیٹھے ہیں۔ جن لوگوں کو اس سے ملنے کا موقع میسر آیا ان کے دلوں میں اس شخص نے گھر کر لیا تھا۔ ایک یہ شخص اور دوسرے مسٹر فری مینٹل ان دونوں کا طور ایسا تھا کہ ان سے ملنے والوں کو یہ احساس ہی نہیں رہتا تھا کہ انگریز اجنبی لوگ ہیں اور حاکم ہیں۔ لیکن پھر یہ بھی ہے کہ آخر اس بات کو فراموش کیسے کیا جا سکتا تھا۔ اس گھڑی کو میں کبھی نہیں بھول پائی جب میں کلائیو کے بارے میں ایک فلم دیکھ رہی تھی اور اس کے مختلف مناظر پہ تالیاں بج رہی تھیں۔ اس آن مجھے یہ خیال اندر سے کچوکے دینے لگا کہ یہ جو ہمہ شما قسم کے گورے سپاہی میرے اردگرد بیٹھے ہیں یہ میرے حکام عظام ہیں۔

میں چکر لگاتی ہوئی وہاں جانکلی جہاں یہ ٹیرس پھیل کر وسیع ہو گیا تھا۔ یہیں وہ دروازہ تھا جس سے میں بھاگتی ہوئی نکل رہی تھی کہ امیر سے جا ٹکرائی۔

''لیلیٰ!''

مجھے وسوسہ ہوا کہ یہ کس نے آواز دی ہے۔ کوئی سایہ تو نہیں۔ اسی شک میں پلٹ کر دیکھا۔

''لیلیٰ!'' سیڑھیوں کے قریب سے آواز آئی۔

''امیر!'' میری آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں سیڑھیوں کی طرف دوڑی ''نہیں، یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں! یہ تم تو نہیں ہو سکتے ۔۔۔۔۔۔ تم کیسے ہو سکتے ہو!''

''میں ہی ہوں۔ گوشت پوست کا آدمی امیر۔ یقین نہ آئے تو چھو کر دیکھ لو۔'' وہ ہنسا۔ مگر مجھ سے دور ہی کھڑا رہا۔۔۔۔۔ لوگ جو آس پاس چل پھر رہے تھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے اپنی حماقت میں پھر وہی فقرہ دہرایا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ لال ہو گیا ہے اور جلنے لگا ہے۔ "مگر ایسا بھی ہو سکتا ہے" اب مجھے مذاق کی سوجھی "مگر میں ابھی روحانیت کے اس درجے پر فائز نہیں ہوئی ہوں کہ میں اپنے وہم کو گوشت پوست کا جامہ پہنا سکوں۔"

"میں کسی عامل کا کرشمہ نہیں ہوں۔" اس نے دل لگی کے انداز میں کہا "سیدھی سادھی عملی زندگی کے تقاضے مجھے یہاں کھینچ لائے ہیں۔ میں ایک ملازمت کے چکر میں یہاں آیا ہوں۔"

"مگر تم نے مجھے تو یہ بات بتائی نہیں تھی۔"

"بتانے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں آج ہی تو دوپہر کی گاڑی سے پہنچا ہوں۔ اس کی تفصیل شام کو بتاؤں گا۔ کمال نے مجھے رات کے کھانے پر بلا رکھا ہے۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی غیرت کو طاق پر رکھنا پڑا۔ رضا علی سے کہا کہ تم اپنے ابا جان سے کہو کہ یونیورسٹی میں ایک جگہ خالی ہے۔ اپنے اثر و رسوخ سے وہاں میرا تقرر کرا دیں۔ میں تمہارے نزدیک رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے بڑی سادگی سے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کر دی۔

"میرے نزدیک" میں نے اس کی بات کو دہرایا۔ مجھے خوشی تو ہوئی لیکن ایک خیال سے یہ خوشی گہنا گئی۔ خیال آیا کہ پھر جھوٹ بولنا پڑا کرے گا۔ پھر اسی طرح بات کو ٹالنے، گول کرنے کی کوشش کیا کروں گی۔ اور اسی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھا کروں گی۔

"کیوں لیلیٰ؟" میں نے بے چین ہو کر کہا "تمہیں میرا نزدیک ہونا بھاتا نہیں؟"

"یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔" میں نے جلدی سے کہا اور اپنے اندیشوں سے مجھے ندامت ہونے لگی۔

"مگر تم نے میرے آنے پر خوشی کا ذرا بھی اظہار نہیں کیا ہے۔ تمہیں اس کا احساس ہے؟"

"میں تو سب کچھ بھول گئی۔" کہتی کیا۔"

"لیلیٰ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ آخر تم اتنی اداس کیوں نظر آ رہی ہو۔"

"میں احمق ہوں۔ جب خوش ہوتی ہوں تو رونے کو جی چاہتا ہے۔"

اس نے اردگرد دیکھا اور نیچے چلتی مخلوق پر ایک نظر ڈالی "اب مجھے چلنا چاہیے۔ رضا علی راہ تک رہا ہوگا۔ پھر ملوں گا۔" سیڑھیوں سے اترتے اترتے مڑ کر بولا "ہاں میں یہ کہنا تو بھول ہی گیا، کمال کار لے کر آ رہا ہوگا۔ اس نے یہی کہنے کے لیے مجھے بھیجا تھا۔"

کمال ڈیئر، اس میں کتنی انسانیت ہے۔ اور امیر چلا گیا۔ لیکن مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ امیر میرے قریب موجود ہے۔ میرے اردگرد جو ایک دنیا امنڈی ہوئی تھی وہ اپنی ساری رونق کے باوجود اپنے وجود کا احساس نہیں دلا پا رہی تھی، اس کے مقابلے میں امیر موجود نہ ہوتے ہوئے بھی زیادہ قریب محسوس ہو رہا تھا۔

اٹھارواں باب

ساری شام آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ حامد چچا کی کامیابی پر مبارکباد دینے والے آتے چلے جا رہے تھے۔ ہر آنے والا انہیں گجرا پہناتا۔ نوبت یہ پہنچی کہ چچا جان دہکتے مہکتے پھولوں سے لد گئے کہ بس چہرہ، بازو اور ٹانگیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ باقی پھول ہی پھول نظر آ رہے تھے۔

حامد چچا خوشی سے ایسے سرشار تھے کہ وہ جو جذباتی اظہار کے معاملے میں ان کے یہاں ایک رکھ رکھاؤ تھا اسے وہ اس وقت بھول ہی گئے۔ کس گرمجوشی سے ہمیں گلے لگایا ہے۔ سائرہ چچی کا چہرہ ایک فخر کے احساس سے دمک رہا تھا، جیسے اس فتح میں بڑا ہاتھ انہی کا ہو۔

سب نے شربت پیا، چاندی کے ورق میں لپٹے پان کھائے، مٹھائی چکھی اور حامد چچا کی اگلی پچھلی و نیز آئندہ کی کامیابیوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔

جب شام گہری ہوئی تو گھر روشنیوں سے جگمگا اٹھا اور ہنسنے بولنے کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجے چلی جا رہی تھی۔ کاریں اور بگھیاں آ رہی تھیں، جا رہی تھیں۔

نوکروں چاکروں نے بھی خوب خوشی منائی۔ نظامن نے مٹھائی منگا کر نذر دلوائی۔ اس میں سے تھوڑی مٹھائی تو مسجد میں بھجوا دی۔ پھر اس میں سے خاندان کے ہر فرد کا حصہ نکالا۔ باقی جو بچی وہ نوکروں چاکروں میں بانٹ دی۔ مالیوں، قلیوں اور نندی کے باپ نے مل کر خوب تاڑی چڑھائی اور خوب ناچے گائے۔ بھیگی رات میں ان کے ڈھول ڈھمکے نے اپنا جادو جگایا۔ آج حامد چچا کو اس شور پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

زمینوں سے کسان چلے آ رہے تھے۔ رات انہوں نے برآمدے میں اور سرونٹس کوارٹرز میں بسر کی۔

ماجدہ پھپھی اور عابدہ پھپھی کی طرف سے پیغام آیا کہ وہ اگلی صبح پہنچ رہی ہیں۔

جب راجہ امیر پور تشریف لائے اور اعلیٰ پیمانے پر ان کی خاطر مدارات ہوئی تو ایک میں تھی جسے یہ احساس ستا رہا تھا کہ یہ ضیافت ادھوری ہے کہ امیر تو ان کے ہمراہ آیا ہی نہیں ہے۔ سب لوگ راجہ صاحب کے گرد مؤدب بیٹھے تھے۔ حامد چچا کی کامیابی انہی کی تو مرہونِ منت تھی کہ پیچھے اصل طاقت تو انہی کی تھی۔

آنکھیں نیچی کر کے سائرہ چچی سے مخاطب ہوئے" ماشاء اللہ بھائی صاحب بہت شان سے جیتے ہیں۔"

"اللہ کا کرم تھا اور آپ کی مدد شاملِ حال تھی۔" سائرہ چچی نے ایک رسمی انکساری کے ساتھ جواب دیا۔

انہوں نے بھی اسی منکسرانہ لہجے میں کہا" اس ناچیز نے اپنی سی کی۔ باقی کامیابی تو اللہ کے ہاتھ ہوتی ہے۔ بس اللہ ہمیں ہمت دے۔ ہمیں اپنے مقصد کی جنگ لڑنے کے لیے اچھے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔"

حامد چچا تشویش بھرے لہجے میں بولے" عمومی انتخابی حلقوں سے جو ہمارے دوست کھڑے ہوئے تھے ان میں سے تو بہت سے ہار گئے۔ یہ بہت تشویش ناک بات ہے۔"

راجہ صاحب نے ایسے سر ہلایا جیسے کسی بدفالی کی خبر دے رہے ہوں" یہ تو انقلاب ہے۔ کانگریس کو اکثریت حاصل ہے۔ حکومت بنانے کے لیے اسی سے کہا جائے گا۔ یہ انقلاب نہیں تو اور کیا ہے۔"

"انقلاب!" حامد چچا نے تشویش بھرے لہجے میں کہا" زرعی اصلاحات پر وہ مسز ید زور دیں گے۔۔۔۔۔"

"سماجی ڈھانچے پر بڑے خراب اثرات پڑیں گے، انتشار پھیلے گا۔" راجہ صاحب نے بات کو آگے بڑھایا" بہر حال ہماری جو چیز ہے اس کی حفاظت کے لیے ہماری جنگ جاری رہنی چاہیے۔"

سائرہ چچی غصے سے بولیں" جو ہماری چیز ہے وہ ہم سے کیسے لے سکتے ہیں۔ کوئی بھی حکومت ہو، چوروں قزاقوں والے کرتوت تو نہیں کر سکتی۔"

سلیم نے اس گفتگو میں اپنی ٹانگ اڑا دی" روس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ روسی انقلاب نے تو لوگوں کے ذہنوں پر اتنے دوررس اثرات مرتب کئے ہیں کہ کوئی مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

کمال مسکرایا۔ چپکے سے میرے کان میں کہا" موصوف پھر چل نکلے۔"

میں نے اسی طرح چپکے سے کہا" یاں سے بھاگ لیں۔"

"یہ تو بدتمیزی ہوگی۔" کمال نے جواب میں کہا۔

سائرہ چچی مولویانہ انداز میں گویا ہوئیں" ان ملحدوں کا اور مذہب کا ذکر ایک سانس میں۔ یہ تو مت کرو۔"

"امی، گستاخی معاف، یہ ملحد لوگ بھوکے ننگے اور بے گھر بے در لوگوں سے جو کچھ کہتے ہیں اس میں آپ کے بڑے بڑے مولویوں، مفتیوں کے ارشادات عالیہ سے زیادہ وزن ہوتا ہے۔"

راجہ صاحب یوں اس سے مخاطب ہوئے جیسے وہ کوئی نٹ کھٹ بچہ ہے لیکن ساتھ ہی ان کا منظورِ نظر بھی ہے" فرزندِ عزیز، بیگم صاحبہ درست فرما رہی ہیں۔ ملحدوں سے ہمیں کیا لینا دینا ہے۔ ہمارا مذہب ایسے

راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کی تلقین کے ساتھ ساتھ آدمی کی مادی بہبود کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔"

"میں تو جا رہی ہوں۔" میں نے کمال کے کان میں کہا "یہ تو سیاست سے بھی بدتر باتیں ہو رہی ہیں۔"

اصل میں یہ لوگ جس طرح بے تکان اللہ تعالیٰ کا نام لیے چلے جا رہے تھے اس سے مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ پھر یہ کہ ویسے تو یہ لوگ بت پرستوں کو بہت برا بھلا کہتے ہیں کہ وہ اپنی روحانی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خود ہی خداؤں کو گھڑ لیتے ہیں، لیکن خود یہ لوگ اپنے ذہنوں کی ہر کجی کے ساتھ خدا کی ایک نئی شکل ایجاد کر لیتے ہیں۔

میں وہاں سے چپکے سے کھسک لی۔ دروازے پہ پہنچی تھی کہ دیکھا رنجیت آندھی دھاندی چلا آ رہا ہے۔ وہ کیا آیا، خیر سگالی اور مبارک سلامت کی ایک آندھی آ گئی۔ "آداب چچا جی آداب چاچی جی! آداب راجہ چاچا!" ساتھ میں جھک جھک کے سلام کر رہا تھا "دعوت کب ہو رہی ہے۔ جشن کس دن منایا جا رہا ہے؟"

"بیٹے، یہ تمہارا گھر ہے۔" سائرہ چچی مسکرائیں "جب جی چاہے آؤ اور دعوت کھاؤ۔ آج رات ہی آ جاؤ۔ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

"نہیں چاچی نہیں۔ میں اتنی آسانی سے ٹلنے والا نہیں ہوں۔ ویسے تو میں یہاں آ کر کسی وقت بھی کھانا کھا لوں، یہ میرا گھر جو ہوا، مگر میں تو باقاعدہ دعوت کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ راجہ چچا! آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا ہم نوجوانوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم گانے بجانے کے ساتھ ایک ٹھاٹ دار دعوت اڑائیں؟"

"یقیناً، یقیناً!" راجہ امیر پور نے فیاضانہ شان کے ساتھ کہا "اور ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ایک دن تم بھی اپنی کامیابی کی خوشی میں ہمیں دعوت میں آنے کا بلاوا بھیجو گے کیونکہ میری دانست میں تو ماشاء اللہ تم بھی ایک ہونہار سیاسی ستارہ ہو۔ اور لو اب ہم چلے۔ تم اپنی چاچی سے چھیڑ چھاڑ کرو۔"

بڑے ادب آداب کے ساتھ، سو قسم کے تکلفات کے ساتھ راجہ صاحب کو رخصت کیا گیا۔ انہیں پہنچانے کے لیے سب کار تک گئے۔

جب رنجیت کو یقین ہو گیا کہ حامد چچا اور سائرہ چچی چلے گئے ہیں اور بات ان کے کان تک نہیں پہنچے گی تو کہنے لگا "کمال، میں کہتا ہوں کہ کیوں نہ ایک پارٹی ہو جائے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟ میں چند دوستوں کو سمیٹ کے لاتا ہوں۔ رات بھیگنے پہ چاند بھی نکل آئے گا۔ کیا خوبصورت چاندنی ہوگی۔ پرانے محل میں جا کے وہاں جو بھوت پریت آباد ہیں انہیں جگائیں گے۔ کیا عجب ہے کہ سندر ناریوں کی روحیں آ جائیں۔ تو پھر کیا خیال ہے۔"

کمال نے تذبذب کے لہجے میں کہا "شاید پاپا یہ چاہیں گے کہ ہم آج رات انہی کے ساتھ رہیں۔"

''ارے وہ آج اچھے موڈ میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں آج کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' رنجیت کمال کو پھسلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اگر ہمیں جانا ہے'' میں بولی ''تو رنجیت جی! بہتر یہ ہوگا کہ محل کے بجائے ندی کی طرف چلیں، بند پہ۔''

میرے اندر ایک آرزو کروٹیں لے رہی تھی کہ آج رات امیر کے ساتھ ندی کنارے سیر کی جائے۔ وہاں بند پر پشتے سے لے کر نیچے سطح آب تک ایک سکوت ہوتا ہے اور سکون۔ اور اس سکوت اور سکون کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دروں کے بیچ سے جو ندی کی دھار مچلتی گرجتی نکلتی ہے اس کے شور پر بھی وہ محیط نظر آتا ہے۔ اور ندی کے پار درخت اور کھیت دور تک ایک خاموشی کو آغوش میں لیے پھیلے نظر آتے ہیں۔

''تو ٹھیک ہے نا۔ ڈنر کے بعد؟ ہیں نا؟'' رنجیت بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ وہ ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو سے غرض رکھتا تھا۔

''ہاں ڈنر کے بعد۔'' کمال نے جواب دیا۔

رنجیت اپنی شور مچاتی موٹر یا میں بیٹھ یہ جا وہ جا۔

خدا خدا کر کے امیر آیا جیسے ازل سے ابد تک کا فاصلہ طے کر کے آیا ہو۔

ڈنر پر سارا وقت میں امیر کے خلاف سائرہ چچی کے ردعمل کو تاڑتی رہی۔ کوئی اچٹتی ہوئی تیز نظر، کوئی چبھتا سا جملہ، چہرے پر نمودار ہونے والی کوئی اڑتی سی کیفیت، میں ایک ایک بات دیکھ رہی تھی۔ میرے اعصاب بہت حساس ہیں۔ ناپسندیدگی کی نظر کو فوراً پہچان لیتے ہیں اور کانپنے لگتے ہیں۔ سوذرا بھی ٹھیس لگ جائے تو میرے یہاں دُکھن پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت تو میں کچھ زیادہ ہی زود حس ہوگئی تھی۔

میں سوچنے لگی کہ آخر انہیں امیر سے ایسا کیا بیر ہے۔ کیا میرے بارے میں جوان کے محسوسات ہیں، یہ صورت احوال اس کی غماز ہے؟ یا یہ ہماری اس معاندانہ روش کا ردعمل ہے جسے ہم نے ظاہر کرنے کی جرأت کبھی نہیں کی بلکہ جس پر ہم نے ایک محتاط اور رسمی قسم کی خوش اخلاقی کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ آخر ہمارے درمیان یہ معاندانہ صورتحال کیوں پیدا ہوئی۔ کیا انہیں یہ بات بری لگی کہ میں جس والہانہ انداز میں عابدہ پھپھی کو چاہتی ہوں ویسی محبت میں ان سے نہیں کر سکی۔ یا انہوں نے میری عزلت پسندی سے یہ مطلب نکالا کہ میں ضدی اور ہٹ دھرم ہوں۔ یا انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ لڑکی ہم جو کہتے ہیں وہ مان تو لیتی ہے لیکن اس نے دل سے ہماری اطاعت قبول نہیں کی ہے۔ گویا میری فرمانبرداری بھی ان کی دانست میں ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ یا پھر اس کا سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ وہ امیر کو اپنی خواہش کے رستے میں ایک رکاوٹ سمجھ رہی تھی۔ یہ خواہش کہ میں ان کے بیٹے سے شادی پر رضامند ہو جاؤں اور یوں میرے مستقبل کا مسئلہ اور خاندانی جائیداد

میں میرے حصے کا مسئلہ دونوں مسئلے خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں۔ یا بات محض اتنی تھی کہ مال و دولت، محفوظ مستقبل اور حسب نسب کے جو روایتی معیارات انہوں نے اپنا رکھے تھے ان پر امیر پورا نہیں اتر تا تھا۔

بہر حال باتیں بہت خوشگوار ماحول میں ہو رہی تھیں اور خلاف معمول آج کوئی بحث نہیں ہو رہی تھی۔ مگر میرا دماغ حاضر نہیں تھا، میں کہیں کھوئی ہوئی تھی۔

سلیم نے موقع مناسب دیکھ کر سرسری سے انداز میں ہمارے پکنک کے منصوبے کا ذکر کر دیا، اور لیجئے ہمیں جانے کی اجازت مل گئی۔ بس تھوڑی ہی دیر بعد ہم کمال کے کمرے میں جا پہنچے۔ سلیم نے بتایا کہ اس نے رنجیت سے وعدہ کرلیا ہے کہ وہ کچھ دوستوں کو لے کر پہنچے گا۔ سو وہ اپنی کار لے کر چلتا بنا۔

چاند نکل آیا تھا۔ چاندنی میں باغ، درخت، آشیانے کی عمارت، سب چیزیں واضح دکھائی دے رہی تھیں اور کیسی نرم نرم اور پرسکون نظر آ رہی تھیں۔ سورج کی روشنی میں یہ بات کہاں۔

پھر کمال بھی یہ کہہ کر چلا گیا کہ میں پاپا کی کار لے کر آتا ہوں۔ آخر ہمیں خلوت میسر آئی۔

''کھانے کے پورے وقت تم بہت ناخوش دکھائی دے رہی تھیں۔ کوئی بات تھی جو تمہیں پریشان کر رہی تھی؟ کیا بات تھی؟''

میں نے مسکرا کر کہا'' میں تم سے تو کوئی بات چھپا نہیں سکتی۔ یا چھپا سکتی ہوں، بتاؤ؟''

وہ بولا'' جو تم محسوس کرتی ہو وہ میں بھی محسوس کرنے لگتا ہوں بلکہ میں تمہارے واسطے ہی سے محسوس کرتا ہوں۔''

''مجھے ایک احساس ستار ہا تھا کہ سائرہ چچی ہمیں تاڑ رہی ہیں۔ یوں ہمیں دیکھ نہ رہی ہوں، اس صورت میں بھی ان کی نظر ہم ہی پر تھی۔ جیسے کسی کو وہم ہو کہ اندھیرے میں کوئی ہے حالانکہ کوئی نہیں ہوتا مگر وہ ڈرار ہتا ہے۔ بس یہی کیفیت میری تھی۔''

''محسوس تو مجھے بھی ہوا تھا۔'' وہ ہچکچایا اور پھر کہنے لگا'' میں انہیں بھایا نہیں اور تمہارے چچا کو بھی یہ بات پسند نہیں ہوگی کہ میں تمہارا شوہر بنوں۔ میں اس معیار پر پورا نہیں اترتا، یعنی جوان کا معیار ہے۔''

''پلیز، یہ بات مت کرو۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ اس بات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں۔ میں اب بیس برس کی ہو رہی ہوں۔''

''رسوم ورواج سے لڑنا، اپنے لوگوں کی مرضی کے خلاف کرنا، کوئی آسان بات نہیں ہے۔''

''امیر، مجھ میں ہمت بالکل نہیں ہے۔ جن باتوں میں ایمان رکھتی ہوں وہ تو میں نے کبھی کی ہی نہیں۔ یا شاید ایسا ہے کہ میں کبھی کسی چیز کسی بات پر پوری طرح ایمان لائی ہی نہیں۔ مجھے کبھی کسی معاملے میں فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ ہمیشہ دوسروں نے میرے لیے فیصلے کئے۔ اس صورت میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی قوت عمل ہی نہیں ذہن بھی مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ چیخ چیخ کر: ہائی دوں

کہ تم لوگ مجھے کچلے دے رہے ہو، میری انفرادیت کو مٹانے پر تلے ہوئے ہو۔ اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو یہ لوگ کہتے کہ یہ لڑکی بہت گستاخ بہت ضدی ہے۔ یا کہہ لیجئے کہ یہ سب میرے تصور کا کرشمہ ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟ یا کیا واقعی میں دوسروں کے لیے مسئلے کھڑے کر دیتی ہوں۔''

''میں یقیناً تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ لیکن جس صورتحال سے ہمارا سابقہ پڑا ہے وہ کوئی واہمہ نہیں ہے، حقیقت ہے، سنگین حقیقت۔ ہر طرح کے تعصبات نے مل کر ایک حقیقت کا روپ دھار لیا ہے۔ اس سے نبٹنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہے۔''

''جب میں تمہیں اپنے تصور میں لاتی ہوں تو مجھ میں دنیا بھر کی ہمت آ جاتی ہے۔ اس لیے کہ تمہارے بارے میں میرے یہاں کسی قسم کا شک نہیں ہے۔ لے دے کے یہی تو ایک چیز ہے جس میں میرا ایمان ہے۔ اس شے کو مجھ سے لے لو، پھر میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔''

''لیلیٰ، مجھے ڈر لگتا ہے، اُن لوگوں سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے، اس لیے کہ میں اپنے آپ کو کسی لائق نہیں سمجھتا۔ بس میں ایک ہی بات جانتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

پھر ایسا ہوا کہ جیسے ہی اس نے مجھے چوما، پردہ اٹھا۔ دروازے میں سائرہ چچی کھڑی تھی۔ ان کے پیچھے کمال کھڑا تھا۔

وہ چند لمحوں سے زیادہ وہاں پر نہیں ٹھہریں۔ کمال فوراً ہی انہیں کھینچ کر لے گیا۔ لیکن اس خاموش بے انت لمحے میں مَیں نے ان کی آنکھوں میں غصے کو اور نفرت کو برہنہ دیکھا۔ کاٹو تو میرے بدن میں لہو نہیں۔ میں تھر تھر کانپنے لگی۔

''لیلیٰ پلیز...... پلیز لیلیٰ'' امیر چلانے لگا'' میری طرف دیکھو۔''

مجھ پہ ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اسی کیفیت میں میری زبان سے نکلا'' اچھا تو یہ بات ہے۔ فیصلے کی گھڑی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔''

اس نے میرے کانپتے جسم کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا'' میں خوش ہوں۔'' تیز لہجے میں بولا'' میں خوش ہوں۔''

''ان لوگوں سے میں مطلق نہیں ڈرتی۔'' میں نے کہا'' جو گندی باتیں ہوں گی، میں بس ان سے ڈرتی ہوں۔''

میں اس سے چمٹ گئی اور سسک سسک کے رونے لگی۔

اس نے بڑے پیار سے کہا'' ڈرنا تو خیر قدرتی بات ہے۔ جو تمہارا احساس ہے وہی میرا بھی ہے۔ لیکن اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں تو ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

پھر کمال آ گیا۔ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خوش نظر آ رہا تھا۔'' تھوڑا سا گھپلا ہو گیا۔ تم لوگ

تھوڑی احتیاط برت لیتے۔''مسکرایا''مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔''

''کمال، یار مجھے افسوس ہے''امیر نے بڑے سکون کے ساتھ کہا''مگر میں لیلیٰ سے محبت کرتا ہوں۔''

''یا میرے مولا! یہ بتانے کی ضرورت تھی؟ میں کوئی اندھا ہوں۔ خیر چلنے کے متعلق کیا خیال ہے؟ وہ لوگ ہمارا انتظار کررہے ہوں گے۔''

''لیکن کمال''میں تلملا کر بولی''ہم کیسے۔۔۔۔۔ میں کیسے۔۔۔۔۔ اس بارے میں کیا۔۔۔۔۔''

''کس بارے میں کیا؟ اپنے میں ہمت پیدا کرو۔ کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ یا واقعی ٹوٹ پڑی ہے۔ اور امی کی طرف سے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔ مجھے طریقہ آتا ہے۔ وہ سکینڈل سے بہت ڈرتی ہیں، بدنامی سے۔ بس اس بات سے انہیں ڈرا دیا جائے۔ اور ذرا ایسی فضا پیدا کردی جائے کہ بھرم قائم رہے۔ آبرومندی کی فضا۔''اس نے میرے رخسار پر ہلکا سا پیار کیا۔''بس اب چلو۔ خوش ہوجاؤ۔ آخر تمہیں بھی تو اب خوشی منانی ہے۔ تو آج رات ہم خوب جشن منائیں گے، مزے کریں گے۔''

''لیکن کل۔۔۔۔۔؟''میری آواز لڑکھڑا گئی۔

''آنے والا کل بہت جلدی گزرا ہوا کل بن جائے گا۔''وہ ہنسنے لگا۔

جب ہم موٹر میں بیٹھ کر گیٹ سے نکلے ہیں تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ کل صبح جس گھڑی اس گھر میں سورج چڑھے گا اور مجھے جگائے گا، اسی طور سے جس طور سے میرے ہوش سنبھالنے کے وقت سے چڑھتا آیا ہے اور مجھے جگاتا آیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن میں تو اس آنے والی گھڑی سے پہلے ہی یہ گھر چھوڑ چکی ہوں۔۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔

امیر نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں جکڑا ہوا تھا۔

چوتھا حصّہ
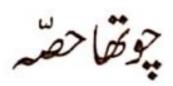
پہلا باب

سورج تتر بتر بدلیوں کے پیچھے سے جھانک رہا تھا اور اس کی نرم گرم شعاعیں میرے ٹھنڈے یخ بدن کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ بار بار چھوتیں اور غائب ہو جاتیں۔ میں موز میں بیٹھی آشیانے کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ آشیانہ جہاں میرا بچپن گزرا تھا، جہاں میں بچی سے جوان ہوئی تھی۔

وہ جاڑوں کی صبح تھی۔ دھند ابھی تک دیہی علاقے کے جوہڑوں پر، کھیتوں اور درختوں کے جھنڈوں پر منڈلا رہی تھی۔ جب شہر میں داخل ہونے کے لیے ندی کو عبور کیا تو اس پر بھی یہ دھند تیر رہی تھی۔

جہاں کبھی کھلے میدان تھے وہاں اب شہر نارتھیوں کے میلے کچیلے پھٹے ٹوٹے ڈیرے خیمے پھیلے نظر آ رہے تھے۔ بدنما عمارتیں بن گئی تھیں۔ ایک تو پھیلتے شہر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی عجلت تھی، پھر جدید زندگی کی بدبختی، ان دونوں نے مل کر ان بدنما عمارتوں کو جنم دیا تھا۔

میری آنکھیں نوسٹلجیا اور اداسی میں ڈوبی نظروں سے اردگرد کو دیکھ رہی تھیں۔ اپنی محبوب محرابوں اور گنبدوں کو، ندی کے موڑ کو، سڑکوں کے پھیلے جال کو، سڑکوں کی تختیوں پر لکھے ہوئے نامانوس ناموں کو اور ان کے بدلے ہوئے رسم الخط کو، ریذیڈنسی کو جو ہریالی سے ڈھکی بلندی پر اس رنگ سے کھڑی تھی کہ کھنڈر بن چکی تھی اور اس پر لہراتا جھنڈا غائب تھا۔ اور وہ اونچی شان والا کلب جو کبھی کلب ہوا کرتا تھا اور اب اس کی حیثیت ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تھی اور ملکہ کے مرمریں بت والا چبوترہ۔ ملکہ کا بت اب وہاں نہیں تھا۔ کوئی بے فکرا چبوترے پر پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ نوابوں کی بدرنگ حویلیاں، مال روڈ جہاں اب نئی دکانیں، ریستوران اور سینما گھر نظر آ رہے تھے۔ چبوتروں پہ بنے سٹال جیسے ان بازاروں میں نظر آتے ہیں جہاں بھونڈے رنگ برنگے بینروں اور سائن بورڈوں کی ریل پیل ہوتی ہے۔ پرانی عمارات جن کے بام و در چغلی کھا رہے تھے کہ ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ گرجا گھر جس کے سکول کے ساتھ ایک نئی انیکسی کا اضافہ ہو گیا تھا اور یہ کہ اب اس سکول میں "گاڈ سیو دی کنگ" والا ترانہ نہیں گایا جاتا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس جس کے جھنڈے والی چھڑ پر ترنگا لہرا رہا تھا۔ سڑک پر دونوں طرف خاموش سایہ دار درختوں کی قطاریں۔

جہاں کسی زمانے میں رجہ بھیم نگر کا محل اور باغ ہوا کرتا تھا وہاں اب اگروال نے سستے فلیٹوں پر مشتمل ایک سہ منزلہ عمارت کھڑی کر لی تھی۔ ادھر سے گزرتے ہوئے سب سے پہلے مجھے اس کا پہلا بلاک

دکھائی پڑا۔ ہر بالکنی کے سامنے سوکھنے کے لیے دھوئے ہوئے کپڑے لٹکے تھے۔ ادھر سے تیز آوازیں آرہی تھیں جو بتارہی تھیں کہ ان فلیٹوں میں دن کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

اب میں اپنے گھر کے آس پاس تھی۔ کچی روئی یا کپاس جیسے بادل بکھر کر زم زم گالوں کی شکل اختیار کر رہے تھے اور یہ گالے صاف شفاف نیلی فضا میں تحلیل ہوتے چلے جارہے تھے۔ درختوں کے چمکیلے پتوں اور گھاس کی سفید چاندی پتیوں پر جو تھوڑے بہت شبنم کے قطرے جھلملاتے رہ گئے تھے انہیں سورج کی تیز ہوتی تمازت جذب کرتی چلی جارہی تھی۔ اب اس تمازت کا بدن پر اثر محسوس ہونے لگا تھا۔ لیکن میرا حال یہ تھا کہ جب آشیانے کے گیٹ میں داخل ہوئی ہوں تو میں کانپ رہی تھی۔

سنگ مرمر کی تختی پر جو میرے چچا جان کا نام صاف ستھرے سیاہ حروف میں لکھا نظر آیا کرتا تھا اب بدرنگا ہو گیا تھا۔ اور آدھا تو وہ لکڑی کے اس تختے کے نیچے آ گیا تھا جو کیلوں کے ڈھیلے ہو جانے سے آدھا نکل کر اس تختی پر جھول رہا تھا۔ پھاٹک کی دونوں سمتوں میں اور دوسرے بورڈ آویزاں نظر آرہے تھے۔ ایک بورڈ پر جلی حروف میں کسی ڈاکٹر صاحب کی ڈگریوں اور قابلیت کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ دوسرا بورڈ کسی دانتوں کے ڈاکٹر کے اوصاف بیان کرتا نظر آرہا تھا۔ تیسرا بورڈ کسی وکیل کی توصیف بیان کررہا تھا۔ ان سب ماہرین کے نام ظاہر کررہے تھے کہ وہ شمال کے ان علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو اب ان کا وطن نہیں رہا۔

میں کاروں والے راستے پہ مڑ گئی اور اب یہ رستہ اتنا ناہموار تھا کہ میری کار کو جھٹکے لگنے لگے۔ کناروں پر جو کیاریاں تھیں ان کا نقشہ کچھ اس طرح کا تھا جیسے کسی بھٹکتے ہوئے جوگی کی بکھری ہوئی لٹیں ہوں۔ وہ لان جہاں کبھی سبزے کا فرش بچھا دکھائی دیتا تھا اب بھورے بھورے لگ رہے تھے۔ نہ پہلے کی طرح ہموار نظر آتے تھے۔ ان کے کنارے کنارے جو پھول پودوں کے تختے تھے وہاں پودے تراش خراش سے بے نیاز ہو کر جھاڑیاں بن گئے تھے۔ جہاں تہاں کچھ پھول کھلے تھے۔ توجہ سے محروم یہ پھول گھاس پھونس کی مثال اگے نظر آرہے تھے۔

دیواروں سے جا بجا پلستر اکھڑ گیا تھا اور سیلن آ گئی تھی۔ اس سے گھر کی شکل عجب طرح سے بگڑی تھی کہ جیسے کوئی عورت جو کسی زمانے میں حسین مہ جبین تھی اب کوڑھ کا شکار ہے۔ پورچ پر بوگن ویلیا کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس پر کھلے لال، نارنجی اور اودے پھول نیلے آسمان کے مقابل اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ میں نے یہاں پہنچ کر کار روک لی۔ چند لمحے میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ میرے اندر جو جذبات کا اُبال اٹھ رہا تھا اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

لکڑی کے ٹیڑھے میڑھے کھونٹے گاڑ کے اور خاردار تار تان کے ایک چھوٹی موٹی باڑ بنائی گئی تھی۔ یہ باڑھ مرکزی عمارت اور ان کمروں کے سامنے والے باغ کے درمیان حدِ فاصل کا کام دے رہی تھی جہاں کسی پچھلے زمانے میں ہماری پھپھیاں اور ان کی نوکرانیاں رہا کرتی تھیں۔ گھاس کے تختے پر جو گلاب کی

جھاڑیاں تھیں ان کے برابر کسی بچے کا گڑولنا الٹا پڑا تھا۔ برآمدے میں سائیکل کھڑی تھی اور زینے کے اوپر والی بالکنی کے جنگلے پر تولیاں لٹکی ہوئی تھیں۔

میں کار سے اتر کر پورچ میں سے ہوتی ہوئی چوڑے برآمدے میں پہنچی۔ دروازوں میں تالے پڑے تھے۔ ان کے آگے جو تاروں کی جالی لگی تھی اس پر گرد جم گئی تھی۔ جالی کے پیچھے جو شیشوں والے دروازے تھے ان میں ایک دروازے کے شیشے میں بال پڑ گیا تھا۔ پیتل کے فنگر زنگ کھا کر کالی پڑ گئی تھیں۔

جب میں نے یہ طے کیا تھا کہ آخری بار اس گھر کو چل کر ایک نظر دیکھ لیا جائے تو میرا خیال یہ تھا کہ میں ضبط نہیں کر سکوں گی۔ اسی لیے میں اکیلی آئی تھی۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہاں جو میرا حال ہوگا اسے کوئی دوسرا دیکھے۔ میرے بہت ہی نجی قسم کے جذبات و احساسات اس گھر کی فضا میں گوندھے ہوئے تھے۔ جس طرح اس عمارت کی اینٹیں اور کڑیاں تھیں اسی طرح میرے یہ جذبات بھی اس تعمیر کا حصہ تھے۔ اس گھر کی یادوں میں میری زندگی گندھی ہوئی تھی۔

لیکن اب جب میں اس بکھرتی ریزہ ریزہ ہوتی حقیقت کے روبرو کھڑی تھی تو میں اس طرح ساکت تھی جیسے خاموش پانی کی تہہ میں کوئی پتھر ساکت پڑا ہو۔

جن کمروں میں ایک وقت میں اپنے پاپا اور امی کو ڈھونڈتی پھرتی تھی، جہاں عابدہ پھپھی اور حکیمن بوا کے دامن شفقت میں مجھے پناہ ملی تھی، جہاں زہرا سے اور سائرہ چچی سے میری کھٹ پھٹ رہتی تھی، جہاں اسد اور کمال کے واسطے سے میرے احساسِ رفاقت کی تربیت ہوئی تھی اور سلیم اور زاہد سے بحثیں کر کر کے میں نے اپنے خیالات و عقائد کو آزمایا تھا۔ جہاں میرے دادا اور میرے چچا نے مجھے اپنی مرضی کو ایک ضابطۂ اخلاق کے تابع رکھنے کی تعلیم دی تھی اور جس سے میں نے اپنے خوابوں اور امیر کی محبت کے ذریعے رہائی حاصل کی تھی وہاں، ان کمروں میں، اب اجنبی لوگ آباد تھے۔

جن کمروں میں کبھی سخت پردہ تھا، جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا ان کمروں میں اب اجنبی لوگوں کا بسیرا تھا۔ یہ وہ اجنبی تھے جن کے نام سرکاری فائلوں میں سلیم کے نام کے مقابل درج کیے گئے تھے۔ خانہ بندی اس طرح ہوئی تھی کہ سلیم تارک وطن اور یہ اجنبی حضرات شرنارتھی۔ ان کی یہاں موجودگی اور سلیم کی ان کے سابقہ وطن کی طرف روانگی ایک سمجھوتے کا حصہ تھی جس کے تحت بہت حساب کتاب کر کے افسروں اور سیاست دانوں کا ادلا بدلا کیا گیا تھا۔ باقی رہے وہ ہزاروں لاکھوں لوگ جو بے گھر بے در ہو گئے ان کی بس عددی حیثیت تھی۔ سرکاری فائلوں میں ان کا ذکر اعداد و شمار کے ذیل میں آتا تھا، مگر انسانی دردمندی کے کسی خانے میں ان کا شمار نہیں تھا۔

میں سورج کی روشنی میں کھڑی تھی اور مقفل دروازوں والے بینائی سے محروم اس مکان کے سرد بے مہر سایوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک مجھے کسی بچے کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ایک آیا ایک موٹے سے بچے کو گود میں لادے ادھر آ نکلی تھی۔ وہ یہاں سے گزولنا اٹھا کر لے جانے لگی تھی۔ مجھے اس نے بڑی تجسس بھری نظروں سے دیکھا، اور وہ بچہ ایکدم سے سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے مجھ پہ نظریں گاڑ دیں۔ مجال ہے کہ پھر اس نے ذرا آنکھ جھپکی ہو۔

میں وہاں سے سرک لی۔ مکان کے عقب کی طرف نکل گئی جہاں نوکر چاکر رہا کرتے تھے۔

ٹینس کورٹ میں گھاس پھونس اُگی ہوئی تھی۔ اس کے عقب میں جو شیشے والا پود گھر تھا وہ تو گھورا بنا ہوا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے گملے، کیلے کے تڑے مڑے مرجھائے پتے، بیلن کی شکل کے بدرنگ برتن، بس ایسی ہی الا بلا وہاں پڑی تھی اور خودرو پودے بھی۔

گیراج اور اصطبل خالی پڑے تھے۔ لیکن سرونٹس کوارٹرز سب خالی نہیں تھے۔ اجنبی لوگوں کے نوکروں چاکروں نے مجھے تجسس بھری نظروں سے دیکھا۔ لگتا تھا کہ ان میں سے کوئی لپک کر گیا اور جا کر سنتری کو بتا آیا کیونکہ جب میں یہاں سے باورچی خانے والے باغیچے کی طرف مڑنے لگی تھی تو آخر والے کنارے سے سنتری دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اس رستے پر کتنی گھاس کھڑی تھی۔ وہ رک کے کھڑا ہو گیا اور مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنے لگا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ پھر لڑکھڑاتی بوڑھی ٹانگوں سے تیز تیز چل کر میرے قریب آیا اور خوشی سے چلا اٹھا "لیلیٰ بٹیا!" اس کی آواز کانپ رہی تھی اور پوپلے منہ پر باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"لیلیٰ بٹیا! اسلام۔ تم نے ہم کا بتایو کیوں نہیں کہ تم آوت ہو۔ میں گیٹ پہ آئے کے تم کا سواگت کرتا۔"

"رام سنگھ، مجھے تو خود پتہ نہیں تھا کہ مجھے یہاں آنا ہے۔ اچھا بتاؤ تم کیسے ہو؟ تمہارے بال بچے کیسے ہیں؟"

"بٹیا کیا پوچھو ہو۔ بڈھی کے تو دن پورے ہو چکے تھے۔ میں اب اکیلا ہوں۔ میرا لالا کلکٹر صاحب بہادر کے دفتر میں چپراسی ہے۔ دیوتاؤں کی دیا پہ تو بہوت کرپا ہے۔ پر میں اکیلا ہوں۔ بٹیا، ہم کا پہلے سے پتہ ہوتا تو میں گھروا پہلے سے کھول رکھتا۔" اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں، جن میں اب گڑھے پڑ گئے تھے آنسو ڈبڈبانے لگے۔ "بٹیا، تم کا اس طرح واتو اس گھروا میں نہیں آنا تھا۔ مورے نینن کا آگے تم اس گھروا میں چھوٹی سے بڑی ہوئی ہو۔ پھر تم کا بچے ہوتے، کمال میاں اور سلیم میاں کے بچے ہوتے۔ سارے ہی بالکوں کو پلتے بڑھتے دیکھنا تھا۔ بھگوان تو نے ہم کا اٹھائے کیوں نہیں لیو، موکو یہ دیکھن تھا کہ اب تک جیوت ہوں۔"

میں نے اسے بہت تسلی دی لیکن اس کے آنسو دیکھ کر اور اس کی زبان سے یہ جملے سن کر میرا دل بھر آیا۔ میں مڑ کر اس کے ساتھ گھر کی طرف چلی۔ اس وقت میرے روئیں روئیں میں تھرتھری تھی جیسے ایک ایک روئیں میں جان پڑ گئی ہو۔

اور اب اس گھر نے ایک جیتی جاگتی نشانی کا روپ دھار لیا تھا۔ اس ڈھیر ے ڈھیرے ڈھیے گھر

کے درودیوار میری زندگی کی تصویر بنے ہوئے تھے کہ کس طرح ہم نے ایک خاندان کے طور پر یہاں پورا ایک زمانہ گزارا تھا۔ کس طرح آہستہ آہستہ گزرتے ماہ و سال میں زندگی کا ایک چلن بنا تھا، اور کس طرح چند بھاگتے دوڑتے برسوں میں دیکھتے دیکھتے سارا کچھ ملیامیٹ ہو گیا۔

چودہ برس پہلے کی بات ہے کہ میں نے اس گھر کو سلام کر کے امیر کے ساتھ الگ اپنا گھر بسایا تھا۔ یہ صدی آدھی بیت چکی تھی۔ بلکہ اب تو آدھی صدی کے بھی دو برس اوپر ہو گئے تھے۔ میری بیٹی اس وقت لگ بھگ اتنی ہی بڑی تھی جتنی میں باباجان کی آنکھ بند ہونے کے سمے تھی۔ باباجان کے ساتھ زندگی کا پورا ایک چلن دفن ہو گیا۔ اس گھر نے اس چلن پہ مٹی ڈال کر زندگی کا ایک نیا طور اپنایا۔ وہ طور حامد چچا کے جیتے جی چلا۔ اب سے پانچ برس پہلے جب وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کے ساتھ اس طور کا بھی خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

چودہ برس تو ایسے بیت گئے جیسے چودہ برس نہ ہوں چودہ گھڑیاں ہوں۔ مگر اس سے پہلے والے برس، میرے اللہ! وہ برس اب لگ رہا تھا کہ وہ تو صدیاں تھیں۔ کجا وہ نرم روی جیسے بچہ آہستہ آہستہ پلتا بڑھتا ہے، چھوٹے سے بڑا ہوتا ہے۔ اور کجا اتنا اچانک اور اس قیامت کے ساتھ تبدیلی جیسے دفعتاً ولادت ہوتی ہے یا چشم زدن میں موت آ جاتی ہے۔

دماغ اور حافظے نے کس تیزی سے جھرجھری لی تھی جیسے اچانک دہکتا انگارہ بدن کو چھو جائے۔

کھلے دروازے میں قدم رکھتے ہوئے میں نے کہا "رام سنگھ، اب ذرا مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ میں چودہ برسوں کے اُدھر چھلانگ گئی تھی اور گھر بھر میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔

دوسرا باب

اس گھر کے آثار اور بو باس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ گھر پوری گرمیوں اور پوری برسات خالی پڑا رہا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ جس چیز سے دل میں ہول اٹھتی تھی وہ اس گھر کا سناٹا تھا۔ خالی گھر میں جو ایک پُرسکون خاموشی ہوتی ہے، یہ وہ نہیں تھی۔ یہاں تو کونے کونے میں آوازیں تھرتھرا رہی تھیں جیسے جن کے ہونٹوں سے نکلی ہیں ان کی واپسی کی منتظر ہیں۔ جو تھوڑا بہت فرنیچر حسن پور منتقل ہونے سے رہ گیا تھا اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ ان چیزوں میں زندگی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی جو اب ٹھٹھر کر رہ گئی ہے۔

آگے جب میں صبح سویرے حسن پور سے چل کر یہاں اس غرض سے آئی تھی کہ بکنے سے پہلے اس گھر کو آخری بار ایک نظر دیکھ لوں تو سائرہ چچی پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں۔ ہمارے بیچ جو مستقل ایک کھنچا کھنچی رہتی تھی وہ ان آنسوؤں سے دھل گئی۔ ان کی زبان سے "اگر مگر" اور "ایسا ہو جاتا تو" اور "ویسا ہو جاتا تو" سن کر ان پر مجھے بہت ترس آیا۔ حقیقتوں کو بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ ان سے آنکھیں چرانے سے آخر فائدہ۔

ملک کا بٹوارہ ہونے کے چند مہینے بعد ہی سلیم پاکستان چلا گیا تھا۔ اب یہ ذمہ داری اکیلے کمال کی تھی کہ ماں کے لیے اُسی طور کی زندگی بسر کرنے کا سامان کرے جس کی انہیں اس کے باپ کے مرنے سے پہلے کے زمانے سے عادت پڑی ہوئی تھی۔ ان میں اس حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کا جگرا کہاں تھا کہ کمال کو اب "آشیانہ" بیچنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ انہوں نے ابھی تک اس حقیقت کو قبول نہیں کیا تھا کہ جس دنیا میں وہ رچی بسی ہوئی تھیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی ہے۔ جس طرح کہانی کے بادشاہ سلامت ننگے تھے مگر سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے شاہانہ لباس زیب تن کر رکھا ہے، بس اسی طرح انہوں نے اختیارات و مراعات کا ایک خیالی لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ روایتی ادب آداب نے سب کا منہ بند کر رکھا تھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھیں کہ اختیارات اور مراعات جوں کے توں ہیں اور مرتبہ اب بھی قائم ہے۔ بس انہیں ایک بات کا پتہ نہیں تھا کہ یہ اختیارات، مراعات، مراتب سب ان لوگوں کے تصرف میں ہیں جو کبھی ان کی عنایات کے محتاج تھے۔ ان کی خیالی دنیا کا تانا بانا گھس گھس کر جھونا ہو گیا تھا۔ لیکن انہیں اس سے ایک جھوٹ موٹ کی گرمائی بہرحال پہنچ رہی تھی۔ شکست و ریخت اور گردمنی ان کی آنکھوں کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس خیالی دنیا کے فیض سے آنکھوں کے آگے ایک دھندلکا پھیل گیا تھا جس کی وجہ سے جالے دکھائی نہیں

دے رہے تھے۔ رہائش بدستور "آشیانے" ہی میں چلی آ رہی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ نوکروں چاکروں کی تعداد روز بروز کم ہوتی چلی جا رہی تھی اور اس لیے گھر کو قاعدے قرینے سے رکھنا روز بروز مشکل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ پچھلی شان وشکوت کا منہ چڑایا جا رہا ہے۔ حالات و واقعات پر ان کا کوئی بس نہیں تھا۔ حالات و واقعات جو سنگین سے سنگین تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔

جب کمال کی شادی ہوگئی اور دلی میں اس کی تقرری ہوگئی تو اس کے اخراجات میں اضافہ ہوگیا مگر جائیداد کی آمدنی مستقل کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اب اس جائیداد کی دیکھ بھال کرنے والا تو کوئی تھا نہیں۔ سائرہ چچی نے تو جائیداد کے بل پر بس عیش کئے تھے۔ اس کاروبار کی اونچ نیچ سے تو وہ آشنا نہیں تھیں۔ بیٹے نے جب یہ تجویز پیش کی کہ اخراجات کم کئے جائیں اور آشیانے کو چھوڑ کر کسی چھوٹے گھر میں رہائش اختیار کی جائے تو اس میں انہیں اپنی بہت ہتک نظر آئی۔ ظاہر ہے کہ یہ نکتہ کمال کو بیوی نے سمجھایا تھا اور کمال کی بیوی سے چچی جان شروع ہی سے خار کھاتی تھیں۔ بات یہ تھی کہ ان کے جو خواب تھے، جو تصورات تھے کمال کی شادی ان سب کی نفی تھی۔ اس کا جرم تو مجھ سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس نے تو غیر مسلم سے شادی کی تھی۔۔۔۔۔ مسز واڈیا کی بیٹی سے۔

پیرن واڈیا جب سوئٹزرلینڈ سے اپنے ٹھاٹ باٹ والے سکول سے فارغ ہو کر آئی تھی تو بہت آزاد خیال تھی۔ مگر یہاں اس کی وسیع المشربی نے کٹر قوم پرستی کا روپ دھار لیا تھا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہوتے قوم پرستی ایک فیشن بن گئی تھی۔ یورپ اور امریکہ کے جمال پرستوں اور دانشوروں نے قدیم ہند کے آرٹ اور کلچر کی عظمت کا انکشاف کر ڈالا۔ بس اسی کے ساتھ بمبئی اور دلی کے فیشن ایبل لوگوں پر بھی یہ عظمت منکشف ہو گئی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ جدید ہندوستانیوں نے نیشنلزم کا بس نقاب اوڑھ رکھا ہے اور ان کی ہندوستانیت گویا فینسی ڈریس ہے۔

اپنے گروپ کے اور لوگوں کی طرح پیرن واڈیا نے بھی بیچ بیسویں صدی میں اجنتا کی یاد تازہ کی تھی۔ اس کے لباس، اس کی سج دھج میں بالکل اجنتا والی شان تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ قدیم تہذیب پر وہ بات یورپ والے محاورے میں کرتی تھی۔ بھارت ناٹیم سیکھنے کی بھی کوشش کی تھی۔ جنوب کے ایک آشرم میں بیٹھ کر تھوڑا گیان دھیان بھی کیا تھا۔

مسز واڈیا کی بیٹی کی یہ نرالی حرکتیں، جنہیں وہ جوانی کے سنک سے تعبیر کرتی تھیں، مطلق نہیں بھاتی تھیں۔ خاص طور پر جب دو کھاتی پیتی امریکی لڑکیاں کہ پیرن کی سکول کے زمانے کی سہیلیاں تھیں، اسے لے کر ستیہ کے کھوج میں جنوب کے سفر پر نکل گئیں تو اس پر وہ بہت کڑھیں۔ مگر انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کو کبھی ظاہر نہیں کیا۔ مشفقانہ فقرہ بازیوں ہی میں اس کا کچھ دبا دبا اظہار ہوتا تھا۔

لیکن پھر ہوا یوں کہ دلی میں پیرن اور کمال کی ملاقات ہوئی اور دونوں نے بیاہ رچا لیا۔ ہماری چچی جان کو پتہ چلا تو ان پر تو ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ مسز واڈیا اپنے میاں کے ساتھ نقل مکانی کر کے لندن جا بسیں۔

جب کمال نے مجھ سے اپنے اس ارادے کا ذکر کیا تو مجھے تھوڑا تعجب ہوا تھا۔ سیتا میں اور اس میں ذرا سی بھی تو کوئی مشابہت نہیں تھی۔ مگر ہو سکتا ہے کہ یہی دیکھ کر اس نے اس سے شادی کی ہو۔ وہ تو اس شادی کے معاملے میں ہر ایک سے بغاوت کرنے پر تل گئی تھی۔ ادھر کمال کی صورت احوال یہ تھی کہ احساسِ تنہائی نے اسے مستقل گھیر رکھا تھا۔ ذرا جو اس کیفیت سے اسے کبھی نجات ملی ہو۔

پیرن اگر کمال کو چاہتی تھی تو اس میں تعجب کی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ تو سچ مچ ویسا ہی تھا جیسا بننے کی پیرن کو تمنا تھی۔ وہ ان ساری قدروں کا شدت سے قائل تھا جن کا اس کی وسیع المشربانہ دانشوری تقاضا کرتی تھی۔ گویا جو کمی ایک میں تھی دوسرے کی ذات اسے پورا کرتی نظر آتی تھی۔

بیٹے کی شادی کے دو برس بعد چچی جان کو اس سے بھی زیادہ سنگین صدمے برداشت کرنے پڑے۔ لمبی مقدمے بازی کے بعد زمینداروں کو آخر یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑی کہ ان کے جاگیردارنہ وجود کا خاتمہ بالخیر ہو گیا ہے۔ انہیں تو ہمیشہ اس خوف نے ستایا کہ کہیں انقلاب نہ آ جائے اور ان کی جاگیرداری کا قلع قمع کر دے۔ مگر ان کی جاگیرداری کا قلع قمع انقلاب سے نہیں ہوا، آئینی طریق کار سے ہوا۔

سیکڑوں ہزاروں گھرانوں کے لیے ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ صدیوں سے زندگی کا جو ایک ڈھرا چلا آ رہا ہے اسے کیسے بدلیں، ذہنوں کو جو عادتیں پڑی ہوئی ہیں وہ کیسے بدلیں، جس رہن سہن کے عادی ہیں اسے کیسے بدلیں۔ مسئلہ ایک دو کا نہیں تھا، سیکڑوں ہزاروں زمینداروں اور ان کے سیکڑوں ہزاروں حالی موالیوں کا تھا جو ان کی جائیدادوں پر پل رہے تھے۔ ان کے شوق، ان کی حماقتیں، ان کی دنیا لٹ چکی تھی۔ مراعات چھن جانے کا غم، کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جانے کا اندیشہ۔ اس غم و اندیشہ میں کتنوں کا دماغ چل بچل ہو گیا، کتنے اپنے گانوؤں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئے اور گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔

محلوں، حویلیوں پر ویرانی برسنے لگی۔ دکانیں، مطب، کچہریاں، بالا خانے، سب اپنی موٹی اسامیوں سے محروم ہو گئے۔ شاہی دور کے خاتمے پر بھی اس شہر کو بہت چرکے لگے تھے۔ اب جو نئی خلقت کی یلغار ہوئی اور عمارتیں اندھا دھند بننی شروع ہوئیں تو اس بڑھتے پھیلتے شہر کو کچھ تازہ زخم کھانے پڑے۔

یہ تھا وہ انجام جس کی ہمارے چچا جان نے پیشگوئی کی تھی اور یہ تھا وہ انجام جس کی ہم اپنے نظریوں کے زعم میں بڑے جوش و خروش سے حمایت کیا کرتے تھے۔ موت کی طرح بلکہ ہر تباہی کی طرح یہ بھی اسی قسم کا انجام تھا جسے ذہنی طور پر قبول کرنا آسان ہوتا ہے مگر جب وہ حقیقت بن کر سامنے آتا ہے تو قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اسد نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ ''بدصورتی سے مفر نہیں ہے۔ جب محل ڈھائے جاتے ہیں اور کچے گھر دکھائی دینے لگتے ہیں تو یہ کوئی خوشگوار نظارہ نہیں ہوتا۔ کوئی بھی عمارت ڈھائی جائے گرد تو اڑے گی اور ملبہ تو ہوگا۔ لیکن اسی ملبے سے ہم ایک نئی عمارت تعمیر کریں گے۔''

میں تڑپ کر بولی ''اسد، یہ کتابی بکواس بند کرو۔ یہ جو تمہاری طرح کے لوگ دنیا کو بدلنے کے لیے

نکلتے ہیں ان سب کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ پتھر کے بن جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں کرنی کتنی آسان ہیں، لیکن جب میں اپنے خاندان والوں اور اپنے دوستوں کی پریشانیوں، مایوسیوں اور مادی الجھنوں کا تصور کرتی ہوں تو پھر میں انہیں فراموش کر کے اس صورتحال کو نہیں دیکھ سکتی۔''

وہ بولا ''اگر تم ان لوگوں کا دھیان کرو جنہوں نے مایوسی کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں تو پھر اس صورتحال کے متعلق غیر جانبداری سے بھی غور کر سکتی ہو۔''

''یہ سبق سیکھنا بھی مشکل کام ہے۔''

وہ حیران ہو کر میری صورت دیکھنے لگا ''لیلیٰ، یہ تم سنجیدگی سے کہہ رہی ہو؟ جو کچھ تم مانتی تھیں، یہ باتیں سراسر اس کے خلاف ہیں۔ تم ان لوگوں کی طرح باتیں کر رہی ہو جنہیں تم کبھی بھلے وقتوں میں رجعت پسند کہا کرتی تھیں۔''

کہیں میں اسد سے اس وجہ سے تو خار نہیں کھاتی تھی اور اس پر رشک نہیں کرتی تھی کہ اس کے یہاں فکر و عمل کی یگانگت نظر آتی تھی۔ اور کہیں یہی وجہ تو نہیں تھی کہ وہ جو اس کی چاہت تھی کہ میں اس سے ایسے محبت کروں جیسے گوشت پوست والے آدمی سے محبت کی جاتی ہے، وہ میں نہیں کر سکی۔ میرے لیے وہ ایک مجرد تصور ہی رہا۔ گوشت پوست والے مرد کے طور پر میں نے اسے تسلیم ہی نہیں کیا۔

ہم جب بحث کر رہے ہوتے تھے تو اسی بیچ میں پہچان جاتی تھی کہ میرے جذبات میری منطق کو گھن کی طرح کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ میں پہچان لیتی تھی کہ میں اصل میں چاہتی یہ ہوں کہ کوئی اکھاڑ پچھاڑ نہ ہو، بس آرام سے تبدیل ہو جائے، پیدائش ہو مگر درد زہ کے بغیر۔

سائرہ چچی ایسی کسی ذہنی آویزش میں مبتلا نہیں تھیں۔ ان کا معاملہ تو یہ تھا کہ کبھی پورا پچھلی حکومت کو کوسنے دینے لگتیں، کبھی اُن للو پنجو لوگوں کو کوستیں جنہوں نے جلن کے مارے ایک طبقے کو تباہ کر ڈالا۔ اور کبھی ہم پر برس پڑتیں۔ ہمارا قصور یہ تھا کہ ہم ان سے کہتے کہ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ کوسنے پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اور پھر ایک قانون ایسا آیا کہ اس نے تو ہمیں ڈھیر ہی کر دیا۔ جو مسلمان پاکستان چلے گئے تھے ان سب کو تارکین وطن قرار دے دیا گیا۔ اور طے کر دیا گیا کہ کسٹوڈین ان کا انتظام سنبھال لے گا۔ چونکہ سلیم پاکستان چلا گیا تھا اس لیے جائیداد میں اپنے حصے کے اعلان میں ایمانداری کی حد کر دی کہ توے چمٹے، پیڑھی تپائی تک کی تفصیل گنا ڈالی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے اس بارے میں کسی نے ستایا نہیں ورنہ نچلے کارندوں نے لوگوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ گھروں کی تلاشیاں لیں، گھنٹوں کے حساب سے جرح کی اور بال کی کھال نکالی۔

''آشیانے'' کے ایک حصے کو کسٹوڈین نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہی کچھ حسن پور کی حویلی کے سلسلے میں ہونے کا خطرہ درپیش تھا۔ کمال نے ماں سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں آشیانے کو بیچ ڈالتا ہوں۔ اس سے جو رقم وصول ہو اس سے حسن پور کی حویلی کا سلیم والا حصہ خرید لیتے ہیں۔ اس طرح ہمارے

جدی گھر کا تیا پانچا ہونے سے بچ جائے گا۔

چچی جان نے پہلے تو اس تجویز پر کان دھرنے سے ہی انکار کر دیا۔ انہیں سخت غصہ آیا کہ دنیا کا کیا طور ہے، حکومت کا کیا طور ہے، اور خود ان کے بیٹے بہو کا کیا طور ہے۔ غصہ کر کر کے انہوں نے اپنے آپ کو بیمار کر ڈالا۔ ''جو ہماری چیز ہے اسے اچکنے کا انہیں کیا حق ہے۔ اتنا چھین لینے کے بعد بھی ان کی نیت نہیں بھری۔ ارے کیا یہاں کوئی انصاف نہیں ہے؟ کیا یہ کسٹوڈین لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس طرح وہ دشمن کے مال پر قبضہ کر رہے ہیں؟ پوچھو کہ کیا تم نے خود تقسیم پر رضامندی ظاہر نہیں کی تھی؟ پھر جو لوگ ادھر چلے گئے ہیں ان سے دشمنوں والا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے۔ انہیں تو تم نے خود انتخاب کا حق دیا تھا۔ انہیں ایسی کوئی تنبیہ تو نہیں کی گئی تھی کہ تم اُدھر گئے تو تمہاری جائیداد ضبط کر لی جائے گی اور تمہارے عزیزوں رشتہ داروں کا ناطقہ بند کر دیا جائے گا۔ اور بی بی! اگر یہ لوگ مسلمانوں کو یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں تو صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ یہاں سے لبے ہو۔ لگاتے ہیں سیکولر سٹیٹ کا نعرہ۔ بالکل جھوٹ، منافق کہیں کے، بزدل۔ سلیم نے اچھا کیا کہ یہاں سے چلا گیا۔ کمال، یہ تمہیں برباد کر دیں گے۔ تمہاری طرح کے اور جو احمق ہیں، جنہوں نے ان پر اعتبار کیا ہے، انہیں بھی برباد کریں گے۔ نگوڑے بنتے ہیں نا۔''

کمال نے انہیں ایسے سمجھایا جیسے بچوں کو سمجھاتے ہیں۔ بتایا کہ یہ جو ناخوشگوار قسم کے قاعدے قانون بن رہے ہیں ان سے کوئی مفر نہیں ہے۔ تقسیم کے خلاف جو غصہ ہے وہ حکومت کی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ اسی کے تحت ایسے قانون بن رہے ہیں۔ پھر اس نے انہیں یہ بھی بتایا کہ مسلمان یہاں جتنی جائیداد چھوڑ کر گئے ہیں اس سے زیادہ جائیداد ہندو اُدھر چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہ تو آگ بگولا ہو گئیں اور اس پر برس پڑیں۔ کہنے لگیں کہ اس لڑکے کو نہ اپنی روایات کا پاس نہ ماں کا خیال ہے۔ اس نے تو مسلمانوں کی دشمن حکومت کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے اور ایک کافرہ سے شادی کر لی ہے۔ کمال نے بھی جواب میں کھری کھری سنائیں۔ کہا کہ پھر آپ سلیم کے ساتھ کیوں نہیں چلی گئیں۔ مسلمانوں نے جو جنت بنائی ہے، اس میں جا کر رہی ہوتیں۔

اس پر وہ کیسا بلک بلک کر روئی ہیں۔ یہ تھے ایک بوڑھی بے یار و مددگار عورت کے آنسو۔

بہت تکلیف دہ صورتحال تھی، مگر کمال بھی ان کی حالت کو سمجھتا تھا اور اسی لیے درگزر سے کام لیتا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ تعصب اور حماقتوں کے اس انبار کی تہہ میں ایک گہرا درد چھپا ہوا ہے۔

میں اسی خاموش گھر میں کھڑی تھی جو دیکھتے دیکھتے محض جائیداد کا ایک ٹکڑا بن کر رہ گیا تھا۔ تو میں اس خاموش گھر میں کھڑی اس سارے قصے کو یاد کر رہی تھی اور سارے درد کی کسک کو ایسے محسوس کر رہی تھی جیسے وہ میرا اپنا درد تھا۔

تیسرا باب

میں حامد چچا کے دفتر کا دروازہ کھول کر اندر گئی۔ دیواروں کے برابر برابر جو اونچے اونچے بک شیلف تھے وہ خالی پڑے ہے تھے۔ چنر اچڑھی وہ لمبی چوڑی بھاری میز، اور وہ کرسی، اور ایک گھومنے والا بک کیس، فرنیچر کے نام اب یہی چند تنکے یہاں پر رہ گئے تھے۔

یہی وہ کرسی تھی جس پر بیٹھ کر حامد چچا حکم چلایا کرتے تھے۔ جب آخری بار میری اور ان کی مرضی میں ٹکراؤ ہوا ہے تو وہ اسی کرسی پہ بیٹھے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت کیسی سہمی ہوئی تھی۔ لیکن میں نے پکا ارادہ کیا ہوا تھا کہ اپنے خوف کو ظاہر نہیں ہونے دوں گی۔ میں نے کس طرح دعا مانگی تھی کہ میرا ادھڑ کتا دل ٹھہر جائے۔ بس تصور میں میں نے امیر پر نظریں جمار کھی تھیں، یہ سوچ کر کہ اسی کے سہارے میں اس آزمائش میں پوری اتروں گی۔

''تم نے جو اس نوجوان سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو کیا اچھی طرح سوچ لیا ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''جی۔''

''تمہیں پتہ ہے کہ مجھے اس قسم کے دقیانوسی اعتراضات نہیں ہیں جو تمہاری پھپھیوں کو ہیں۔''

اور میں سوچ رہی تھی کہ روشن خیال معقولیت پسندی کے اس ناٹک کے مقابلے میں اُس مثبت قسم کی تعصب زدہ جذباتی سنگدلی سے آنکھیں چار کرنا کتنا آسان تھا۔

''میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے اس فیصلے سے کس قسم کے نتائج نکل سکتے ہیں۔ یہ نوجوان۔۔۔۔''

وہ اس کا نام کیوں نہیں لے رہے تھے۔

''اس کے اتنے وسائل نہیں ہیں کہ جس قسم کی زندگی تم نے دیکھی ہے، اس کے اخراجات برداشت کر سکے۔''

''میں اپنی قیمت لگوانا نہیں چاہتی۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔''

انہوں نے بس کندھے اچکا دیئے۔ میں نے جو اپنے طیش کا اظہار کیا تھا اسے انہوں نے کس سادگی

سے نظر انداز کر دیا۔ وہ مجھے جھڑ کتے، لعنت ملامت کرتے، تنبیہہ کرتے۔ انہوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ اس سے کہیں ظالمانہ طریقہ اختیار کیا کہ میرے غصے کو خاطر میں نہیں لائے۔ یہ طریقہ میرے لیے زیادہ قاتل ثابت ہوا۔ میں تلملا کر رہ گئی۔

''پروا کرنے نہ کرنے سے ٹھوس مادی حقائق بدل نہیں جایا کرتے۔ میرا مشورہ تمہیں یہ ہے کہ اپنے مستقبل کے بارے میں نابالغوں والے رویئے کو ترک کر دو۔ بالغ نظری سے کام لو۔ تم جو قدم اٹھانے کا ارادہ رکھتی ہو، یہ قطعی قدم ہوگا۔ ٹھیک ہے کہ تم خود اچھی خاصی جائداد کی مالک ہو۔۔۔۔۔''

''اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ امیر نے یہ سوچ کر۔۔۔۔۔''

''اور اس گھر میں بھی تمہارا حصہ ہے۔''

''میں تو اس گھر میں رہنا ہی نہیں چاہتی۔''

''میں تم پر کوئی دباؤ ڈالنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ تمہارے معاملات انصاف کے ساتھ طے کیے جائیں گے۔ اور جس وقت تم پڑھائی سے فارغ ہو گی فوراً اسی وقت تم اپنے معاملات میں خود مختار بن جاؤ گی۔''

''میں یہاں اب مزید رہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ جب تک تمہاری ذمہ داری مجھ پر ہے اس وقت تک مجھے تمہیں کسی اور جگہ رہنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ میری خواہش ہے اور تمہاری بھی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ ہمیں اپنے خاندانی اختلافات کو سرِ عام نہیں اچھالنا چاہیے۔''

''میں کہیں باہر چلی جاؤں گی، کسی اور یونیورسٹی میں۔''

''ویسے تو یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ نوجوان ملازمت کے سلسلے میں اسی شہر میں رہے گا۔ تو ویسے تو تمہارا یہاں سے چلے جانا ہی مناسب ہوگا۔ لیکن شاید یہ ممکن نہیں ہوگا۔''

''آپ اسے ممکن بنا سکتے ہیں۔''

''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تمہاری نظر میں میری مدد کی کوئی وقعت ہے۔ بہر حال اب جو بھی صورت ہے وہ واضح ہو گئی ہے۔ تم جا سکتی ہو۔''

اگر چچا جان یہ بھی کہہ دیتے کہ ہم نے تمہیں عاق کیا، اب تمہیں جائیداد سے حصہ بھی نہیں ملے گا تو بھی شاید مجھے خاندان بدر ہونے کا اتنی شدت سے احساس نہ ہوتا، مگر جس طرح انہوں نے یہ بات کہی اور مجھے کمرے سے رخصت کیا اس سے کس قدر شدت کے ساتھ میرے یہاں یہ احساس ابھرا کہ مجھے خاندان میں سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔

میری شادی کا انتظام سلیم کی شادی کے ساتھ ہی کیا گیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ سلیم کی شادی کی دھوم دھام سے میری شادی کے بارے میں خاندان کی ناراضگی اور سرد مہری پر پردہ پڑ جائے۔

آگے چل کر زمانے نے چچا جان کے غرور کو تھوڑا سا توڑا اور ان سے وہ بیساکھیاں چھین لیں جن کے سہارے ان کے سوشل تعلقات پھل پھول رہے تھے اور اب انہیں انسانی اُنس و محبت کی ضرورت کا احساس ہوا۔ کیونکہ احساسِ تنہائی سے نجات کی واحد صورت اب یہی دکھائی دے رہی تھی۔ ان حالات میں انہوں نے جھجکتے جھجکتے ڈھکے چھپے انداز میں مفاہمت کی کوشش کی۔ میری بچی کو انہوں نے اس کا واسطہ بنایا۔ اس بچی پر وہ اتنی شفقت کرنے لگے جو شاید انہوں نے کبھی اولاد کے ساتھ بھی نہیں برتی تھی۔ امیر کے گزر جانے کے بعد ان کی شفقت میں اور اضافہ ہو گیا۔

مگر خیر اس وقت ان باتوں کو یاد کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

میں بک کیس کو بار بار گھما کر دیکھتی تھی، بالکل اسی طرح جس طرح میں بچپن میں کیا کرتی تھی۔

یہ کمرہ اب سے پندرہ برس ادھر الیکشن کے دنوں میں سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ چچا جان پہلی مرتبہ الیکشن لڑ رہے تھے۔ جب وہ کامیاب ہوئے تو اس خوشگوار موقع پر بھی خیر خواہوں کا اس کمرے میں کتنا ہجوم تھا۔ یہ واقعہ اس کے نو برس بعد کا ہے کہ وہ یہیں اسی کرسی پہ بیٹھے ہوئے کام میں مصروف تھے کہ انہیں دل کا دورہ پڑا۔ انہیں پہلی مرتبہ یہ دورہ پڑا تھا۔ ان نو برسوں میں انہوں نے دھیرے دھیرے اپنے خوابوں کو بکھرتے اور اپنے عزائم کو خاک میں ملتے دیکھا۔

سیاسی اعتبار سے دیکھئے تو وہ ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ ان نئی طاقتوں سے برسرپیکار تھے جو آہستہ آہستہ ان حقوق و مراعات کو، جن میں وہ بہت یقین رکھتے تھے، بڑے بے رحمانہ انداز سے پامال کرتی چلی جا رہی تھیں۔ سماجی اعتبار سے انہوں نے زندگی کے اس چلن کو، جس میں وہ رچے بسے تھے، بکھرتے دیکھا۔ نیا حکمران طبقہ زندگی کے اس چلن کو انگریزوں کی غلامانہ نقالی جانتا تھا اور اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ یہ ایک صورت تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ یہ لوگ بالعموم اس طرزِ زندگی کے رسوم و آداب سے ناآشنا تھے اور آشنا ہونے کا انہیں ایسا کوئی چاؤ بھی نہیں تھا۔

جذباتی اعتبار سے صورت یہ تھی کہ ان کے خاندان کی ان سے دوری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کمال سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے لیکن کمال جس ہمدردانہ انداز میں، بلکہ ایک گرمجوشی کے ساتھ جس طرح زندگی کے بدلتے ہوئے طور کی حمایت کرتا تھا اسے تو وہ پسند نہیں کر سکتے تھے۔ سلیم نے ایک برطانوی فرم میں ملازمت کر لی تھی اور کلکتہ میں جا کر رہنے لگا تھا۔ انگریز رفقائے کار سے اس کی خوب نبھ رہی تھی۔ اس کا ذہن ابھی تک سکول والے رشتوں کا اسیر تھا۔ اپنی بیوی نادرہ سے اسے اس بات پر سو فیصدی اتفاق تھا کہ ہندوستان کے سارے مسائل کا واحد حل یہی تھا کہ اس کا بٹوارہ ہو جائے۔ رہیں سائرہ چچی

تو چچا جان کی ان کے ساتھ ذہنی رفاقت تو کبھی قائم ہو ہی نہیں سکی تھی۔ جو مسائل چچا جان کو پریشان رکھتے تھے ان کے بارے میں چچی جان اپنے ردِ عمل کا اظہار اتنے بھونڈے طریقے سے کرتی تھیں کہ وہ چڑ چڑا جاتے تھے۔ جس دنیا کے وہ باسی تھے وہ دنیا پسپا ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس پر وہ اندر ہی اندر کڑھتے رہتے تھے۔ مگر ہماری چچی جان اپنے سطحی انداز میں اس پر فیصلے صادر فرماتی تھیں۔ ''یہ دھوتی پرشاد لوگ پارٹیوں میں بھی دھوتی باندھ کر جاتے ہیں اور اپنے گندے پاؤں اٹھا کر صوفوں پر بیٹھتے ہیں۔ جب حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو تو پھر کیا توقع کیا جاسکتی ہے۔''

حامد چچا کا مشغلہ اب یہ تھا کہ گارڈننگ کرتے تھے، برج کھیلتے تھے اور اخبار بہت پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی پرانی عادت کے مطابق بحث بھی شروع کر دیتے تھے لیکن اب ان بحثوں کی حیثیت بس ذہنی ورزش کی سی تھی کیونکہ اب تو ان کے لیے اس خوش فہمی کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی کہ حالات کا رخ متعین کرنے میں وہ کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سب نظریات دھرے رہ گئے تھے، دنیا اپنے ڈھب سے بدلتی چلی جا رہی تھی۔

واقعہ یوں ہے کہ ان کی زندگی کے آخری برسوں میں حالات نے تشدد کا رنگ پکڑ لیا تھا۔ امن تو آدمی کا نجی اور داخلی معاملہ بن کر رہ گیا تھا کہ وہ اپنی کوشش سے اندر کا سکون حاصل کر سکتا ہے تو کر لے۔ جنگ شروع ہو گئی۔ ملک پر جاپانیوں کے حملے کا خطرہ منڈلانے لگا۔ خبریں آنے لگیں کہ اسیر سپاہیوں اور افسروں میں سے ہزاروں لوٹ کر انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے ہیں۔ پھر جب 1942ء میں کانگریس کے راہنما گرفتار ہوئے تو انتہا پسند قوم پرست تشدد کی راہ پر چل پڑے۔ پھر فسادات نے زور پکڑا۔ فسادات کی آگ پھیلتی پھیلتی مشرق سے چل کر مغربی علاقوں میں پہنچی۔ وہاں سے شمالی علاقوں کی طرف پھیل گئی۔ یہ آگ بھڑکتی ہی چلی گئی۔ خونیں واقعات کا نقطۂ عروج 46ء میں آیا۔ 47ء میں ملک کی تقسیم ہوئی اور ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں نے آزادی کا جشن ایسے ہنگام منایا جب خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی اور خلقت اکھڑ کر اِدھر سے اُدھر جا رہی تھی اور اُدھر سے اِدھر آ رہی تھی۔

جنگ کے دنوں میں چچا جان بڑی پابندی سے ہر نیوز بلیٹن سنتے تھے اور امکانی حد تک ہر اخبار پڑھتے تھے۔ پھر یہ ان کی عادت ہی بن گئی۔ ہر پارٹی کے لیڈروں اور پروپیگنڈا بازوں کی تقریروں اور بیانات کو پڑھتے تھے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان سے مغلوب ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ لیڈر حضرات ایک طرف برطانوی حکمرانوں سے اور دوسری طرف ایک دوسرے سے سودا بازی میں لگے ہوئے تھے۔ اپنی تقریروں اور بیانوں سے جذبات کو بھڑکاتے تھے اور پھر امن کی اپیلیں کرتے تھے۔ لوگوں کی حمایت میں آواز اٹھاتے تھے اور خون تھا کہ بہے چلا جا رہا تھا اور نفرت کی آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ مگر اس سے ان پر کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔

یہ کھیل اپنی مکروہ انتہا کو اُس وقت پہنچا جب آزادی کے فوراً بعد۔۔۔۔۔اس آزادی کے بعد جس کے لیے چچا جان نے بھی کچھ کام اپنے طریقے پر کیا تھا۔۔۔۔۔نفرت کا آتش فشاں پھٹ پڑا اور آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ مگر موت کے طفیل چچا جان اس منظر کو دیکھنے سے بچ گئے۔ مذہبی رسوم کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین ہوئی اور حسن پور کے قبرستان میں باپ کی قبر کے برابر دفن ہوئے۔

اُس وقت میں کتنی آسانی سے ایک غیر جانب دارانہ رویے کے ساتھ پچھلی باتوں کو دھیان میں لا رہی تھی۔ مگر جس سے یہ سب کچھ بیت رہا تھا تو اس ہنگام ایک غیر جانبدارانہ رویہ اپنانا اتنا آسان نہیں تھا۔ آنے والے کل کا دھڑکا ہمارے ہر فعل، ہر سوچ کا لازمہ بن کر رہ گیا تھا۔

چوتھا باب

بھلے وقتوں میں بیٹھک کے اس کمرے میں آرائش کے کیا کیا تکلفات تھے۔ اب یہاں چند ایک بیکار گرد آلود کرسیاں میزیں پڑی تھیں جو اس کمرے کی وسعت کو اُجاگر کر رہی تھیں۔ خالی ڈھنڈھار وسعت میں سائے ناچ رہے تھے اور میرے قدموں کی چاپ سنگِ مرمر کے فرش سے لے کر بلند و بالا منقش چھت تک ایک گونج پیدا کر رہی تھی۔ یہاں دیواروں پر مصوروں کے جو شاہکار اور آئینے آویزاں تھے، وہ سب حسن پور منتقل ہو چکے تھے۔ یہاں ان کی جگہ اب صرف کیلوں کے نشان باقی رہ گئے تھے۔ اپنے دبیز پردوں سے محروم بلند و بالا دروازے، جو برآمدے اور باغ کی سمت میں نکلتے تھے، بند پڑے تھے۔ ان کی کنڈیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ جب میں بچی تھی تو اس کمرے سے مجھے بہت ڈر لگتا تھا۔ بس اچانک مجھے ایسا لگتا کہ اندر سائے چل رہے ہیں اور بہت شور ہو رہا ہے۔ مگر اس گھڑی مجھے یہاں ان لوگوں کے سائے دکھائی دے رہے تھے جو جیتے جاگتے لوگ تھے۔ جیتے جاگتے لوگوں کے سایوں نے ان خیالی سایوں کو یہاں سے باہر نکال دیا تھا۔

میں یہاں سے جلدی سے نکل کر ڈائننگ روم کی طرف ہولی۔ کھانے کی میز اتنی لمبی چوڑی تھی کہ حسن پور کے گھر کے کمرے میں نہیں سما سکتی تھی اس لیے یہاں پڑی رہ گئی تھی، مگر اس کے گرد جو کرسیاں بھی تھیں وہ غائب تھیں۔ اس میز کے گرد بیٹھ کر کیسی کیسی پر تکلف دعوتیں کھائی گئی ہیں اور کیسی کیسی گرما گرم بحثیں ہوئی ہیں۔ عقیدے، نظریے اور اَنائیں کیسی کیسی تندی تیزی سے آپس میں ٹکرائی ہیں۔ جب ان دھواں دھار بحثوں میں لفظوں کے انبار لگائے جا رہے تھے تو کون جانتا تھا کہ ان لفظوں سے کیا فال نکلے گی۔

اسی میز کے گرد بیٹھ کر خاندان والوں نے وہ آخری بحث کی تھی جس کے نتیجے میں وہ بال آخر تتر بتر ہو گیا۔

اس موقع پر بس زہرا نہیں آئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے میاں کی ان دنوں دتی میں موجودگی بہت ضروری تھی۔ تقسیم سر پر کھڑی تھی۔ اس کے سلسلے میں انتظامی اور بہت ہی عملی تفصیلات پر غور و فکر کرنے کے لیے سرکاری کانفرنسوں کا سلسلہ بندھا ہوا تھا۔ ایک کانفرنس ایسی تھی جس میں زہرا کے میاں کی حاضری لازمی تھی۔ خود زہرا کی مصروفیات بہت تھیں۔ استقبالیوں اور پارٹیوں سے اسے سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی۔

میں نے پہاڑیوں کے بیچ جو اپنا گھر بنا رکھا تھا اسے چھوڑ کر مجھے کمال کے اصرار پر یہاں آنا پڑا۔

وہ یہ چاہتا تھا کہ قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ خاندان والے سر جوڑ کر بیٹھیں اور ان حالات میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ سمجھ لیں۔ اس نے سلیم کو لکھ بھیجا تھا کہ حکومت نے جو یہ انتخاب کا موقع فراہم کیا ہے کہ دونوں ملکوں میں سے کس ملک میں ملازمت کرنی ہے تو بھائی میں نے تو ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ویسے کمال کے بہت سے مسلمان رفقائے کار نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور سلیم نے یہ اعتراض کیا تھا کہ آخر کمال نے کیا سوچ کر یہاں ٹھہرے رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔

آشیانے میں خاندان کا یہ آخری کھانا تھا۔ سب اکٹھے تھے۔ اس کھانے پر جو بحث گرم ہوئی وہ بھی انہی بحثوں کی طرح تھی جو یہاں پہلے بھی کھانے کی میز پر گرم ہوتی رہی تھیں۔ بس اب کے فرق یہ آن پڑا تھا کہ اب کسی کے لیے بھی اس بحث سے فرار کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونا تھا۔ میرے دماغ میں اس وقت یہ بات تھی کہ اس موقع پر جیسے میں حامد چچا کی کمی محسوس کر رہی ہوں ایسے ہی یہاں بیٹھا ہر فرد ان کی کمی محسوس کر رہا ہے۔ کیونکہ میرا احساس یہ تھا کہ اس وقت خاندان کو بکھرنے سے وہی بچا سکتے تھے۔ بس وہ تو اپنا حکم چلاتے۔ اور اگر چہ ان کے حکم چلانے میں کسی منطق کا تو کیا دخل ہونا تھا لیکن اس موقع پر ان کی اپنی جو حکم چلانے والی منطق تھی وہ ہمارے لیے خوش آئند ہوتی۔

سلیم کی گفتگو کا انداز وہی پرانا تھا۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ۔ اوپر سے ناصحانہ انداز بیان۔ لیکن اس وقت اس کی لفاظی سے مجھے بہت تسکین ہو رہی تھی۔ اس سے مجھے خاموش بیٹھے رہنے کی سہولت میسر آ گئی تھی۔ میں نے اس عرصے میں یہ خوب سیکھ لیا تھا کہ اپنی کمزوری کا دفاع بس یہی ہے کہ خاموشی اختیار کر لو۔ اس طریقے کو برتنے کا ایک اثر یہ ضرور ہوا تھا کہ طنز کی حس تیز ہو گئی تھی۔

''مائی ڈیئر کمال!'' سلیم کہنے لگا ''میں آپ کے آئیڈیلزم کی قدر کرتا ہوں لیکن کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ کچھ تھوڑے رومانٹک ہو گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ آپ میں ڈون کوئک زوٹ والی شان پیدا ہو گئی ہے۔ بھائی جان یہ دیکھئے کہ حقائق کیا ہیں۔ مہینے کے اندر اندر انگریز یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ ان کے دور حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔''

میں نے ٹکڑا لگایا ''اور پھر وہ اپنی اصلیت پر آ جائیں گے۔ پھر ٹریڈر بن جائیں گے۔''

اس پہ تو کمال کی بھی تیوری چڑھ گئی۔ خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا۔ سلیم کچھ کہنے لگا تھا لیکن بیچ میں اس کی امی بول اٹھیں۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور ٹھنڈا سانس بھر کے بولیں ''کیا کچھ دیکھنا پڑ رہا ہے اور ابھی اور کیا کیا دیکھنا ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب قیامت قریب آئے گی تو جو رذیل ہوں گے وہ اشراف بن جائیں گے۔''

سلیم نے سنی ان سنی کی۔ بس کچھ ایسا رویہ اختیار کیا جیسے صابر ماں باپ ذہنی پسماندگی کے شکار بچے کی حرکتوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ تو جیسے کسی نے بیچ میں کچھ کہا ہی نہیں۔ وہ پھر جاری ہو گیا ''آزادی ایک

ملک کو نہیں مل رہی۔ دو ملکوں کو مل رہی ہے۔ ایک نیا مسلمان ملک ظہور کر رہا ہے۔۔۔۔۔ پاکستان۔ تو ہمیں محض ہندوستان کو پیش نظر رکھ کر نہیں سوچنا چاہیے۔ ہمارے پیش نظر دو ملک ہونے چاہئیں۔۔۔۔۔ ہندوستان اور پاکستان۔''

نادرہ نے گہرا سانس لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی۔ اسے فتح کے نشے میں سرشار دیکھ کر مجھے اس پہ بہت رشک آیا۔

''اہم سوال یہ ہے کہ سیامی بلی کے جڑواں بچوں میں جو جدائی ہو گئی ہے اس کے بعد ان میں کس قسم کا تعلق رہے گا۔''

میرے اس مذاق پہ کسی نے داد ہی نہیں دی۔ سلیم پھر شروع ہو گیا ''اچھا تصور کریں کہ خراب سے خراب صورتحال کیا ہو سکتی ہے۔ فرض کریں کہ تقسیم ہونے سے پہلے ہی یہ جو جہاں تہاں تشدد کے واقعات شروع ہو گئے ہیں وہ اس کے بعد بھی جاری رہتے ہیں۔ ویسے یہ ہونا تو نہیں چاہیے۔ دونوں طرف سے لیڈروں نے جب تقسیم کے فیصلے کو قبول کر لیا ہے تو ان واقعات کے جاری رہنے کی کوئی منطق نظر نہیں آتی۔''

''سوائے ہمارے اندر بھری ہوئی نفرت کی منطق کے'' میں نے پھر ٹکڑا لگایا ''یاد کرو اژدھے کے دانت والی داستان کو۔''

''خدانخواستہ اگر ہماری نئی نویلی کیسنڈرا بٹیا کے منہ سے نکلی ہوئی منحوس پیش گوئیاں درست نکلیں'' سلیم پھر جاری ہو گیا ''تو پھر تو خانہ جنگی سے بھی زیادہ برے حالات ہوں گے۔ انگریزوں نے صحیح وقت پہ یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے بعد پولیس اور فوج دونوں کی طرف سے ہندو مسلمانوں کے مشترکہ دستوں کو میدان میں آنا پڑے گا۔ وہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے۔''

''اللہ نہ کرے۔ ارے اس جھگڑے کی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں۔'' سائرہ چچی جیسے دہائی دے رہی ہوں ''آخر تم لوگ مار کاٹ اور موت کا ذکر کیوں کئے چلے جا رہے ہو۔ یہ تو بہت بدشگنی کی بات ہے۔'' پھر منہ ہی منہ میں ایسے دعائیں مانگنے لگیں جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔ اب تو روز بروز وہ مغربی طور طریقوں سے بیگانہ ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اصل میں تو انہوں نے اپنے میاں اور اپنے بیٹوں کی خاطر ان طور طریقوں کو اپنایا تھا۔

''دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے'' سلیم نے اپنی انگشت شہادت ہوا میں بلند کی ''سارے معاملات امن و امان کے ساتھ طے ہو جائیں۔ قیادت کی لیاقت کا امتحان تو اسی بات سے ہوتا ہے۔ لیکن معاملات امن و امان سے طے ہو بھی جائیں تو بھی ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے خلاف امتیاز تو بہر حال برتا جائے گا۔''

میں نے کہا" سلیم! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ جو باتیں اظہر من الشمس ہیں ان کی تم وضاحت پہ وضاحت کئے چلے جا رہے ہو۔ بچی بات ہے میں تو اکتا گئی۔ سیدھی بات کیوں نہیں کرتے۔ تم صرف کہنا یہ چاہتے ہو کہ کمال کو یہاں ٹھہرے رہنے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہیں نا؟"

سلیم اس پہ بہت بلبلایا۔ بولا" یہ اتنی سادہ بات نہیں ہے جتنی تم سمجھ رہی ہو۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پوزیشن کی وضاحت تو کرنی چاہیے۔ افراد کی حیثیت سے بھی اور افراد خاندان کی حیثیت سے بھی، یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"یہ ہوئی نا بات" کمال بولا" انفرادی حیثیت سے زیادہ خاندان کے نقطہ نظر سے یہ بات زیادہ اہم ہے۔ خاندان کو بکھرنا نہیں چاہیے۔ اصل میں یہ ہے میرا مسئلہ۔ ہمارے چاروں طرف یہی کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن میری خواہش یہ ہے کہ ہم اکٹھے رہیں۔ اب بھی ہم کبھی کبھار ہی مل جل کر بیٹھتے ہیں۔ اب سوچو کہ اگر تم کراچی چلے گئے تو۔۔۔۔۔"

سائرہ بیچ میں بول اٹھیں" میرے لال! میری موٹی عقل میں تو تمہاری بات آ نہیں رہی۔ ارے بیٹا، سلیم اب کلکتہ میں ہے۔ وہاں سے کراچی چلا جائے گا۔ اس سے فرق کیا پڑے گا۔ اس کا گھر تو یہیں رہے گا۔"

"امی، کاش یہ معاملہ اتنا ہی سیدھا سادہ ہوتا۔ واقعہ اصل میں یہ ہے کہ سلیم دوسرے ملک جا رہا ہے۔ آپ ذرا سمجھنے کی کوشش کریں، اس کے بعد ہم دو مختلف ملکوں کے باشندے ہوں گے۔ ہماری قومیں الگ الگ ہوں گی۔ آپ ذرا اس طریقے سے دیکھیں کہ اب جب ہم ایک دوسرے سے ملنا چاہیں گے تو ہمیں قومی سرحدوں کو عبور کرنا ہوگا۔" اور زہر بھرے لہجے میں ٹکڑا لگایا" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے لیے ہمیں ویزا بنوانا پڑا کرے۔"

"کمال! کیسی باتیں کر رہے ہو۔" سلیم ہنس دیا" آخر اتنا ڈراما پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ویزا بنوانا پڑا کرے گا۔ لو بولو۔"

"سلیم!" کمال نے بہت سنجیدگی سے پوچھا" کیا واقعی تمہارا جانا طے ہے؟"

سلیم جیسے کچھ سٹپٹا گیا ہو۔ اب جو وہ بولا تو لہجہ پہلے جیسا پر اعتماد نہیں تھا" کمال بھائی، میرا معاملہ آپ سے تھوڑا مختلف ہے۔ میری کمپنی مجھے جہاں بھیجے گی مجھے جانا پڑے گا۔"

"کمپنی تمہیں بھیج رہی ہے! کیا اس نے تمہیں کوئی الٹی میٹم دیا ہے؟"

"دیکھئے، معاملہ کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک تجویز ہے کہ میں پاکستان کی شاخ کو جا کر سنبھالوں۔ آپ سمجھیں کہ یہ پروموشن ہے۔ دوسری طرف صورت یہ ہے کہ مجھے ایک طرح سے خبردار کیا گیا ہے کہ تمہارے لیے یہاں امکانات زیادہ روشن نہیں ہیں۔ مجھے فرم چھوڑنی تو نہیں پڑے گی لیکن جتنی مجھے ترقی

کرنی چاہیے وہ میں نہیں کرسکوں گا۔ اور ترقی تو میری ہونی چاہیے اور انشاء اللہ ہوگی۔ مطلب میرے کہنے کا یہ ہے کہ بزنس میں آدمی کو حقائق دیکھنے پڑتے ہیں۔ یہ جو فر میں ہیں یہ تو ہوا کا رخ دیکھتی ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا کہ میرا کیا مطلب ہے۔ سیل کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کو اب یہاں زیادہ گردانا نہیں جائے گا۔ یہ حقیقت ہے، اسے مان لیں کہ یہ فر میں یہاں اس لیے نہیں بنی ہیں کہ انہیں ہماری بہبود کے لیے کام کرنا ہے یا ہماری خیر و عافیت انہیں مقصود ہے۔ مجھے اپنے مستقبل کو دیکھنا ہے۔ اپنی فیملی کو دیکھنا ہے۔ آپ لوگ جو سرکاری ملازمین ہیں انہیں تو آپشن دیا گیا ہے، تحفظات فراہم کئے گئے ہیں۔ آپ دونوں ملکوں میں سے کسی ایک ملک کا انتخاب کر سکتے ہیں اور۔۔۔۔۔''

''بات اس طرح سے نہیں ہے۔ انتخاب کی بات کرتے ہیں تو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ دونوں ملک ہمارے لیے یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ نہیں، دونوں کی یکساں حیثیت نہیں ہے۔ یہ میرا دیس ہے، مجھے اس سے پیار ہے، یہ ہے اصل بات۔ اس میں سودے بازی کا سوال۔۔۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ وہ جیسے گھبرا گیا ہو، اس شک سے کہ کہیں وہ جذباتیت پر تو نہیں اتر آیا ہے۔ اُدھر سلیم کی بھی ایسی کیفیت تھی جیسے اس کی خود اعتمادی میں کچھ کمی آ گئی ہو۔ کہنے لگا'' آپ پر شک کیا جائے گا، آپ کے خلاف تعصب برتا جائے گا، بلکہ نفرت کی جائے گی۔''

''شاید یہ سب کچھ میں بھگت چکا ہوں۔ شاید مجھے تم سے زیادہ پتہ ہے کہ میرے ساتھ کیا گزرنی ہے اور کیا گزر چکی ہے۔ لیکن میرا اپنے دیس میں ایمان ہے۔ مجھے اپنے عقائد کے لیے لڑنا ہوگا۔ تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ میں کبھی تمہارا اہم خیال نہیں رہا۔ جس بات کو میں غلط سمجھتا ہوں اس کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر سکتا۔''

''بھائی کمال! کیا غلط ہے کیا صحیح ہے، اب یہ بحث تو بے سود ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں صحیح ہوں۔ اب بھی اپنے آپ کو صحیح سمجھتا ہوں۔ جو ہوا وہ تو ہونا ہی تھا۔ آدمی کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ آخر مستقبل کے بارے میں بھی تو سوچنا چاہیے۔ نصیر نے پاکستان کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کی ہے۔ اسے معتبر ذریعوں سے یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ اسے وہاں پہنچتے ہی سیکرٹری بنا دیا جائے گا۔ آپ نے یہ سوچا کہ آپ کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔''

''بہر حال میں نے پروموشن کے بارے میں تو نہیں سوچا ہے، نہ اس طرح سوچا ہے کہ میری کھال کیسے بچ سکتی ہے۔ ہاں ملکی وفاداری کے معنوں میں ضرور سوچا ہے۔''

''یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔'' نادرہ بے اختیار بول اٹھی'' آپ کو یہ حق تو نہیں پہنچتا کہ دوسروں کی وفاداریوں پر انگلی اٹھائیں۔ آخر اپنے دین ایمان سے وفاداری کے بھی تو کوئی معنی ہوتے ہیں۔ پاکستان کو ہماری ضرورت ہے۔ ہمیں اس کی تعمیر کرنی ہے۔ اس طرح سے کہ وہاں سب مسلمان محفوظ ہوں اور آزادانہ

زندگی بسر کر سکیں۔"

"بی بی نادرہ! محفوظ آخری کس چیز سے۔" کمال کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے" جبر سے؟ کن لوگوں سے؟ تمہارا خیال ہے کہ یہاں بہت خطرہ ہے۔ لیکن یہاں تو اب بھی لاکھوں مسلمان موجود ہیں۔ ان کی خبر گیری کون کرے گا۔ وہ لوگ جن سے تم نے ہمیں خبردار کیا تھا؟ یا وہ لوگ جنہوں نے تباہی اور قیامت کی پیش گوئیاں کی تھیں؟ کیا وہ لوگ یہاں رہیں گے اور اس مصیبت میں مسلمانوں کے شریک ہوں گے؟ تم شریک ہو گے؟"

میں اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ ایسی صورت میں کہ جذبات اندر ہی اندر ابال کھا کر رہ جائیں، میری یہی کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔ میں دل سے کمال کے ساتھ تھی لیکن بن نہیں پڑ رہا تھا کہ کیسے میں اس کی حمایت کروں۔ یہ بات تو اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ جو آدمی اپنے خیالات و عقائد پہ اڑا ہوا ہو اس سے بحث کرنا بے سود ہے۔

سلیم نے کمال کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی" کمال بھیا، اس بارے میں ہمیں جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ آپ یہی چاہتے تھے نا کہ ہم صاف صاف اپنے دل کی کہہ دیں۔ مانتا ہوں کہ نادرہ کچھ پٹری سے اتر گئی لیکن میں نے بہت غیر جذباتی انداز میں صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اور ہماری اولاد کا تو یہاں بالکل ہی کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔"

کمال نے بہت ضبط کیا۔ شاید اسی ضبط سے اس کی آواز کانپنے لگی تھی" مجھے تو اپنا مستقبل اپنے ماضی میں نظر آتا ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا تھا، یہیں مجھ سے پہلے میرے اجداد، ان کی نسلیں پیدا ہوئی تھیں۔ میری تمنا ہے کہ یہیں مروں، یہیں اپنے بزرگوں کے پہلو میں دفن ہوں۔"

"اللہ نہ کرے" سائرہ چچی چیخ پڑیں" ایسے منحوس لفظ کیوں منہ سے نکالتے ہو۔ مریں تمہارے دشمن۔"

نادرہ روکھے سے لہجے میں بولی" جو بزرگ پہلے پہل یہاں آئے تھے وہ بھی کہیں اپنے گھروں کو چھوڑ کر ہی آئے تھے۔ آخر لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کرتے ہی رہے ہیں۔"

"بس اس سے ہمیں دنیا کے ملکوں ملکوں سیل سپاٹے کرتے رہنے کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔"

میرے اس فقرے پر نادرہ بھنا گئی۔ بولی" ذرا عقل سے بھی کام لینا چاہیے۔ پاکستان ہمارے لیے اس طرح سے نہیں ہے کہ جیسے دنیا کے بہت سے ملک ہیں، ان میں ایک ملک پاکستان بھی ہے۔ اس برصغیر کے لکھوکھا مسلمانوں کے لیے اس کی حیثیت بالکل اور ہے۔"

"اچھا تو پھر ہمیں اپنے بزرگوں کے وطن مالوف کی طرف لوٹ چلنا چاہیے۔ آؤ چلو عرب، ایران، ترکستان کی طرف واپس چلیں۔"

نادرہ تو بپھر گئی "لیلیٰ تمہیں مذاق نہیں کرنا چاہیے۔ تم سب کی طرح مجھے بھی اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق ہے۔ میں پاکستان جانا چاہتی ہوں اور سلیم کی بھی یہی مرضی ہے۔"

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہارے آدرشوں اور سلیم کی ترقی کے امکانات میں خیر سے مکمل ہم آہنگی ہے۔"

نادرہ نے تو طوفان اٹھالیا "تمہیں میرا مذاق اڑانے کا کیا حق ہے۔ تمہارا تو کوئی دین ایمان ہی نہیں ہے۔ تخریبی ذہن ہے تمہارا۔ بس دل کے پھپھولے ہی پھوڑ سکتی ہو۔"

ہم سب ہی ناشادی اور بے یقینی کے بالکل کنارے پہنچ گئے تھے، اور سنبھلے رہنے کی کوشش میں اندھیرے میں ٹٹول رہے تھے کہ کوئی اچھا برا سہارا مل جائے۔

کمال کی صورت پیلی ہلدی ہوگئی۔ ملائم لیکن شکست خوردہ لہجے میں بولا "ارے ہمیں آپس میں تو نہیں لڑنا چاہیے۔ ایسے وقت میں ہمیں لڑنے کی سوجھی ہے۔ اللہ جانے ہمیں آگے چل کر کن حالات سے سابقہ پڑے۔"

اس کے بعد جو ہوا اس کی کون سی ایسی وقعت ہے کہ ذکر کیا جائے۔ ہمارے مستقبل کا فیصلہ تو ہو ہی چکا تھا۔

ابھی دو مہینے بھی مشکل سے گزرے ہوں گے کہ سلیم اور نادرہ پاکستان کوچ کر گئے۔ اس کے بعد ان پر دنیا جہان کے سیر و سفر کے راستے کھل گئے۔ بس ایک جو کبھی ان کا اپنا گھر ہوا کرتا تھا وہاں آنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔

پانچواں باب

ڈائننگ روم سے نکل کر میں نے پینٹری میں قدم رکھا۔ کتنی بے رونق ہو گئی تھی۔ کھڑکی کے شیشے گرد سے دھندلا گئے تھے اور تاروں والی جالی پر، جو اس غرض سے لگائی گئی تھی کہ مکھیاں اور برساتی کیڑے اندر نہ آئیں، مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے۔ سنک والا چائنا پیلا پڑ گیا تھا، کہیں کہیں گھاؤ جیسے نشان بھی پڑ گئے تھے ان جگہوں پر جہاں مہینوں پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ گرتی رہی تھیں۔ کوئی دیکھنے بھالنے والا جو نہ تھا۔ دیواروں پر داغ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے برابر برابر جو الماریاں بنی تھیں ان کے خانے اور کبرڈ خالی پڑے تھے۔

یہاں تو اصل میں غلام علی کا انتظام چلتا تھا۔ یہ انتظام اس وقت تک رہا جب تک وہ نندی کے چکر میں اس گھر سے نکالا نہیں گیا۔ پھر اس کے یہاں تنگی اتنی بڑھی کہ وہ تشدد پر اتر آیا جس کی پاداش میں اسے جیل جانا پڑا۔ میں سوچ رہی تھی کہ غلام علی اب کہاں ہوگا۔ کیا اس نے ہجرت کے سلسلے میں فائدہ اٹھایا۔ یا جس طرح اور بہت سے اپنے کرتوتوں کی سزا سے بچنے کے چکر میں بھاگتے ہوئے پناہ گیروں میں رل مل گئے، اسی طرح اس نے بھی کیا۔

میں نے صحن میں نکلنے والے دروازے کو کھولا تو نیلے صاف شفاف آسمان سے برستی دھوپ سیدھی مجھ پر آ کر پڑی۔

اس گھڑی نندی میرے گھر میں تھی۔ میری بچی کی دیکھ بھال کر رہی ہوگی۔ وہ اب وہ لڑکی نہیں تھی جس نے مردوں کو بہت رجھایا ترسایا تھا اور عورتوں کو بہت اپنا دشمن بنایا تھا۔ اب وہ ایک بھرپور کھلی ڈلی عورت تھی۔ اور یہ کہ کمبخت بہت نڈر تھی۔ غلام علی نے اس کے چہرے پر گھاؤ ڈال دیا تھا۔ اور وہ جو تھتی جوانی میں اس کے جسم کے دلاویز خطوط اور خم تھے اب عمر کے ساتھ ساتھ ڈھل کر بدنما ہو گئے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب وہ کپڑے دھونے والی نوکرانی نہیں تھی، ترقی کر کے آیا بن گئی تھی۔ اس سے وہ عزت دار بن گئی۔ اس عزت داری نے اس کی امنگوں کا گلا گھونٹ دیا اور اس کی ذہنی افتاد کو بدل ڈالا۔

جب خاندان کے خلاف میری جنگ جاری تھی اس پورے عرصے میں اس نے بلاشبہ وفاداری کا حق ادا کیا۔ دوسری نوکرانیاں تو گھر کی مالکن کی نظریں دیکھتی تھیں، اس لیے وہ ان دنوں میرا کام اس طرح کرتی تھیں جیسے میں اس گھر میں کوئی غیر ہوں۔ نندی دوسری انتہا پر تھی۔ وہ باقی کاموں سے کترا کر میرے کام میں

لگی رہتی ۔ وہ تو میرے ساتھ ہی چلنے کے لیے تلی ہوئی تھی ۔ کہتی تھی کہ بٹیا! میں نے ان کا نمک ضرور کھایا ہے پر جنہوں نے تم سے بیر باندھ رکھا ہے ان سے نمک حلالی کیسے کروں ۔ لیکن اپنے بوڑھے شوہر اور باپ کو چھوڑ کر وہ میرے ساتھ ہو لے، یہ میں نے گوارا نہیں کیا ۔ ہاں جب میرے یہاں بچی ہوگئی تو پھر میں نے اسے اپنے یہاں آنے سے نہیں روکا ۔ میں اور کرتی بھی کیا ۔ وہ ایک دن ٹین کا ٹرنک سر پہ رکھے بستر بغل میں دابے میرے گھر میں آن دھمکی اور بولی " بٹیا، میں اپنے ٹھکانے پہ آگئی ہوں ۔ میں اپنی ننھی بٹیا کی رکھوالی کے لیے آئی ہوں ۔ میرے کان میں بھنکوا پڑی کہ تم کسی آیا کو ڈھونڈت ہو ۔ بھلا یہ میں کیسے گوارا کرتی کہ کوئی غیر عورت موری ننھی بٹیا کی رکھوالی کرن لاگے ۔"

نندی اڑوس پڑوس کی آیاؤں کے مقابلے میں سب سے زیادہ طرحدار آیا تھی ۔

میرے گھر آنے کے چند ماہ بعد جب اس نے یہ دیکھا کہ بات اب اور چھپائی نہیں جا سکتی تو اس نے قبول کر لیا کہ وہ پیٹ سے ہے ۔ کس بے تکلفی سے بولی " پر یو مورے خصم سے نہیں ہے ۔ اس نوست مارے بڈھے کھوسٹ سے بھلا ہم کا بچہ ملنا تھا؟ تو بہ کرو جی، وا میں اب کون سا دم رہ گیا ہے ۔ اگر میں گھر میں لگی رہتی تو وا کی مجال تو نہیں تھی پر مورا باپو تو ضرور ہی مجھے گھر وا سے نکال دیتا ۔ یا کیا پتہ ہے جی اس بڈھے گاؤدی کو یہ وہم ہو جاتا کہ اس کی جوانی پلٹ آئی ہے اور کہہ دیتا کہ یہ بچہ میرا ہے ۔ پھر تو میں سدا کے لیے اس کے ساتھ بندھ کے رہ جاتی ۔ ناجی نا، میں اب اسے نہیں سہار سکت تھی ۔ اور بچہ تو ہمکا چاہیے تھا ۔ تو بٹیا میں تمہارے دھورے آئے گئی ہوں ۔ ہمکا پتہ تھا کہ یاں پہ مجھے کوئی جوکھوں نہیں ہے ۔ پر بٹیا یقین جانیو" اس نے جلدی سے ٹکڑا لگایا " میں ویسے بھی تمہارے منہ سے اور اپنی ننھی بٹیا کے لیے یاں پہ آئی ۔"

پھر وہ بڑے غرور کے ساتھ کھڑی ہوئی ۔ بچی کو اپنے پھولے پیٹ سے اوپر اٹھایا اور لہر میں آ کے گنگنانے لگی " موری ننھی منی لالی، موری تارا بیا، موری چند پھولن ۔"

نندی کس کا بچہ پیٹ میں لیے پھر رہی تھی، میرے لیے تو یہ بھید ہی رہتا ۔ وہ تو یہ کہیے کہ اس نے خود ہی مجھے یہ بتا دیا ۔ نندی کے نصیبے کا رشتہ پھیر کھا کر میری سہیلی کے معاملات عشق سے جا ملا تھا اور اس کے چاچا جی کے جو بھاگ جاگے تھے اس سے ۔

جنگ سے اگروال جی کا کاروبار چمک گیا ۔ وہ جو زمین کی تہہ میں چھپے پانی کو ٹوہ لینے والی حس ہوتی ہے وہ قدرت نے اگروال جی کو ودیعت کی تھی ۔ وہ سونگھ لیتے تھے کہ پیسہ کہاں سے بنایا جا سکتا ہے ۔ جنگ کے زمانے میں ان کی یہ حس اور تیز ہوگئی ۔ پیسہ بنانے کا کوئی موقع انہوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا ۔ انہوں نے راجہ بھیم نگر کی حویلی خرید لی تھی جس کا ہمارے چچا جان کو بہت افسوس تھا ۔ اگروال جی کو اس حویلی کے باغ بغیچوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ وہ تو یہ دیکھ رہے تھے کہ ان باغ باغیچوں نے جو زمین گھیر رکھی ہے وہ کتنی وسیع ہے اور کتنی قیمتی ہے ۔ انہوں نے سارے درخت کاٹ ڈالے ۔ لان کے قطعات کو کھدوا ڈالا ۔ حوضوں کو بھروا

دیا۔ اس ساری جگہ میں انہوں نے ایک فیکٹری کے لیے گودام اور سائبان بنوا دیے۔ اس فیکٹری میں فوج کے لیے خیمے، رسیاں اور ڈول تیار ہوتے تھے۔ آگے چڑیوں کی چہک، پھولوں کی مہک اور پھلوں کی سوندھی خوشبو ادھر سے اڑ کر آشیانے میں پہنچتی تھی۔ اب یہاں سے دھاتوں کی کھڑکھڑاہٹ، بھٹیوں کی سنسناہٹ اور مزدوروں کی چیخ وپکار سے اٹھتا شور آشیانے میں پہنچتا تھا۔ کہاں یہ کہ لے دے کے یہاں کوئی درجن بھر مالی تھے اور کہاں اب سیکڑوں کی تعداد میں یہاں لوگوں کی بھرتی ہوئی تھی۔ جہاں سرونٹس کوارٹرز ہوا کرتے تھے اس کے اردگرد اب سیکڑوں جھونپڑے پڑ گئے تھے۔

خود محل اب رہنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ وہ خالی ڈھنڈار پڑا تھا اور اگروال جی اس ادھیڑبن میں رہتے تھے کہ اس جگہ سے زیادہ منافع کیسے کمایا جا سکتا ہے۔

سیتا کی فتوحات میں اب ایک ماہر تعمیرات کا اضافہ ہو گیا تھا۔ سیتا نے فنونِ لطیفہ کے مربی کا روپ دھارا اور ماہر موصوف کو اپنے پروں کے سائے میں لے لیا۔ ان ماہر صاحب کو اپنے ہنر کو دکھانے کا ایک موقع فراہم کیا گیا۔ انہوں نے یہاں فلیٹوں کا ایک سلسلہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کا دوہرا فائدہ تھا۔ ایک طرف شہر کو جدید طرزِ تعمیر سے متعارف ہونے کا موقع مل رہا تھا، دوسری طرف اس کے پتا جی کو پیسہ پیدا کرنے کا نیا ذریعہ فراہم ہونے لگا تھا۔ اس باوقار پرانی طرز کے خوابیدہ شہر میں ایک کثیر المنزلہ عمارت گیراجوں اور دکانوں کی گنجائش کے ساتھ ایک چونکا دینے والی بدعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ ابھی یہ عمارت پایۂ تکمیل کو بھی نہیں پہنچی تھی کہ کلکتے کے دھن دولت والے جاپان کی بمباری کے خطرے سے ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے اور لکھنؤ پہنچنے لگے۔ اور جنگ کے زمانے میں جو نئے نئے محکمے قائم ہوئے تھے ان کے ملازمین بھی یہاں آن دھمکے۔

اب جو یہاں دھوبیوں، مہتروں اور حمالوں کی ضرورت زیادہ ہوئی تو ندی کے باپو اور میاں کے بھی دن پھر گئے۔ میلے کپڑوں کے گٹھر ندی کے گھاٹ لے جانے کے لیے آدمی رکھے گئے۔ بس پھر تو ان دونوں کے پوبارے ہو گئے۔

امریکی بھی شہر میں آن وارد ہوئے۔ وہ جو مال پر دکانوں کا سلسلہ تھا جن کے آگے بھاری ستونوں کی قطاریں کھڑی تھیں اب ان کے بیچ جابجا ریستوران اور ناچ گھر بنتے چلے گئے، جیسے برسات میں کھمبیاں نکل آتی ہیں۔ تانگہ والوں نے اپنے کرائے بڑھا دیے۔ نوکروں چاکروں نے اپنی اجرت میں اضافہ کر دیا۔ اینگلو انڈین لڑکیاں ان نوواردوں پر مرمٹیں۔ وہ تو اس بہانے تصور ہی تصور میں ہالی وڈ پہنچ گئیں۔

بھکاریوں کی چھوٹی چھوٹی ننگ دھڑنگ لڑکیوں لڑکوں کو بھی کولے منکانے آ گئے تھے۔ ''پسلل پیکنگ مما'' کے دھن پر کولہے مٹکانا اور بھیک کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہوئے آنکھ مارنا اور کہنا ''کم آن بیب''۔ شہر کے باقی لوگ اپنی روایتی شائستگی کی روش پر قائم تھے۔

یہ مختصر سا ایک دور تھا کہ آیا اور گیا جیسے اچانک ہوا کا جھکڑ چل پڑے، ندی کی سطح پر لہریں پیدا

کرے اور اس طرح گزر جائے کہ پیچھے اس کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہے۔ ہاں ایک نندی کا استثنا ضرور تھا جس کے اب بچہ ہونے والا تھا۔

''ہائے میں مرگئی! نہیں۔'' نندی اس تہمت پر بہت تڑپی اور سختی سے تردید کی ''نہیں۔ وہ امریکی نہیں تھا۔ تمہیں یہ گمان کیسے ہوا۔ بھلا میں ایسا کر سکتی تھی۔ بھلا میں کوئی ویسی عورتوں کی طرح کی ہوں۔ یہ بندروں کی شکلوں والے گورے سپاہیا، ان کی تو میں کبھی قریب نہیں پھٹکی۔ ان کلموئے گوروں کو تو میں اپنی پینچھل بھی نہ دکھاؤں، بھلے ہی مر جاؤں۔''

اس کا دھنگڑ اصل میں ایک امریکی سپاہی کا اردلی تھا۔ یہ صوبہ سرحد کا کوئی اینٹھے خاں تھا۔ ویسے یہ کوئی اب کی بات نہیں تھی۔ نندی بچپن ہی سے اُدھر سے آنے والوں کی طرف بہت کھنچتی تھی۔ وہ جو پہاڑوں سے لمبے تڑنگے خونخوار صورتوں والے پگڑ باز پٹھان آتے تھے جن کی لمبی لمبی زلفیں اور بڑی بڑی آنکھیں ہوتی تھیں۔ یہاں کے دبو قسم کے لوگوں کو قرضے دے کر انہیں ڈراتے دھمکاتے اور بھاری سود وصول کرتے۔ نندی ان سے خوف بھی بہت کھاتی تھی اور ان کی طرف کھنچتی بھی تھی۔ اور اب وہ اسی طرف کے ایسے مرد سے ملی تھی جو ڈرانے دھمکانے والا کاروبار نہیں کرتا تھا۔ تو اس میں ڈروالی کوئی بات نہیں تھی۔ بس ایک کشش تھی۔ اگر وہ یہاں زیادہ نہ ٹھہرتا تو نندی کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو قابو میں رکھتی۔ مگر وہ ایک پورے پندھرواڑے یہاں رہا۔ نندی تو بس مچل گئی۔ وہ تو اس کے ساتھ بھاگنے پر تیار تھی۔ مگر وہ تھا آوارہ طبیعت، ٹکنا تو جانتا ہی نہیں تھا۔ آج اس مالک کی اردل میں ہے، کل اسے چھوڑ چھاڑ کر کسی دوسرے کی چاکری ہو رہی ہے۔ تو وہ تو اسے نہال کر کے چلتا بنا۔ نندی کے یہاں بھی کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس کے پیٹ رہ گیا تھا۔ وہ اسی میں خوش تھی۔ کہنے لگی ''جیسے یہ میرے لوگن ہیں تا کہ دوسرے کے میلے کچیلے کپڑے لتے دھوتے ہیں، ندی نالوں میں گرمی جاڑے کھڑے رہتے ہیں، ویسا میں اپنے للا کو نہیں بننے دوں گی۔ میں تو اسے سکول میں پڑھاؤں گی۔ کیا پتہ ہے کہ وہ کسی دن کسی بڑے دفتر بابو بن جائے۔''

سو میں نے اس بچے کو جیسوئٹ فادرز کے سکول میں داخل کرا دیا۔ نندی نے تو بس اس کے کلرک ہونے کا خواب دیکھا تھا مگر میں نے سوچا کہ کیا خبر ہے کہ وہ کسی دن سول سروس میں چلا جائے یا پولیس یا فوج میں افسر بن جائے یا پارلیمنٹ کا ممبر ہو جائے۔ آخر اسی سکول سے پڑھ کر کتنے ایسے نکلے جو آگے چل کر اس قسم کے عہدوں پر فائز ہوئے۔

مجھے نندی کا خیال آ رہا تھا اور میں مسکرا رہی تھی۔ اور میرے قدم اس باغ کی طرف اٹھ رہے تھے جس کی دیکھ بھال کرنے والا اب کوئی نہیں تھا۔ بچپن میں نندی اور میں اس باغ میں کھیلا کرتے تھے۔

چھٹا باب

باغ کے ایک گوشے میں ایک فوارہ تھا۔ بچپن میں یہ فوارہ ہمارے لیے اچھا خاصا تفریح کا سامان تھا۔ اس فوارے میں سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی دو مچھلیاں آپس میں لپٹی نظر آتی تھیں۔ ان کے منہ سے پانی کا فوارہ چھوٹتا تھا۔ اس کی پھوار سے ہم خوب چھینٹے اڑاتے تھے۔ مچھلیوں کی یہ شکل جمالیاتی اعتبار سے تو کچھ بھلی نہیں لگتی تھی، مگر بابا جان نے یہ سوچ کر اسے خرید لیا تھا کہ مچھلی ہمارے صوبے کا نشان ہے۔

فوارہ اب خشک پڑا تھا۔ وہاں سوکھے سڑے پتے تھے اور مٹی کی پپڑیاں جم گئی تھیں۔ میں فوارے کے کنارے بیٹھی اردگرد دیکھ رہی تھی۔ سرخ گلاب کی ایک بیل بل کھا کر باغ کی دیوار پہ چڑھ گئی تھی۔ اس باغ میں جس کا اب کوئی دیکھنے بھالنے والا نہیں تھا، سرخ سرخ گلابوں سے لدی یہ بیل زندگی سے کتنی معمور نظر آ رہی تھی۔

بلند و بالا درختوں کے دھوپ سے دمکتے پتوں کے بیچ بیچ سے دیوار کے پرلی طرف دو منزلہ عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ معمولی رہائشی مکان معلوم ہوتے تھے۔ یہ عمارتیں برابر والے اُس احاطے میں نئی تعمیر ہوئی تھیں جہاں پہلے مزدوروں کے جھونپڑے نظر آتے تھے۔ فلیٹوں کے بلاک کے عقب میں اور اس جگہ جہاں پہلے فیکٹری بنائی گئی تھی، اب سیتا کے پتا جی نے سستے قسم کے مکان بنوا دیئے تھے جو قطار اندر قطار کھڑے نظر آ رہے تھے۔ تقسیم کے بعد جب اس شہر پر شرنارتھیوں کی یلغار ہوئی تو انہوں نے یہ مکان ان کے ہاتھ کرائے پر اٹھائے اور خوب پیسہ بنایا۔ اگروال جی اب دھن دولت والے بیوپاری تو تھے ہی لیکن اسی کے ساتھ ان کے سیاسی عزائم بھی خوب پروان چڑھے۔ اب وہ خیر سے وزیر بن گئے تھے۔ انہوں نے کیکڑے کی طرح پنجے ایسے پھیلائے تھے کہ شہر میں ہر سطح پر اور قوت و اقتدار کے ہر ٹھکانے پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔

مجھے اگروال جی کا وہ زمانہ یاد آیا جب انہوں نے ولی الدین کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے حامد چچا کے خلاف سازش کی تھی۔ ویسے تو ان دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا لیکن ایسی جوڑی بنی تھی کہ ان کا الگ الگ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بس ایسا اجتماعِ ضدین تھا جو ہم بچپن میں سرکس میں دیکھا کرتے تھے۔ یہ سرکس سال کے سال شہر میں وارد ہوتا تھا۔ اس میں مسخروں کی ایک جوڑی ہوتی تھی۔ ایک لمبا تڑنگا موٹا تازہ، دوسرا ٹھگنے قد کا چنگا دبلا۔ ہم انہیں دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ ویسے یہ دونوں تو مسخرے نہیں تھے۔ ان کا ہنر یہ تھا کہ لوگوں کی کمزوریوں سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے، تاہم وہ دونوں مثالی شوہر اور مثالی باپ تھے۔

ولی الدین کے یار کو جو کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ ان کے اپنے نصیبے میں نہیں تھی۔ بیچاروں نے ہاتھ پیر تو بہت مارے مگر دال نہیں گلی۔ پاکستان چلے گئے۔ وہاں کسی چھوٹے سے شہر میں جا کر بس گئے۔ وکالت کا پیشہ اپنایا اور گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔ تقسیم کے بعد وہ اچھے خاصے عرصے ہندوستان میں رکے رہے۔ چپکے چپکے جتن کرتے رہے کہ ان کی جو چھوٹی موٹی جائیداد ہے وہ کسی طور بک جائے۔ انہوں نے آزاد ہندوستان سے اپنی وفاداری کا اعلان بڑے ڈرامائی انداز میں کیا تھا۔ اسی چوک بازار میں جہاں انہوں نے اب سے پہلے اپنے اُس وقت کے سیاسی نصب العین کے حق میں زبردست تقریر کر کے سامعین کا دل جیتا تھا، اب انہوں نے ہندوستان سے وفاداری جتائی۔ سرحدوں کے قریب جو خونیں واقعات گزر رہے تھے ان سے مسلمان بہت سہمے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں ان مسلمانوں کو تلقین کی کہ اپنے دیس ہندوستان سے وفادار رہو۔ اور اس کے بعد ایک دن اپنے خاندان کو لے کر چپکے سے یہاں سے سٹک گئے اور سرحد کے اُس طرف نکل گئے۔ مگر انہوں نے اپنے سیاسی عروج کے جو خواب دیکھے تھے وہ سب ملیامیٹ ہو گئے۔ وہاں پہلے ہی سے لوگ اقتدار و اختیار کی کرسیوں پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ سیاسی جوڑ توڑ کی جو غیر معمولی صلاحیت موصوف کو ودیعت ہوئی تھی وہ ان کے کسی کام نہ آئی۔ جن علاقوں میں جا کر انہوں نے لیڈر بننے کی کوشش کی ان علاقوں کے اپنے سپوتوں کے سامنے ان کی ایک پیش نہ گئی۔ ان کے سابق رفقائے کار سے وہاں اور کچھ نہ بن پڑا تو کم از کم سفیر ہی بن گئے۔ یہ حضرت سفیر بھی نہ بن سکے۔ بس انہیں اپنی جائیداد کی آمدنی ہی پر قانع ہونا پڑا۔ خیر یہ جائیداد بھی بہت بڑی تھی۔ اپنے بیان کے مطابق جتنی جائیداد وہ ہندوستان میں چھوڑ کر گئے تھے اس کی تلافی کے طور پر یہ جائیداد انہیں الاٹ ہوئی تھی۔

اگروال جی کا خیال آنے پر تو میں بے مزہ ہو گئی تھی۔ لیکن ان کی بیٹی سیتا کا معاملہ مختلف تھا۔ بچپن کے دنوں میں جو میرا اس کے ساتھ سہیلاتھا اس کی یاد آ گئی۔ اس یاد نے اس کے متعلق بعد کی سب یادوں کو، اس کے ساتھ جب تک کی ملاقاتوں کو ایک لو دے دی۔

جس نئی سوشل زندگی نے اب جنم لیا تھا اس میں سیتا سب سے آگے تھی۔ اہل دل کو اپنے ناز و انداز سے لوٹ لیتی تھی۔ ایسے سوچے سمجھے انداز میں رسم و رواج کو ہدف تنقید بناتی تھی کہ لوگ اس سے متاثر ہو جاتے تھے۔ چوچلے ایسے دکھاتی تھی اور ساتھ میں تھوڑی سی بے رخی کہ یاروں کے دلوں میں گدگدی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کی تو اضع اور اس کی امارت سے بھی یار لوگ مسحور ہو جاتے تھے۔ اور بھی کئی روپ دھارے ہوئے تھے۔ فنون لطیفہ کی سرپرست، بھانک ادیبوں، قلاش آرٹسٹوں کی مربی۔ قدیم فن پاروں کو جمع کرنے کا بھی شوق پال رکھا تھا اور نوجوان عاشقوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی رہتی تھی۔

اس بی بی کے پاس شوہر کے لیے وقت نہیں تھا۔ مگر شوہر نامدار کے اپنے عزائم تھے۔ پینے پلانے اور جوئے کے رسیا تھے اور اس پر خوش تھے کہ دھرم پتنی کے طفیل ان پر ترقی کے دروازے کھل گئے ہیں۔ وہ

اگروال جی کی کمپنیوں کے ڈائرکٹر بنے بیٹھے تھے۔

میاں بیوی نے نئی دہلی میں اپنا گھر بنایا تھا۔ بہت خوبصورت مکان تھا۔ دیکھنے میں بہت جدید لگتا تھا۔ کچھ مغربی طرز کا تھا۔ ہر طرح کی آسائش کا اہتمام تھا۔ مگر آرائش خالص ہندوستانی تھی۔ قدیم رنگ کو اس میں سمویا گیا تھا۔ بس یہ سمجھو لو کہ یہ مکان بالکل سیتا کے کردار کا عکس تھا۔

اس آشیانے میں سیتا کی اور میری آخری ملاقات اُن دنوں ہوئی تھی جب میری شادی ہونے والی تھی۔ پورا خاندان اس شادی کا مخالف تھا۔ گھر اس وقت اسی مخالفت کی فضا میں رنگا ہوا تھا۔ ہم اسی باغ میں آکر بیٹھے تھے، فوارے سے ہٹ کر کہ پھوار ہم پر نہ پڑے۔ تیکھے انداز میں بولی ''لیلیٰ، تمہیں دیکھ کر مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے میری عمر تم سے بہت زیادہ ہے حالانکہ میری تمہاری عمر ایک ہی ہے۔ تم ننھی بی بی بنی ہوئی ہو جو پریم کے رومانٹک قسم کے خواب دیکھ رہی ہے۔ بھلا پریم کا بیاہ سے کیا سمبندھ ہے۔ یہ تو پانی اور تیل کو ملانے والی بات ہوئی۔ ارے پریم تو نٹی ہوشل ہوتا ہے۔ بیاہ کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے بھرم قائم ہوتا ہے۔ یہ دنیا کی چیز ہے۔ میری مثال پہ چلو۔ بیاہ کے معاملے میں مَیں نے ذہن سے کام لیا۔ جذبات کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ تو دیکھ لو سب راضی خوشی ہیں۔''

وہ جو محبت کرنے والے کے یہاں ایک معصوم بچے والی ہٹ ہوتی ہے، بس اسی کا مجھ پہ غلبہ تھا۔ میں نے کہا ''سیتا، مجھے تم سے ہمدردی ہے۔''

اس نے سر پیچھے کی طرف جھٹکا اور کھلکھلا کر ہنسی، اور ناک میں جو اس نے ہیرے کی لونگ پہن رکھی تھی وہ ایسی چمکتی دکھائی دی جیسے شیشے کا کوئی ریزہ جھلملا رہا ہو۔

جس سیتا کو وہ اپنے اندر مار نہیں سکی تھی اس سیتا سے میری ملاقات امیر کے انتقال کے موقع پر ہوئی۔ جب اسے اس سانحے کا پتہ چلا تو وہ ایک پورے دن اور پوری رات کا سفر کر کے میرے پاس پہنچی۔ ان دنوں مجھے چپ لگ گئی تھی۔ بس ان دنوں اس نے مجھ سے اپنی باتیں کیں، وہ باتیں جو اس نے مجھ سے کبھی نہیں کی تھیں۔ اس نے میری حالت کو سمجھ لیا تھا کہ میں تو اس گھڑی اپنے آپ سے کلام کرنے میں غرق تھی کہ جو ساعت سے ماورا تھا اور جس کا کوئی انت نہیں تھا۔ اسی باعث میرے لیے دوسروں سے باتیں کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی طور میرے دھیان کو بنایا جائے۔ اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اس وقت میرے ساتھ کوئی جھوٹی بات نہیں چلے گی۔ تو اس نے مجھ سے کمال کا ذکر شروع کر دیا۔

''جب اس کی منگنی ہوگئی تو مجھ سے بولا کہ بس اب ملاقاتوں کا سلسلہ بند۔ ہاں اور کیا، ہماری ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جب بھی بن پڑتا اور جس جگہ بھی موقع ملتا ہم ملتے تھے۔ میرا بیاہ ہوگیا، اس کے بعد بھی میں اس سے ملتی رہی۔ اس سے دور رہ کر مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے سانس لینا بند کر دیا ہے۔ تمہیں یہ بتاتے ہوئے مجھے کوئی لاج نہیں ہو رہی، کوئی حیا شرم نہیں آ رہی۔ اس وقت بھی نہیں آتی تھی۔ ہاں احتیاط برتتی تھی۔ وہ تو

برتنی پڑتی تھی۔ احتیاط نہ برتتی تو اس سے ملاقات مشکل ہو جاتی۔ اس چھل فریب سے مجھے خود نفرت تھی۔ بہت کڑھتی تھی میں۔ مجھ سے زیادہ وہ کڑھتا تھا۔ سخت نفرت تھی اسے اس چھل فریب سے۔ ویسے میرا خیال یہ ہے کہ اس معاملے میں مرد کا اخلاقی احساس اسے پریشان نہیں کرتا۔ بلکہ وہ جو اس کے یہاں قبضے کا احساس ہوتا ہے اس کے اس احساس کو اس بات سے ٹھیس لگتی ہے۔''

وہ دریچے کے برابر بیٹھی تھی۔ دور پیچھے نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ چہرے پہ میک اپ کے کوئی اثر آثار نہیں تھے۔ چوٹی کے بال پیچھے کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کیا اس کا درد میرے درد کی گونج بن کر باہر آ رہا تھا!

''لیلیٰ! مجھے معاف کر دو، اس وقت میں کلیشے میں باتیں کر رہی ہوں۔ کوئی نئی بات میرے پاس کہنے کے لیے ہے ہی نہیں۔ بس ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں کسی عام سے ناول کی عام سی کردار ہوں۔''

سگریٹ بجھانے کی نیت سے اٹھی۔ پھر واپس دریچے کی طرف گئی اور اس طرح کھڑی ہو گئی کہ اس کا منہ دریچے کی طرف اور پیٹھ میری طرف تھی۔

''اپنے پتی سے میرے یہاں بچے بھی ہوئے، اگر چہ حال یہ تھا کہ جس مرد سے مجھے پریم نہ ہو اس کے چھو جانے سے بھی خود میرے بدن کو گھن آتی تھی۔ لیکن اس کارن سہتی تھی کہ اس کے بعد کمال سے ملنے کی آشا ہوتی تھی۔ جیسے میں اس سے ملوں گی اور پوتر ہو جاؤں گی۔ جب اس نے ملنا چھوڑ دیا تو پھر کچھ بھی ہوا کرے، میری بلا سے۔ اگر میرا بدن بنا پریم، بنا چاہت ایک مرد کو سہہ سکتا ہے۔ ایک دفعہ پریم درمیان سے ہٹ جائے تو عورت مردوں کے ساتھ سونے کے لیے سو بہانے ڈھونڈ لیتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ جتنے اچھے یا برے اور جذبے ہیں اُتنا ہی یہ جذبہ بھی ہے جسے گھن کہتے ہیں۔ اور سچ پوچھو تو اَنت میں جو چیز ہماری یاد میں اٹکی رہ جاتی ہے وہ گھن ہی تو ہوتی ہے۔''

اچانک اس نے رونا شروع کر دیا، مگر بہت خاموشی کے ساتھ۔ اس کا چہرہ ذرا جو بگڑا ہو۔ بس رخساروں پر آنسوؤں کی گنگا بہہ نکلی۔ مڑ کر درشت نظروں سے مجھے دیکھا ''مجھ پہ ترس مت کھاؤ۔ جیسے مجھے زندگی بسر کرنا چاہیے ویسے بسر کرتی ہوں۔ میرے لیے اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔'' پھر سنبھل گئی اور دھیرے سے کہا ''لیلیٰ! آئی ایم سوری۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ تمہارا ذہن بٹ جائے، ترس کھانے سے باز آئے۔ نہ مجھ پہ ترس کھاؤ نہ اپنے آپ پر ترس کھاؤ۔ جو چیز تمہیں ملی وہ تو مل گئی۔ اب وہ کہیں نہیں جائے گی۔ وہ تمہارے خوابوں کا پورا ہونا تھا وہ پورے ہو گئے۔ ایک دفعہ میں نے تمہارا مذاق اڑایا تھا۔ بھلا کیوں؟ اس کارن کہ مجھے پتہ تھا کہ تم ٹھیک کر رہی ہو۔ پر مجھ میں تمہاری والی ہمت نہیں تھی۔''

دروازہ چرر چرر کر کے کھلا۔ جانے کتنے دنوں بعد آج یہ کواڑ کھلے تھے۔ دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی میں اپنے خیالوں کی دنیا سے پلٹی۔ اب میں پھر باغ میں تھی اور دھوپ میں کھڑی تھی۔

بوڑھا چوکیدار آہستہ آہستہ چل کر میرے پاس آیا۔ اس نے بھورے رنگ کا اونی کوٹ پہن رکھا

تھا۔ یہ کوٹ اس کی جاڑوں والی وردی کا حصہ تھا۔

''اے بٹیا! اتنے دنوں تم کہاں پہ رہت رہیں۔ میں نے سوچا کہ آج سارے دروازے کھول دوں۔ کمروں کو کچھ ہوا لگ جائے۔''

''اچھا کیا تم نے۔ میں ابھی سارے گھر کا چکر لگا کر ذرا اپنے پرانے والے کمرے میں جاؤں گی۔''

اس نے ٹھنڈا سانس بھرا ''نا بٹیا نا، خالی ڈھنڈار گھر وا میں تم اکیلی بھٹکتی پھرو۔ نا، یہ نا ئے کرو۔ پر اتنا تو ہوا کہ میرے بوڑھے نین نے ایک باری پھر تم کا دیکھ لیو۔ کمال میاں کبھی کبھار آ جاوت تھے۔ میں ان کے پیر چھو لیا کرت تھا۔ زہرا بٹیا تو یاں سے جائے کے بس ایک باری آئے گئی تھیں۔ بس تھوڑے دن ٹکی تھیں۔ کچھ تم ہی بتاؤ کہ یہ بالک لوگ آ کے بیگم صاحب کے دھورے کیوں نہیں رہوت ہیں۔ یہ کوئی بھلی بات تو نہیں ہے کہ بالک لوگ ماتا لوگ کو بڑھاپے میں اکیلا چھوڑ دیویں۔ ارے اسی سے کے لیے تو ماتا لوگ بچے جنت ہیں اور انہیں پال پوس کے بڑا کرت ہیں۔''

میں نے کہا ''ان کے لیے آنا اتنا آسان نہیں ہے۔''

''آسان نہیں ہے! پر کیوں بٹیا؟ ہمکے تو کوئی بتائے تھا کہ جیسے دیوتاؤں کی کتھاؤں میں دیوتا لوگ آکاش میں اُڑت پھرت تھے بس ویسے ہی اب آدمی لوگن اڑت پھرت ہیں۔ وہ اڑ کے ترنت میں یاں پہ آئے سکت ہیں۔''

اب اس بوڑھے کو کیسے سمجھایا جاتا کہ آنے جانے میں رکاوٹیں صرف زمان اور مکان کی نہیں ہیں۔

''جب انہیں اپنے کام سے فرصت ملے گی وہ یہاں آئیں گے۔'' میں نے اسے سمجھایا ''زہرا بٹیا کے میاں پہ کام کا بوجھ بہت ہے۔ وہ سرکار کے بڑے عہدے پر تعینات ہیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' وہ بولا'' جیسے کمال میاں اور اسد میاں یاں پہ بڑے لوگن ہیں ویسے ہی وہ بڑے ہیں۔ ہیں نا؟''

اسے یہ بھی تو جتاتا تھا کہ کوئی غیر آدمی، چاہے وہ اس گھر کا داماد ہی کیوں نہ بن گیا ہو، اس کے اپنے مالکوں سے بڑی حیثیت کا نہیں ہو سکتا۔ اور پھر وہ مجھے تکنے لگا ''بٹیا! خالی ڈھنڈار گھر وا میں اکیلی نائے بھٹکتی پھرو۔''

میں نے کہا ''میں یہاں تھوڑی دیر اور بیٹھوں گی۔ میں اسد میاں کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں نے انہیں لکھا تھا کہ میں یہاں بارہ بجے پہنچوں گی۔ مگر میں حسن پور سے جلدی چل پڑی۔ تم باہر جا کر ان کا انتظار کرو۔ جب آ جائیں تو انہیں بتاؤ کہ میں یہاں آئی بیٹھی ہوں۔''

میں نے جو اسے اس طرح سے ٹرخایا تو اس سے وہ بہت دکھی دکھائی دے رہا تھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کے بولا ''جو حکم بٹیا کا۔'' اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔

ساتواں باب

سلیم دو سال بعد رخصت پہ آیا تھا۔ اب وہ اپنی فرم کی نئی شاخ میں سینئر حیثیت کے ساتھ افسرانِ اعلیٰ میں شمار ہوتا تھا۔ اس کامیابی نے اس کی خود اعتمادی اور احساسِ برتری پر اور سان رکھ دی تھی۔ اب بھی اس کے وہی تیور تھے کہ نظریوں کی ٹوکری سر پہ رکھی ہے، بمصرانہ شان سے سیاسی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ کیل کانٹے سے لیس بیٹھے ہیں، کوئی مسئلہ ہو تجزیے کے لیے تیار ہیں۔ ہاں ہندوستان پاکستان کے تعلقات پر بات کرنے کے معاملے میں اب اک ذرا محتاط انداز بیان اپنا لیا تھا اور انداز میں ایک معروضیت آ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک برطانوی فرم کے نمائندہ ہونے کے ناطے موصوف نے وہی انگریزوں والا بے تعلقی کا رویہ اپنا لیا ہے۔

جب اس خاندان کے لوگ تتر بتر ہوئے تھے کہ کوئی پورب میں تو کوئی پچھم میں، اُس وقت سے اب تک کیا کچھ نہیں ہو گیا تھا اور ایسا کچھ جس پر انسانیت کو شرم آتی ہے۔ تو اس سب کچھ کے بعد اب جو خاندان کے افراد اکٹھے ہوئے تو ایک طرح سے دوہری خوشی ہوئی۔ اب وہ پہلی والی بات نہیں تھی۔ نفرت، انتقام اور شکوک وشبہات کا جو ریلا آیا تھا اس کے اثر سے اس شہر کی انسانی دردمندی میں رچی بسی شاعرانہ روح بھی آلودہ ہو گئی تھی۔ ایسی فضا میں جب سلیم نے یہ دیکھا کہ اس کے پرانے دوستوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے تو وہ بہت متاثر ہوا۔ حسن پور جا کر جب اسے یہ نظر آیا کہ اس کا اب بھی یہاں ایک جانی پہچانی شخصیت کے طور پر خیر مقدم کیا جا رہا ہے تو اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ وہ تو اب وہاں آباد تھا جہاں اجنبی لوگوں کے ساتھ گزر بسر ہو رہی تھی اور جہاں اس کی حیثیت ایسے فرد کی تھی جس کا جیسے اپنا کوئی جدی پشتی سلسلہ ہی نہ ہو۔

ہم میں سے جن کی جڑیں کٹ چکی تھیں ان کے یہاں بھی، اور جن کی جڑیں نہیں کٹی تھیں ان کے یہاں بھی، یہاں آ کر جڑوں کا احساس بڑی شدت سے اُبھرا، اُسی طرح جس طرح منقطع ہو جانے والے اعضا میں، جہاں سے وہ کٹتے ہیں وہاں ٹیس اٹھتی ہے۔ کافی برسوں بعد ہم حسن پور میں اکٹھے ہوئے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ جو بزرگ آسودۂ خاک ہیں ان کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھی جائے۔ جو چند ایک ابھی بقیدِ حیات ہیں ان کی خدمت میں آداب بجا لایا جائے۔

درخت اور کھیت تو اب بھی ویسے کے ویسے ہی تھے، لیکن مکان اور باغات خاندان کے زوال کی

چغلی کھا رہے تھے۔ تنسیخ زمینداری کے قانون کا سایہ جائیداد پہ منڈلا رہا تھا۔ پھر بھی کتنے بہت سے دیہاتی ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ وقت، جس کا آنا ٹھہر گیا تھا، ابھی دور ہے۔

نادرہ اب بیچی پڑ گئی تھی مگر اپنے میاں سلیم سے ذرا مختلف انداز میں۔ وہ جو شروع جوانی میں اسلام نشاۃ الثانیہ کے باب میں جوش و خروش تھا اس میں اب وہ شوراشوری نہیں تھی۔ اس نے بدل کر اب اپنے نئے ملک سے والہانہ وابستگی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اب وہ نیا ملک ہی اس کے آدرشوں کی علامت بنا ہوا تھا۔ وہ اب ایک ایثار پیشہ سماجی کارکن تھی اور ان غریب مہاجروں کے لیے کام کر رہی تھی جن کی حالت سخت قابل رحم تھی اور جو لکھوکھا کی تعداد میں سرحد پار کر کے اس ملک میں پہنچے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر اس نے اغوا اور زنا بالجبر کی ماری ہوئی عورتوں کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ مصائب و آلام کو اس نے بیچ بیچ دیکھا تھا اور اتنا دیکھا کہ اب لیڈروں کے جذباتی نعروں پر اعتبار کرنے کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔ اس کے یہاں اب ایک دردمندی آ گئی تھی جس سے مزاج کی ساری تلخی جاتی رہی تھی۔

جو یہاں سے چلے گئے تھے اور جنہوں نے یہیں رہنا منظور کیا تھا ان دونوں ہی کے یہاں بحث مباحثے سے گریز کی خواہش نظر آ رہی تھی۔ کیا وہ اور کیا تم، دونوں ہی اپنی اپنی جگہ۔ بہت مشکل صورتحال سے دو چار تھے۔ سو اب بحث مباحثہ ہمارے لیے ذہنی آزمائش کا مشغلہ نہیں رہا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آیا جب ہمیں اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ہم رنجیت کے ساتھ اس کے کلب گئے ہوئے تھے۔ رنجیت میں ذرا بھی تو تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسی طور یاروں کا یار اور زندگی کی لذتوں مسرتوں کا رسیا، اگرچہ اس کی نجی زندگی کوئی ایسی خوشگوار نہیں تھی۔ شادی اس کی کسی راجوں کے خاندان کی کسی خوبصورت سی لڑکی سے ہوئی تھی۔ تھی تو وہ بہت طرحدار لیکن تعلیم کے نام صفر تھی۔ بعد میں یہ بھی پتہ چلا کہ اس میں ایسا جسمانی نقص ہے کہ اس کے یہاں حمل نہیں ٹھہر سکتا۔ رنجیت کی ماتا جی نے بہت زور دیا کہ پُت دوسرا بواہ کر لے کہ پتر ہو اور گھرانے کا نام چلے۔ پانچ سال تک وہ ٹالتا رہا، مگر ہوا یہ کہ بانجھ ہونے کے کارن اس عورت کو اپنی کمزور پوزیشن کا احساس ستانے لگا۔ اس احساس نے شکوک و شبہات کو جنم دیا۔ بڑھتے بڑھتے بات اس حد تک پہنچی کہ وہ رنجیت کے ساتھ بدتمیزی پر اتر آئی۔ وہ فیل مچائے کہ جس بات کا اسے اندیشہ تھا وہ ہو گئی۔ رنجیت نے اسے میکے چلتا کیا اور اپنی ماں کی پسند کی ایک دیہاتی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس سے اس کے یہاں لگاتار پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

اس شام کلب میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ رنجیت نے اس کی توجیہ یہ کی کہ کلب میں زیادہ لوگ اُن راتوں میں زیادہ ہوتے ہیں جب یہاں ناچ کا پروگرام ہوتا ہے اور جب ہنکو کا پروگرام ہوتا ہے۔ اور جب اس نے ہنکو گانے کی نقلیں شروع کیں تو ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

ہال میں اس قسم کے چھاپوں والے پردے آویزاں تھے جو انگریزوں کے زمانے کی یاد دلاتے تھے۔ برابر والے کمرے میں تو بہت لوگ تھے۔ لیکن بار میں یہی کوئی...... آدمی ہوں گے۔ ہم آتش دان کے قریب ایک میز پہ بیٹھے تھے اور بیتے دنوں کی باتیں کر رہے تھے جس سے ہمارے یہاں ایک حرارت پیدا ہو گئی تھی۔

بار میں چار آدمی اونچے سٹولوں پر بیٹھے پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک باقی دوسروں سے الگ تھلگ بیٹھا خاموشی سے پی رہا تھا۔ سر پر بھدے نیلے رنگ کی پگڑی تھی۔ داڑھی بتا رہی تھی کہ عمر ابھی زیادہ نہیں ہے۔ بیچ بیچ میں وہ سٹول پر گھوم کر ہمیں گھورنے لگتا۔ اس کی اس حرکت سے مجھے بے کلی ہونے لگی۔ میں نے رنجیت سے پوچھا "یہ جو نیلی پگڑی والا آدمی ہے، تم اسے جانتے ہو؟"

"وہ کوئی شرنارتھی ہے۔ فسادات میں اس کا سارا خاندان مارا گیا۔ سچ پوچھو تو اب یہاں کم ہی لوگوں کو جانتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ شاید ہی کوئی ہوتا جسے میں نہ جانتا ہوتا۔ سلیم یار، تم چلے گئے۔ تمہاری جگہ یہ لوگ آ گئے۔ ویسے تو ادلے بدلے میں کوئی ہرج نہیں ہے لیکن تم لوگ جاتے جاتے ہماری زبان، ہمارے ادب آداب کو بھی ساتھ باندھ کر لے گئے۔ بدلے میں ایسی کریہہ آوازیں ملی ہیں کہ سماعت پہ بار گزرتی ہیں اور ان ادب آداب کے بدلے وہ طور طریقے جن سے روح کو اذیت پہنچتی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ امید تو یہی ہے کہ ہمارا شہر اپنا پرانا جادو جگائے گا اور شمال سے آنے والے ان خوفناک لوگوں کو اپنے دام میں ایسا پھنسائے گا کہ وہ بھی اپنے ہی بن جائیں گے۔"

نیلی پگڑی ایک دفعہ پھر ہماری طرف گھومی اور پھر گھوم کر ہماری طرف پشت کر لی۔ پشت لگتا تھا کہ اینٹھی جا رہی ہے۔

کمال مسکرا کر بولا "آؤ اس شہر کے نام کا ایک جام پئیں جہاں ہماری نال گڑی ہے، جہاں لوگ محض اس لیے نہیں لڑتے کہ لڑنے میں جھنجھٹ بہت ہے۔ اور پھر ایسے میں کہ سورج سر پہ ہو اور شطرنج کی بازی جلدی نمٹانی ہو، لڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ ایک جام اس جذبے کے نام کا بھی ہو جائے جسے لوگ تحقیر سے پوتی پن کہتے ہیں، لیکن یہ شہر اس جذبے کو برقرار رکھے گا کہ یہ تو اس کے مہذب ہونے کا ضامن ہے۔"

میں نے کہا "وہ ہماری باتیں سن رہا ہے۔"

"ارے کیوں نہ سنے۔" رنجیت نے قہقہہ لگایا۔ "ایسی ظرافت اور حکمت کی باتیں اسے اور کہاں سننے کو ملیں گی۔ میں اسے یہیں کیوں نہ بلا لوں کہ آؤ ہمارے ساتھ بیٹھو۔ آخر ہمارے شہر کی اپنی ایک مہمان نوازی کی روایت ہے کہ اجنبیوں سے بھی ایسے ملتے ہیں جیسے وہ شناسا ہیں اور جو شناسا ہے وہ یار عزیز ہے۔"

"رنجیت، میں تمہارے نام کا جام چڑھاتا ہوں کہ تم اس روایت کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔" سلیم مذاق کرنے لگا "خوشی کا مقام ہے کہ تم اتنے پوتی ہو کہ اپنی سیاسی وابستگیوں کو یاد رکھنے کا بھی خنا نہیں پالتے۔ تو

بجائے یہ کہنے کے کہ ''غدار، واپس جا'' کہتے یہ ہو کہ ''خوش آمدید یار عزیز''

رنجیت کا لہجہ اچانک گمبھیر ہو گیا۔ بولا ''جو غدار ہو گا اس نے تو بے شک یہی کہوں گا کہ ''غدار'' واپس جا، چاہے وہ میرا جگری یار ہی کیوں نہ ہو۔''

نیلی پگڑی پوری گھوم گئی، اور نفرت اور غصے سے تمتماتی ایک آواز بلند ہوئی ''یہ سب بالاڈی غدار ہیں۔ ہر بالاڈی مسلمان اندر سے غدار ہے۔''

لمبے بھر کے لیے ایک سناٹا چھا گیا۔ غضب ناک گالیوں سے لبریز لمحہ۔

کمال کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اٹھ کر وہ اس نوجوان کی طرف چلا۔ ''میں گدی سے تیری زبان کھینچ لوں گا۔''

رنجیت بھی اس کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ غصے سے کہہ رہا تھا ''کمال یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ اس نے تمہاری نہیں میری توہین کی ہے۔''

دیکھتے دیکھتے وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ایک ہبڑ و بڑ مچ گئی۔ سفید وردیوں والے جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے۔ ان کے چہرے پیلے ہلدی ہو گئے تھے۔ نیلی پگڑی والا ایسا اڑن چھو ہوا کہ پھر دکھائی ہی نہیں دیا۔ یہاں اکٹھے ہو جانے والے اجنبی لوگ شرمندہ سے نظر آ رہے تھے۔ پھر چھٹنے لگے اس انداز سے جیسے معذرت کر رہے ہوں۔

سلیم اور نادر تو سناٹے میں آ گئے۔ انہیں اچانک احساس ہوا کہ وہ تو یہاں اجنبی ہیں اور ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک کمال کا اور میرا تعلق تھا تو ہم تو ایسے واقعات کو اپنے لیے چیلنج سمجھتے تھے اور ان سے نبٹنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ انہوں نے ہماری وفاداری ایمان کے جوہر کو خوب جانچا پرکھا تھا اور ایسے وقت میں جانچا پرکھا تھا جب ساری اقدار کے جسد میں زہر پھیل گیا تھا۔ اس سے پھوٹ چھوٹ کے ایسا مادہ نکل رہا تھا جو جھوٹ اور موقع پرستی سے عبارت تھا۔

زہرا جب اپنی باری پر یہاں آئی تھی تو اس نے تو اتنا محسوس نہیں کیا تھا جتنا نادرہ محسوس کر رہی تھی۔ زہرا جس دنیا میں رہتی تھی وہ تو ایک محفوظ دنیا تھی۔ اس میں اتنی لچک تھی کہ جس سوسائٹی میں بھی اسے رہنا پڑتا اس کے آداب کو اپنا لیتی تھی اور اس شدت سے ان کی حمایت کرتی تھی کہ مجال ہے اس کے رویے میں ذرا بھی لچک آ جائے۔ دنیا کے جس صدر مقام میں بھی جاتی اپنے میاں کے افسرانہ عروج کے تقاضوں کے مطابق سارے مراحل بڑی سہولت سے طے کر لیتی۔ وہ اب بھی بہت شفیق اور پیاری خاتون تھی۔ نیکی کرنے کے لیے تو ہمیشہ تیار رہتی تھی۔ سماجی خدمت اور بہبودیِ نسواں کی کوئی بھی سرکاری منظور شدہ کمیٹی ہو وہ اس کی ممبر بن جاتی تھی۔ سائرہ و پچی سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ سائرہ و پچی کے لیے تو وہ آئینے کا کام دیتی تھی۔ اس آئینے میں انہیں اپنی شکل نظر آتی تھی، وہ شکل جس کا عمر نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

زہرا کو بلانے کے لیے اُس وقت خط بھیجا گیا تھا جب خیال تھا کہ ماجدہ پھپھی آخری دموں پہ ہیں۔

مگر وہ ناتواں خاتون زندگی سے اس طرح چمٹی ہوئی تھی کہ موت بھی بار بار اس سے مات کھا جاتی تھی۔ لگتا تھا کہ پھپھی جان نے اپنی طویل بیماری کے برسوں میں موت کو ٹخل دینے کے سارے گر سیکھ لیے ہیں۔ ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اپنی جانی پہچانی دنیا کو چھوڑ کر زہرا کے پاس جا کر رہیں۔ اُدھر زہرا بھی بار بار یہاں کا پھیرا نہیں لگا سکتی تھی۔ اول تو دونوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت پر بہت پابندیاں تھیں۔ پھر زہرا کو یہ دھڑکا بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں اس کے ہندوستان کے روز روز کے پھیروں سے اس کے میاں کی ملازمت پہ برا اثر نہ پڑے۔ بہر حال بس ماں کے خیال ہی سے اسے یہاں آنا پڑتا تھا۔ ویسے اسے یہاں آنے کا ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ جو نو مسلموں میں ایک جوش و ولولہ ہوتا ہے کچھ اسی قسم کے جوش ولولہ کے ساتھ اس نے اس سرزمین کو جہاں اس کی نال گڑی تھی خیر باد کہا تھا۔ تو اگرچہ میں اس سے ملنے کی غرض ہی سے حسن پور آئی تھی لیکن ہوا یہ کہ پہلے تو ٹوٹ کر ملے کہ جدائی کے بعد دوبارہ مل رہے تھے، اس کے بعد ہمارے اختلافات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ لیکن اب ہمارے اختلافات کی نوعیت وہ جوانی کے دنوں والی نہیں تھی۔ اس وقت تو بس نقطۂ نظر کا اختلاف تھا۔ اب اختلافات ہماری زندگیوں میں سرایت کر گئے تھے اور زیادہ وسیع اختلاف و افتراق کے آئینہ دار تھے۔ ہوتے ہوتے آخر ہماری لڑائی ہو گئی جو ہونی ہی تھی۔ اور ویسے تو رخصت ہونے سے پہلے ہم نے میل ملاپ کر لیا، لیکن مجھے محسوس ہوا تھا کہ جن رشتوں نے خاندانوں کو صدیوں تک باندھ کر رکھا تھا وہ اتنے ڈھیلے ہو گئے ہیں کہ اب ان میں پختگی ممکن نہیں۔

بات اس طرح شروع ہوئی کہ ایک دن وہ اس پر بہت برہمی کا اظہار کر رہی تھیں کہ یہاں آ کر تھانے میں اپنی نقل و حرکت کا اندراج کرانا ہوتا ہے۔ اس میں اسے تذلیل کا پہلو نظر آ رہا تھا۔ کہہ رہی تھی کہ "جیسے ہم کوئی مجرم ہیں یا جاسوس ہیں۔" اور میں اسے چھیڑ رہی تھی کہ بی بی تم نے بھی تو یہاں آ کر ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ جیسے تم کسی دشمن علاقے میں آ گئی ہو۔ ہر قدم پر تم چونکتی ہو کہ کوئی خفیہ والا تو پیچھا نہیں کر رہا۔

اس پر اس نے بڑے طنز بھرے لہجے میں کہا "لیلیٰ بی بی، تم تو خیر سے ایک پہاڑی سیرگاہ میں اپنے محفوظ گوشے میں بیٹھی ہو اور ہمارا مذاق اڑاتی ہو۔ ہمارے دل سے پوچھو۔ ہمیں حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں کوئی بہت عاقل تو نہیں ہوں لیکن غریب لوگوں اور پناہ گزینوں میں رہ کر کچھ خدمت کے کام کئے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو لوگ آگ سے گزرے ہیں ان کی بپتا سنی ہے۔ ذرا اپنی بچی کو بڑا ہو لینے دو، پھر تمہیں پتہ چلے گا۔ اس وقت تو تم یہ دیکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو کہ تمہاری مسلم ثقافت اور زبان کے ساتھ کیسی ناانصافی ہو رہی ہے، کیسا تعصب برتا جا رہا ہے، کس طرح اسے تباہ کیا جا رہا ہے۔ جب خیر سے تمہاری بچی بڑی ہو جائے تو یہ لحاظ رکھنا کہ وہ اپنے ورثے سے بیگانہ نہ رہے۔ یہ تمہارا فرض ہے۔"

پتہ نہیں مجھے جھنجھلاہٹ کس بات پہ زیادہ ہوئی۔ شاید اس بات پہ کہ مجھے اپنی بچی کے سلسلے میں ذمہ داریوں کا درس وہ بی بی دے رہی تھی جسے یہ پتہ ہی نہیں کہ اکیلے زندگی بسر کرنے اور بغیر کسی سہارے کے اپنے

معاملات کی خود دیکھ بھال کرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ یا شاید اس بات پر کہ وہ مجھے طعنہ دے رہی تھی کہ میں حقیقت سے منہ چھپا کر کسی محفوظ گوشے میں جا بیٹھی ہوں۔

تشدد اور قتل و خون کا خوف، عصمت دری کا خوف، ناک کان اور چھاتیاں کاٹے جانے کا خوف، میں اسے سارے خوف سے گزری تھی۔ سرحد پار کر کے ان لوگوں کے غول کے غول چلے آ رہے تھے جو انتقام کی آگ میں جل رہے تھے، جنہیں نفرت نے اندھا کر دیا تھا۔ میں پہاڑیوں میں جس محفوظ گوشے میں بیٹھی تھی، یہ غول اس طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے اور میں خوف سے کانپ رہی تھی۔ اگر ان پہاڑیوں میں کوئی آتش فشاں پھٹ پڑتا اور یہاں کے قدیم جنگلوں میں سے درندے نکل پڑتے تو بھی مجھ پر اتنی دہشت طاری نہ ہوتی جتنی اس اندیشے سے ہو رہی تھی کہ آدمی نام کے درندے کہیں مجھ پہ اور میری بچی پہ نہ ٹوٹ پڑیں۔

میں ان لوگوں کے خوف میں بھی برابر کی شریک تھی جو وادیوں سے نکل نکل کے بلندیوں کی طرف بھاگ رہے تھے، اُن لوگوں کے خوف میں بھی جو ان دنوں خصوصی طور پر نمازیں پڑھتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ یا اللہ ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھ، اور اُن لوگوں کے خوف میں بھی جن کے گھروں پر نشان لگائے جاتے تھے کہ یہ مسلمانوں کے مکان ہیں۔

مجھے ایسی جھنجھل آئی کہ بس میں طعن و تشنیع پر اتر آئی "زہرا بی بی، تم اُس وقت کہاں تھیں جب پوری پوری رات میری آنکھوں میں کٹ جاتی تھی اور دیکھتی رہتی تھی کہ بستیوں میں آگ لگ رہی ہے۔ ایک بستی، پھر دوسری بستی، پھر تیسری بستی۔ اور آگ ہمارے گھر کے قریب آتی چلی جاتی۔ تم تو اس وقت اپنے آرام دہ مکان میں پڑی سنا رہی ہوگی۔ پہریدار اور پولیس کے سپاہی دروازے پہ کھڑے پہرہ دے رہے ہوں گے۔ پتہ ہے مجھے اور میری بچی کو اس آفت سے کس نے بچایا؟ سیتا نے۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گئی۔ بیچاری نے ہمارے ساتھ اپنی جان کے لیے بھی خطرہ مول لے لیا۔ ہاں اور رنجیت نے۔ اسے کہیں سے پتہ چلا کہ پہاڑیوں میں کیا قیامت گزر رہی ہے۔ اسے میری طرف سے اندیشہ ہوا۔ بیچارہ اپنے گاؤں سے چل کر دوڑا ہوا آیا اور ہمیں اپنی کار میں بٹھا کر واپس چلا۔ سارے رستے اس نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے ہم اس کے گھر کے لوگ ہیں۔ اگر کہیں پتہ چل جاتا کہ ہم کون ہیں تو بس گئے تھے جان سے۔ بی بی، تم اس وقت کہاں تھیں؟ کیا کر رہی تھیں؟ ہاں تم تو اس وقت ان یتیم بچوں میں، جن کے باپ قتل ہو چکے تھے اور ماؤں کی عصمتیں لٹ چکی تھیں، مٹھائی تقسیم کر رہی تھیں اور تصویریں کھنچوا رہی تھیں۔"

وہ سخت احتجاج کرنے لگی لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ بس میں اس وقت رواں تھی "کچھ تمہیں پتہ ہے کہ جن کی مدد کو کوئی سیتا نہیں پہنچی، کوئی رنجیت نہیں پہنچا ان کی جانیں کس نے بچائیں؟ کہاں تھے اس وقت ان کے راہنما؟ وہ تو اپنی جان بچا کر سرحد کے اس طرف چلے گئے تھے۔ اب تو انہیں بچانے والے وہی ہندو تھے جن کے خلاف وہ زہر اگلا کرتے تھے۔ تمہیں کیا پتہ کہ "ذمہ داری" کا کیا مطلب ہے اور "فرض" کے

کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خون کے پیاسے ہجوم کو ہر قیمت سے روکنا ہے، چاہے اس کے لیے اپنے ہم مذہبوں پر گولی ہی کیوں چلانی نہ پڑے۔''

زہرا نے اتنے ہی غصے میں جواب دیا'' یہ کون سی ایسی غیر معمولی بات ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا، اُس طرف ان حالات میں ہم اپنے فرض سے کیا غافل تھے۔ تم سمجھتی ہو کہ اُس طرف ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تم ہو ہی متعصب۔''

اس کے منہ سے یہ لفظ سن کر تو میں ڈھے گئی۔ اب جواب سے مجھ پر واضح ہو گیا کہ ہم دونوں کے درمیان ایک دوسرے کو جاننے سمجھنے کے سارے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں متعصب ہوں، جانبدار ہوں۔ اور میرا حال یہ تھا کہ میں نے بھائی چارے اور رواداری کو اپنا دین ایمان بنا رکھا تھا۔

لیکن پھر ہماری یعنی میری اور زہرا کی صلح ہو گئی۔ جس طرح پہلے ہم لڑتے تھے اور پھر صلح کر لیتے تھے۔ ہمارے درمیان کتنا کچھ مشترک تھا، کتنی ہی باتیں تھیں جو ہم دونوں کی یادوں کا حصہ تھیں۔

ہم چار دیواری والے باغ میں چہل قدمی کے لیے نکل گئے۔ اس باغ میں ہم مل کر کھیلا کرتے تھے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے ہم اس درخت کے پاس آ نکلے جہاں ہم اپنا جھولا ڈالا کرتے تھے۔ ہم کتنی دیر تک ان لوگوں کی باتیں کرتے رہے جواب یہاں نہیں تھے۔

آٹھواں باب

زینب اور اس کے خاندان والے بستر بوریا باندھ کر اس نوزائیدہ ملک کی طرف نکل گئے تھے جو ہمت اور صبر سے کام لینے والوں کو روزگار مہیا کرتا تھا اور امیدوں سے بھرے مستقبل کی ضمانت دیتا تھا۔ زینب کے خاندان والوں نے وہاں جا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ وہاں وہ خوش و خرم تھے۔ بس کبھی کبھی گھر کی یاد ستانے لگتی تھی۔ لیکن بہت مطمئن اور شکر گزار رہتے کہ اب ان کا مستقبل محفوظ تھا۔

یہاں حسن پور میں ان کے گھر کی کچی دیواریں آندھی اور مینہ سے بیٹھتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے دو پرانے چہیتوں نے جنہوں نے کبھی ان کے بہت کام کئے تھے یہاں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اس کھنڈر کے کم از کم لکڑی والے دروازے اور لکڑیاں ابھی تک سلامت تھیں۔

زینب کے ساتھ شریفن ڈومنی بھی چلی گئی تھی۔ وہ اپنی نقلوں اور مسخرگیوں سے ہمیں کتنا محظوظ کیا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی گئی جس کی آواز من موہنی تھی۔ شریفن اب جائیداد والی تھی۔ اس کی بیٹی کی آواز کا یہ کرشمہ تھا کہ اسے وہاں کے نودولتیوں اور نو اقتداریوں کے حلقوں میں رسائی حاصل ہو گئی۔ اس آواز سے ان فلسٹاروں نے بھی بہت فائدہ اٹھایا جن کی شکل وصورت تو خوب تھی مگر آواز اچھی نہیں پائی تھی۔ اس آواز کی بدولت اب یہ ماں بیٹی پیسے میں کھیل رہی تھیں، بالکل اُن مغنیاؤں کی طرح جو راجوں مہاراجوں کی نوازشوں سے عزت بھی پاتی تھیں اور دولت بھی انہیں اتنی ملتی تھی کہ آج کے امیر لوگ بھی ان کے سامنے ہیچ نظر آئیں۔

زینب کو ایک دیہاتی عقل اور اس کے ساتھ ایک حسِ مزاح ودیعت ہوئی تھی۔ اسی کا فیض تھا کہ جب لڑکی تھی تو اس نے زندگی کی بے رنگی کو ہنسی خوشی قبول کر رکھا تھا۔ اب اللہ کا فضل تھا اور وہ خوش اور مطمئن تھی۔ اس کا میاں کسی منسٹری میں کلرک تھا اور منسٹر صاحب اس پر مہربان تھے۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا فوج میں کیڈٹ تھا اور امید تھی کہ ایک دن وہ افسر بن جائے گا۔ انہوں نے کسی کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی میں اپنا ایک چھوٹا سا مکان کھڑا کر لیا تھا۔ پہلی منزل کرائے پہ اٹھا رکھی تھی۔ اس کرائے سے قرضے کی قسطیں ادا ہوتی تھیں۔

زہرا کو ایک دم سے ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ کہنے لگی "ارے میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ زینب

کے شوہر نامدار کلرک بن کر واشنگٹن کے سفارت خانے میں جا رہے ہیں۔ زینب امریکہ میں! ۔۔۔۔ کبھی تم نے یہ سوچا تھا؟''

''زینب امریکہ میں!'' میں نے اس کی بات کو دُہرایا'' زینب چاند میں ۔۔۔۔ ! تمہیں یاد ہے زہرا کہ جب میں نے کہا تھا کہ میں دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں تو وہ کتنا ہنسی تھی۔ کہنے لگی میں چاند کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے یہ بات دل لگی میں کہی تھی کیونکہ وہ تو یہ یقین کئے بیٹھی تھی کہ حسن پور سے نکلنا اس کی قسمت میں نہیں ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ بس ایک میں ہوں جس کا قدم کبھی گھر سے نہیں نکلے گا۔''

رومانہ کا خیال شاید مجھے اس واسطے سے آیا کہ ہم جو اس کے بارے میں اندازہ کئے بیٹھے تھے اس سے وہ بالکل مختلف قسم کی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ تو اب پریوں کی کہانی والی پری پیکر سنڈریلا بنی بیٹھی تھی جس کی کسی شہزادے سے شادی ہوئی تھی، جو سنگ مرمر کے محلوں میں رہتی تھی۔ کبوتر کے انڈے کے برابر والے موتی پہنتی تھی اور دنیا کے دارالحکومتوں کی سیر کرتی پھرتی تھی۔

رومانہ سے میری ملاقات جنگ کے دنوں میں ہوئی تھی۔ ایک گرمیوں میں وہ اپنے میاں کے ساتھ اسی پہاڑی مقام پر آئی تھی جہاں میں نے اپنا گھر بنایا تھا۔ اس وقت مجھ پر کھلا کہ رومانہ کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اس کا حسن و جمال ہے اور وہ اس کی قیدی ہے۔ وہ اپنے حسن میں مگن رہتی تھی۔ اس حسن کے بہت چوچلے کرتی تھی، کیونکہ اسی حسن کا دیا تو وہ کھا رہی تھی۔ اپنے پروانوں کو لاسے پر لگائے رکھتی تھی۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ کوئی فاحشہ تھی، بلکہ محض اس وجہ سے کہ اس سے اس کے یہاں ایک احساسِ تحفظ رہتا تھا۔

آگے چل کر میں نے چکنے چمکیلے رسالوں میں اس کی تصویریں دیکھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ لوگ ہز ہائی نس اور ہر ہائی نس کے القاب سے یاد کی جانی والی شخصیتوں کے جی حضوریوں میں شامل تھے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ وہ خود ہز ہائی نس اور ہر ہائی نس بن گئے اور دوسرے ان کے جی حضوریے ہو گئے۔ بات یہ تھی کہ راجوں مہاراجوں نوابوں کی ریاستوں کے ملک میں ضم ہو جانے کے بعد زمانہ عجب عبرتناک انداز سے بدلا تھا۔ ایسا بدلا کہ ہز ہائی نس کہلانے والی شخصیتوں کے پاس بس القاب رہ گئے۔ ریاستیں ان کی غائب ہو گئیں۔ آمدنیاں کم رہ گئیں مگر طور طریقے نہیں بدلے، شوق نہیں بدلے۔ سارے وہی لچھن۔ اسی طرح پولو کھیلنا، کبوتر اڑانا، ریس میں رقمیں لگانا۔ شراب خوری، عشق بازی، زناکاری۔ مگر نوابوں والی شانِ بے نیازی کے ساتھ ان مشاغل کو جاری رکھنے کا تقاضا یہ تھا کہ صاحب القاب اور اہل وسائل ایک دوسرے کے کام آئیں۔

سو رومانہ اپنے میاں کے لیے بہت قیمتی شے تھی، ایک گراں قدر سنگی ساتھی کی حیثیت رکھتی تھی۔ یورپ اور امریکہ میں جا کر اس گراں قدری میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ جو دو چیزوں کا حسین امتزاج تھا، رومانہ کا اجنبی اجنبی مشرقی حسن اور اس کے میاں کا صدیوں پرانا شاہی لقب، اس حسین امتزاج کو دیکھ کر

یورپ اور امریکہ والے تو لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

روما نہ اور جون، یہ دو لڑکیاں ہماری ٹولی میں اس قسم کی تھیں کہ ان میں کوئی اینچ پینچ نہیں تھا۔ جون تو ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔ اپنے کام میں غرق رہتی تھی۔ کسی جذباتی چکر کو تو اس نے کبھی اپنی زندگی میں راہ ہی نہیں دی۔ ذراما بازی کا بھی اسے کوئی لپکا نہیں تھا۔ زیادہ تو نہیں مگر کبھی کبھار اس کا خط آ جاتا، پھر میں خط لکھتی۔ ہم میں آپس میں ایک پیار چلا آ رہا تھا۔ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی لیکن آزادی کے بعد اس کے والدین پہ ہنک سوار ہو گئی کہ ہم تو "ہوم" جائیں گے۔ ہوم یعنی انگلستان اور جون بہت فرض شناس بیٹی تھی۔ وہ ماں باپ کو بڑھاپے میں اکیلا کیسے چھوڑ دیتی۔

جون نے ایک مرتبہ مجھے خط میں لکھا: "کسی بھی وقت، کسی بھی عمر میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ آدمی اُس جگہ کو اور اُس ماحول کو بھول جائے جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور جہاں پلا بڑھا تھا۔ میں یہاں جو چیز بھی دیکھتی ہوں جو بات بھی سامنے آتی ہے اس کا موازنہ فوراً ہندوستان کی چیزوں اور باتوں سے کرنے لگتی ہوں۔ اور کیا تم باور کرو گی کہ ہماری ممی اور پپا اب جب "ہوم" کی بات کرتے ہیں تو ہوم سے ان کی مراد انگلستان نہیں ہوتا۔"

مسز مارٹن نے بھی رابطہ برقرار رکھا تھا۔ ہر نئے سال کے موقع پر کارڈ بھیجتی تھیں جس کی پشت پر ایک مختصر سا خط لکھ ڈالتی تھیں۔ اب بھی وہ بڑے پیار سے اپنی نو خیز بچیوں، اپنی ڈیئر ڈیئر رانیوں اور بیگموں کی خیر و عافیت معلوم کرتی تھیں جیسے ابھی تک وہ وہی پچھلی والی گورنس ہیں کہ رخصت پر گئی ہوئی ہیں۔ خط لکھتے وقت بالکل بھول جاتی تھیں کہ اب وہ ہاؤس فادر ریٹائرڈ جنٹل ویمن، میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں اور یہ کہ اب روحانیت ان کا واحد مشغلہ ہے۔ اس بوڑھی عورت کی عمر اب ستر سے تجاوز کر چکی تھی۔ بیتے دنوں کو جب یاد کرتی تو اسے بہت زمانے پہلے کے سہانے دن یاد آتے۔ درمیان میں جو تبدیلیاں آ چکی تھیں حافظہ انہیں یکسر فراموش کر دیتا۔

جنگ کے دنوں میں انہیں افسروں کے ایک "ہولی ڈے ہوم" کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا "آدمی کو بساط بھر اپنے ملک کی خدمت کرنی چاہیے۔" جنگ کے بعد راجا امیر پور نے انہیں گورنمنٹ ہاؤس میں ہاؤس کیپر کی جگہ پر رکھوا دیا۔ میں ان سے وہیں ملی تھی۔ وہ موقع تھا جب 1947ء میں یوم آزادی منایا جا رہا تھا۔ جب میں چار برس کی تھی تو انہوں نے کتنی توجہ سے مجھے "گاڈ سیو دی کنگ" والا ترانہ یاد کرایا تھا۔ اور آج وہ میرے برابر کھڑی میری بچی کو دوسری بچیوں کے ساتھ مل کر اپنے دیس کا ترانہ سن رہی تھیں۔ یہاں جو بچے جمع تھے ان میں اکثروں کا رنگ سلویا نگر کے مقابلے میں کھلتا ہوا تھا۔ وہی سلویا نگر جس نے کسی زمانے میں مجھے "کالے لوگ" کے خطاب سے نوازا تھا (حافظہ بھی کتنا ظالم ہوتا ہے کہ ایسی باتیں یاد رکھتا ہے) سلویا یہاں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی تھی۔ جب راجہ بھیم نگر قلاش ہو گئے تو اس نے ان سے منہ موڑا اور امریکن ائرفورس کے ایک سارجنٹ کے ساتھ رفو چکر ہو گئی۔

مسز مارٹن کی شائستگی مانع تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیسے کرتیں۔ تاہم انہوں نے حکومت برطانیہ کو درخواست دے دی تھی کہ چند ماہ کے اندر اندر انہیں "ہوم" بھجوانے کا انتظام کر دیا جائے۔ ہم سے انہوں نے نہایت ثقافت کے ساتھ یہ کہا کہ "مائی ڈیئر، ہم نے تو حتی المقدور اپنا فرض انجام دے دیا۔ آگے تم پر ہے کہ تم ملک کو کیسے چلاتے ہو۔ قابل اطمینان بات یہ ہے کہ ہندوستان کی باگ ڈور اب جس شخص کے ہاتھوں میں ہے وہ بالکل برٹش جنٹلمین لگتا ہے۔"

ایک دفعہ انہوں نے خط میں لکھا کہ میں نے راجہ امیر پور کی روح سے باتیں کی ہیں۔ اور واقعہ یوں ہے کہ راجہ صاحب اس بی بی کے گزر جانے کے بعد تک زندہ رہے۔

راجہ صاحب سارے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو کر امیر پور میں جا بیٹھے تھے۔ سب سے الگ تھلگ بڑے وقار کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ تابڑتوڑ آفات و مصائب کو انہوں نے بڑے حوصلے سے برداشت کیا۔ شہر والے ان کے محل کو حکومت نے اپنے تصرف میں لے کر وہاں قانون ساز اسمبلی کے ممبروں کے لیے ہوسٹل قائم کر دیا تھا۔ اور وہ جو شہر کے نواح میں ان کا مکان تھا۔ مکان کیا تھا لمبا چوڑا شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا محل تھا، اور وہ اس کے آراستہ باغ باغیچے، اب اس کے حصے بخرے کر کے تعمیر کے لیے پلاٹ نکالے گئے تھے۔ وہاں اب شرنارتھیوں کی ایک نئی بستی بسائی جا رہی تھی۔

راجہ صاحب آخری بار جس سرکاری تقریب میں دیکھے گئے تھے وہ آزادی کے چار سال بعد ہونے والی وہ تقریب تھی جہاں تعلقہ داروں کی جانب سے صدر جمہوریہ کو سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا۔

یہ تقریب عجیب تھی۔ نہ چراغاں، نہ آتش بازی، نہ شمپین، نہ ہیرے جواہرات کی چمک دمک، نہ سرکاری درباری پوشاکوں کی تزک بھڑک، تعلقہ داروں کی یہ آخری تقریب تھی۔۔۔۔۔ ایک استقبالیہ جو ایک سیدھی سادھی ٹی پارٹی تھی اُن کی طرف سے جن کی خصوصی مراعات اور خصوصی طبقاتی حیثیت پر بہت جلد خطِ تنسیخ پھرنے والا تھا۔

نوابی حیثیت رکھنے والی جو شخصیتیں تعلقہ داروں کی اس انجمن کی صدر رہ چکی تھیں، اور سرکار انگلشیہ کی نمائندگی کرنے والی شخصیتیں، ان دونوں ہی کی تصویریں یہاں آویزاں تھیں۔ سنگِ مرمر کے بنے ہوئے ان کے مجسمے نصب تھے۔ گرد میں اَٹے ان کے تصویری چہرے اور مرمریں مجسمے اپنی کہنہ فرسودہ شان و شوکت کے ساتھ ان چائے کی میزوں کی سمت دیکھ رہے تھے جن پر چنی ہوئی چائے اب گرم گنگنی ہو چلی تھی۔ کیکوں میں باسی پن آ گیا تھا اور دیسی پکوان ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس مہمان تو گنتی کے تھے۔ ریل پیل کھدر پوشوں کی تھی۔ وہ جو مٹھی بھر انگریز یہاں موجود تھے کوئی کاروباری، کوئی ماہرِ تعلیم، کوئی ٹیکنیکل آدمی، بہر حال جو بھی تھے اب ان کا پہلا جیسا رعب داب نہیں تھا، نہ ویسا احترام۔ اب تو ان سے لوگ ایسے مل رہے تھے جیسے وہ ان کے برابر کے لوگ ہیں اور یار دوست ہیں۔

یہ تقریب کیا تھی، یوں سمجھئے کہ تعلقہ دار برادری کا وداعی نوحہ تھا۔ راجہ امیر پور نے صدارت بڑے رکھ رکھاؤ سے کی مگر جو تعلقہ دار کرسی کو سلام کرنے کے عادی چلے آتے تھے وہ معزز و محترم مہمان خصوصی کے گرد منڈلا رہے تھے۔ وہ اب تک یہ لَو لگائے بیٹھے تھے کہ ان کے لیے آسمان سے مَن و سلویٰ اُترے گا۔

باہر پولیس والوں کا بینڈ بج رہا تھا۔ کبھی انگریزی دھن کبھی کوئی دیسی۔ اس بینڈ نے کبوتروں کے امن وسکون میں بری طرح خلل ڈالا تھا۔ سبزہ زاروں کے بیچ جو سنگِ مرمر کے چبوترے تھے ان کے گرد ان کی ٹکڑیاں چکر لگا رہی تھیں۔

رضا علی بیوی بچوں کو لے کر پاکستان چلا گیا تھا۔ وہاں چپ چاپ زندگی بسر کر رہا تھا۔ تقسیم سے پہلے جو اس نے وہاں جائیداد خرید رکھی تھی بس اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اب تقسیم کے بعد تو اس کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس اجنبی ماحول میں وہ خوش تو نہیں تھا۔ اس کا تو جوشِ خطابت اسے لے بیٹھا تھا۔ ویسے تو اس کی کوئی سیاسی سرگرمی نہیں تھی، وہاں نظریات بہت بگھارتا تھا۔ یا پھر اس سے تقریر کرالو۔ بس اسی کی اسے سزا ملی۔ اسے زبردستی سرحد کے ادھر دھکیل دیا گیا۔ اب خاموش زندگی کو شعار کیا تھا۔ نمازیں پڑھتا تھا، خیرات کرتا تھا، کئی حج کر لیے تھے۔

مگر زاہد جو اس زمانے میں رضا علی کا دستِ و بازو بنا ہوا تھا اور بہت جوش میں تھا اس کا انجام عجب ہوا۔ فتح کے نشے سے سرشار، آنکھوں میں امیدوں کی چمک، اس کیفیت میں وہ 13 اگست کو ریل میں سوار ہو کر اپنے خوابوں کی سرزمین کی طرف روانہ ہوا۔ اگلے دن اس ملک کو منصۂ شہود پر نمودار ہونا تھا جس کے لیے اس نے جدوجہد کی تھی، جس کے انتظار میں وہ دن گن رہا تھا۔ لیکن ہوا کیا؟ جب وہ گاڑی منزلِ مقصود پہ پہنچی تو اس کا کوئی مسافر، کوئی مرد عورت، کوئی بچہ بڑا، کوئی بھی جیتا نہیں بچا تھا۔

خشک فوارے کے کنارے مَیں دھوپ میں بیٹھی تھی۔ مگر مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں کانپنے لگی۔ میرے اردگرد سائے منڈلا رہے تھے۔ اتنے برس بیت گئے تھے مگر بھٹکتی روحوں کو آرام کہاں۔ میں جھرجھری لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چلی کمرے کی طرف۔ اس کمرے کی طرف جو میرا ہوا کرتا تھا، جسے میں اپنا ہی سمجھوں گی چاہے اس میں کوئی رہے۔ میں نے اجڑے بچھڑے دالان کے اُس طرف اُن کھڑکیوں پر نظر ڈالی جن پہ اب تختے جڑے نظر آ رہے تھے اور ان محرابوں پر جن میں اینٹیں چن دی گئی تھیں۔ مکان کے اس حصے میں اب کچھ اجنبی لوگ آ کر رہنے لگے تھے۔ آگے یہاں ہماری چچی عابدہ اور ماجدہ رہا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی سنگی ساتھی بیبیاں اور نوکرانیاں۔ کتنے آرام کی زندگی تھی ان کی۔ جو ثقافت ہمیں ورثے میں ملی تھی اس میں رچی بسی تھی وہ زندگی۔ صحن اور باغ کے اس طرف جو زندگی کا طور تھا وہ اس ثقافت سے شاید اتنا زیادہ قریب نہیں تھا۔ جب ثقافتی اقدار کے تصادم سے میرا دماغ پریشان ہو جاتا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تو میں اسی گوشے میں آ کر پناہ لیتی تھی۔

عابدہ پھپھی کا خیال آیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ واقعی یہاں موجود ہیں۔ ہمارے درمیان جو آویزش پیدا ہوگئی تھی، پھر کبھی وہ سلجھ نہیں سکی۔ اور پھر میری یہ حالت ہوئی کہ جیسے میں مستقل اس کوشش میں ہوں کہ کسی طور ان تک پہنچوں اور رنجش کو کسی نہ کسی طرح ختم کروں۔ جی چاہتا تھا کہ اس بات پر ایمان لے آؤں کہ موت کے بعد بھی ہم مرنے والے سے ربط وضبط رکھ سکتے ہیں۔ اصل میں ان کے جیتے جی جو بات میں ان سے نہیں کہہ سکی تھی وہ اب ان سے کہنا چاہتی تھی۔ اس دوران تو وہ بات کہنے کا مجھے وقت ہی نہیں ملا۔ میں ان سے اور امیر سے دونوں سے اس حد تک محبت کرتی تھی کہ ان کے سلسلے میں قطعی سچائی سے کم پر میں رضامند ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ بال برابر شک بھی، جس سے عقل اور ایمان میں جدائی کا احتمال ہو، مجھے گوارا نہیں ہوسکتا تھا۔

ان کے میاں کا تار آنے پر بھاگی دوڑی وہاں گئی، مگر میرے وہاں پہنچتے پہنچتے وہ سدھار چکی تھیں۔ ہاں یہ جان کر تھوڑی تسکین ضرور ہوئی کہ جب ان کی آنکھ بند ہوئی ہے تو ان کا سر حکیمن بوا کی گود میں تھا۔

اس غیر گھر میں بس ایک حکیمن بوا تھیں جو یہ سمجھتی تھیں کہ مجھے عابدہ پھپھی کیا سمجھتی تھیں اور میرے لیے ان کی ذات کیا معنی رکھتی تھی۔ حکیمن بوا نے مجھے بہت دلاسا دیا اور کہا کہ جب انہوں نے آ کر بتایا کہ لیلی بٹیا آ رہی ہیں تو عابدہ بٹیا اُس گھڑی بہت کرب میں تھیں۔ پر یہ سن کر ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ جیسے میرے آنے کی خبر ہی سے ان کی روح کا سامان ہوا کیونکہ اس کے بعد گھنٹہ بھر کے اندر اندر ہی تو وہ اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔

ان کے پُرسکون چہرے کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے خوش ہیں کہ چپکے سے سدھار گئیں اور اب آرام کر رہی ہیں۔ زندگی میں ان سے بہت کچھ سیکھا اور اب ان کی موت بھی مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں بہت دیر سے پہنچی۔ انہیں بتا نہیں پائی کہ مجھے ان سے کتنی محبت ہے۔ اب تو بس میں یہی کر سکتی تھی کہ خاموش کھڑی آنسو بہا رہی تھی اور ان آنسوؤں کے واسطے سے معافی کی طلب گار تھی۔ اس آن میں نے یہ جانا کہ عجز، محبت، عنایت، اس سب باتوں سے وقت بے نیاز ہے اور ان کے چہرے کے سکون کو دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں روحانی اعتبار سے دھل کر پاک صاف ہوگئی ہوں۔

انہوں نے پچھلے چھ مہینوں میں بار بار مجھے لکھا کہ تم اس وقت غم زدہ ہو، میرے پاس آ جاؤ۔ میں خود تمہارے پاس آتی مگر میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ لیکن ان دنوں میرے اندر اتنی تلخی تھی کہ میں نے ان کے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ تلخی آدمی کی ذات کو چاٹ لیتی ہے۔ اس مصیبت میں میری عقل خراب ہوگئی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی زائل ہوگئی تھی۔ اس وقت تو بس یہی بات دماغ میں سمائی تھی کہ اب جب امیر دنیا سے گزر گیا تو عابدہ پھپھی نرم پڑ گئی ہیں۔ جب تک وہ زندہ تھا تو وہ برہم رہیں۔ گویا امیر کی موت اور میری مصیبت، یہ قیمت تھی جو ادا ہوئی تو عابدہ پھپھی کی طرف سے معافی ملی۔ ان دنوں خاندان کے

ان سب ہی لوگوں کی طرف سے میرے یہاں بہت تنگی تھی جو میرے ہاتھ پیلے ہوتے سے میرے خلاف تھے۔ اور اب جب میری مانگ اجڑ گئی تو مجھے دلاسا دے رہے تھے۔

لیکن اس وقت عابدہ پھپھی ابدی نیند میں تھیں اور میں ان کے روبرو تھی۔ یہ کشف کی گھڑی تھی۔ اس گھڑی مجھ پہ کھلا کہ دوسرے کی شرکت کی حاجت غم کو ہے خوشی کو نہیں۔ خوشی کی تو اپنی بہت طاقت ہوتی ہے۔ وہ اپنی حفاظت خود ہی کر لیتی ہے۔

میری شادی کے بارے میں عابدہ پھپھی نے جو رویہ اختیار کیا اس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ مخالفت میں سرگرم تو سائرہ چچی تھیں مگر ان سے تو مجھے کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ حامد چچا کو بھی یہ شادی ناپسند تھی۔ انہوں نے اس سلسلے میں سرد مہری کا رویہ اپنایا۔ اس کی بھی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں نے یہ تصور کر لیا تھا کہ میں جھوٹی قدروں کے خلاف بغاوت کر رہی ہوں۔ بغاوت کا شاعرانہ تصور میرے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ پھر یہ بھی تو بات تھی کہ مجھے چچا چچی سے کوئی انس تھا ہی نہیں۔ لیکن جب عابدہ پھپھی نے مجھ سے ایسا برتاؤ کیا جیسے میں نے کسی ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کیا ہے تو میں بہ شپٹائی۔ ان کے سوا میں اور کس سے یہ امید رکھ سکتی تھی کہ وہ میرے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ میرا ظاہری فعل کتنا ہی باغیانہ اور غلط دکھائی دیا ہو مگر وہ تو مجھے اتنا جانتی تھیں کہ میرا باطن بھی ان پر عیاں تھا۔ وہ یہ سمجھ سکتی تھیں کہ اس بظاہر غلط فعل کی تہہ میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ ان پر یہ بات بھی روشن ہونی چاہیے تھی کہ یہ جذبہ صادق ہے۔ اس میں کسی جھوٹ کی آمیزش نہیں ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب میں نے انہیں یہ بتادیا کہ میں اس بارے میں نہ آپ کا حکم مانوں گی نہ خاندان میں کسی کی بات سنوں گی، اور یہ کہ میں امیر کو نہیں چھوڑوں گی، تو اس کے بعد وہ میری صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں رہیں۔ میں نے انہیں خط پہ خط لکھے۔ انہوں نے کسی ایک کا جواب نہیں دیا۔

آخری بار جب میں ان سے ملی ہوں تو یہاں تک ہوا کہ میں روئی۔ میں نے کہا ''پھپھی جان، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔''

مگر وہ ذرا جو پسیجی ہوں۔ بہت بے رخی برتی اور روکھے پن سے بولیں ''تم نے بڑوں کا کہنا نہیں مانا۔ تم سرکشی پہ اتری ہوئی ہو۔ خاندان کی طرف سے جو تم پر فرض عائد ہوتا ہے اُس فرض سے تم اپنے آپ کو بالا سمجھتی ہو۔''

اُس وقت وہ مجھے ظالم نظر آئیں۔ خود ان کی زندگی گواہی دے رہی تھی کہ ان کا ظلم عقل سے بھی بیگانہ ہے۔ وہ ایسی خشک زندگی گزار رہی تھیں جس میں خوشی کا سرے سے گزر ہی نہیں تھا۔ بس میاں کی خدمت میں اور میاں کے خاندان کی خدمت میں جُتی ہوئی تھیں۔

''پھپھی جان، آپ تو مجھے ایسے دیکھ رہی ہیں جیسے میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔''

''تم نے خاندان کا نام خوب بانس پہ چڑھایا۔ باتیں بنانے والوں کو موقع دے دیا کہ ہمارے

خاندان کے بارے میں اچھی بری باتیں کریں، تہمتیں تراشیں۔ خاندان کی عزت تم نے خاک میں ملادی۔"

بس پھر میں نے سمجھ لیا کہ ہمارے درمیان کوئی افہام و تفہیم ممکن نہیں ہے۔ وہ ایسے طرزِ فکر کے سانچے میں ڈھلی تھیں جسے میں نے رد کر دیا تھا۔ میرا جرم یہ تھا کہ میں نے محبت کا اعتراف کر لیا تھا۔ ان کے تصور میں تو محبت اور جنس لازم و ملزوم تھے۔ اور جنس کی حیثیت ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کی تھی۔ میری معصومیت کی توہین کی گئی تھی۔ میرے اپنے خیالات و تصورات پر یہ بدترین حملہ تھا۔ امیر سے شادی کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس وجہ سے بھی کہ میں محبت کی پاکیزگی ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اس کے بعد پھر عابدہ پھپھی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔

اسی کمرے میں جہاں اس وقت میں چل پھر رہی تھی نکاح کے گواہ مجھ سے پوچھنے آئے تھے۔۔۔۔۔ہاں وہ نکاح کی رسم کتنی سادگی سے ادا ہوئی۔۔۔۔۔ہاں تو نکاح کے گواہوں نے اسی کمرے میں آ کر مجھ سے پوچھا تھا کہ بی بی کیا تمہیں امیر سے رشتہ قبول ہے؟ اور پھر میں امیر کی دلہن بن کر اسی کمرے سے وداع ہوئی تھی۔ اور اس طور وداع ہوئی تھی کہ میرے بزرگوں میں سے کسی ایک نے بھی تو کوئی دعائیہ کلمہ منہ سے نہیں نکالا۔ میں اس کمرے سے دعاؤں کے بغیر رخصت ہوئی تھی۔

نواں باب

دھوپ میں چمکتے باغ سے نکل کر جب میں نے اس کمرے میں قدم رکھا تو محسوس ہوا کہ میں کسی ٹھنڈی سیلی اندھیری جگہ میں آ گئی ہوں۔ فضا میں کچھ بساندی سی بسی ہوئی تھی۔ ابھی روشن فضا سے نکل کر آئی تھی اس لیے میری آنکھیں ابھی اس فضا سے مانوس نہیں ہوئی تھیں۔ اسی گھڑی میری نظر آئینے پر گئی تو مجھے لگا کہ کسی چلتی پھرتی پرچھائیں کا عکس آئینے میں پڑ رہا ہے۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں چل کر اس آئینے کے پاس گئی۔ مدہم روشنی نے کیا کمال دکھایا تھا کہ عمر اور زمانے کے گرم و سرد سے جو میرے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں وہ جیسے یکسر مٹ گئی ہوں۔ اب میرے روبرو وہ لڑکی تھی جو میرے تصور میں بسی رہتی تھی اور جس کی وجہ سے میں لوگوں کے لیے اجنبی بن گئی تھی کہ وہ تو نقاب اٹھا کر اس لڑکی کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

یہاں جو فرنیچر پڑا رہ گیا تھا اس میں ایک سٹول بھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے گرد میں اَٹے اس سٹول کو اٹھایا، آئینے کے سامنے رکھ کر اس پہ اپنے تھکے وجود کے ساتھ بیٹھ گئی اور اپنی عمر ادکو تکنے لگی۔ اندر یہ خواہش کروٹ لے رہی تھی کہ مجھے کسی طرح ان سایوں سے چھٹکارا مل جائے جن کی وجہ سے میں حاضر و موجود کو قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

یہ جو اس وقت دوسری شکل میرے روبرو تھی بس میں اس وقت یہی تھی، اس وقت جب میں نے یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے کی آخری گھڑیاں بسر کی تھیں۔ یہ گھڑیاں میں نے یہاں امیر کے ساتھ بسر کی تھیں۔ صبح جب ہم یہاں سے رخصت ہونے کو تھے تو اس نے بہت بے مزہ ہو کر ارد گرد ایک نظر ڈالی تھی۔ کہنے لگا "خدا کا شکر ہے کہ یہاں سے فراغت ہوئی۔ میں کتنا خوش ہوں کہ اب ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔ یہ کمرہ تو مجھے آسیب زدہ لگتا ہے۔ یہ اسی گھر کا حصہ ہے نا جو مجھے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہاں کتنا کچھ ہے کہ تمہاری زندگی کا حصہ ہے مگر میں اس سب سے سرے سے ناآشنا ہوں۔ یہاں کی ہر چیز مجھ سے غیریت برتتی دکھائی دیتی ہے۔"

میں ہنس پڑی اور اسے چوم کر بولی "چھوڑو ان وسوسوں کو۔ میرے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ یوں سمجھو کہ یہاں جتنا بھی زمانہ میں نے گزارا وہ تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تیاری کا زمانہ تھا۔"

بس اس کی طبیعت بحال ہوگئی۔ میرے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگا اور بولا" اصل میں میرے تکدر کی وجہ بہت سیدھی سادھی ہے۔ کل رات جب مجھے یہاں ٹھہرنے کے لیے کہا گیا تو مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی اس لیے کہ تمہارے گھر والوں کی طرف سے یہ محض ایک دکھاوا تھا۔ انہوں نے شادی کے بعد اگر ہمیں اس گھر میں آنے اور رات بسر کرنے کے لیے کہا تو بس یہ ایک رسم کو نباہنے کی بات تھی۔"

میں نے کہا" یہ جو تمہارے عزیز رشتہ دار امیر پور والے مجھے دلہن بنا کر باجے گاجے کے ساتھ اپنے گھر لے گئے تھے کیا اس کے بارے میں مجھے بھی اسی انداز سے سوچنا چاہیے؟"

اس نے جھٹ سے جواب دیا" نہیں، ہرگز نہیں۔ اصل میں تو نیت دیکھی جاتی ہے۔ اُن لوگوں نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے اور تم سے انہیں واقعی اُنس ہے۔ تمہیں انہوں نے محض بہو نہیں سمجھا ہے۔ بہو کے ساتھ تم ان کے لیے بیٹی بھی ہو۔ اس کے برخلاف تمہارے گھر والے مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔ انہوں نے مجھے معاف نہیں کیا ہے اور شاید کبھی معاف نہیں کریں گے۔ کیسے معاف کر دیں، ان کے تعصبات تو ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔"

"وہ ہوتے کون ہیں۔" میں نے کہا" کوئی بھی ہو، وہ ہوتا کون ہے۔ ہم اپنا گھر بسا رہے ہیں۔ اپنے حساب سے اپنی زندگی کا آغاز کر رہے ہیں۔"

"ارے وہ گھر تو اس کمرے سے بس رتی دو رتی ہی بڑا ہوگا۔ وہ گھر تقریباً۔۔۔۔" وہ تو شروع ہو گیا تھا مگر میں نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اس کے آگے جھک کر میں نے فلم کی ہیروئنوں والا پوز بنایا اور بن کر کہنے لگی" میرے والی، میرے سرتاج! تمہارے ساتھ تو جھونپڑا بھی میرے لیے محل ہے۔ اور خوشی اتنی ہے کہ پوری دنیا بھی مل جائے تو چھوٹی نظر آئے گی۔"

ہم خوش تھے۔ ویسے تو ہماری ساری خوشی میرے اپنے تخیل کی دین تھی لیکن اس کی ایک جہت اور بھی تھی۔ اس کا شعور تو مجھے تجربے سے گزرنے کے بعد ہی ہوا، ویسے کیسے پتہ چلتا۔ بدن سے والہانہ شیفتگی، جذبات کی آسودگی، ایک ایک حس سے جنم لیتی آتشِ شوق۔۔۔۔۔ اس واسطے سے میں ایک باطنی سیرابی کے گہرے جذبے سے سرشار تھی۔ جسموں کے وصل سے تو مَن شدی مَن تو شدم کا عرفان حاصل ہوا۔ جب ہم مل کر ایک دوسرے کا جز بن گئے تو پھر پوری کائنات کا بھی جز بن گئے، اس شان سے کہ اس کی نہ کوئی ابتدا تھی نہ انتہا۔ بس اپنے" ہونے" کا ایک شعور تھا۔

اس باطنی تکمیل کو لفظوں میں کیسے بیان کیا جا سکتا تھا۔ کیسے ان لوگوں کو بتایا جاتا جو اس تجربے کے دائرے سے باہر کھڑے تھے۔ ہاں جس رضا و رغبت سے میں نے روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اپنایا تھا اس سے ضرور اس کا اظہار ہوتا تھا۔ میں کتنی خوش تھی کہ میرا اپنا گھر ہے جس میں مَیں جیسے چاہوں رہوں۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ حالانکہ یہ گھر بہت چھوٹا سا اور بہت سادہ سا تھا۔ نوکروں چاکروں کی

جور یل پیل حسن پور اور "آشیانہ" میں تھی وہ یہاں کہاں تھی۔

امیر کے دوستوں میں سے اکثر میرے بھی دوست بن گئے حالانکہ اس طرح کے نوجوانوں کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب حامد چچا خاندان کے بزرگ بن کر بیٹھے تو میرا ملنا جلنا صاحب حیثیت اور صاحب مرتبہ لوگوں کے اُن بیٹے بیٹیوں ہی سے رہا جنہوں نے اپنے اوپر جدیدیت کا جھول چڑھا رکھا تھا۔

امیر کے یار دوست زیادہ تر غریب غربا تھے۔ اوپر سے بے ڈھنگے اور جسے دیکھو باغی بنا ہوا ہے۔ اپنی شخصیتوں کو سہارا دینے کے لیے ان کے پاس پیسا کھیاں نہیں تھیں۔ اپنی حیثیت منوانے اور عزت و مرتبہ حاصل کرنے کے لیے جو کھیل کھیلے جاتے ہیں وہ ان کے روادار نہیں تھے۔ ان کے پاس تو بس ایک ہی ہتھیار تھا۔ ان کا اپنا ذہن۔ ان میں کوئی بھی تو غبی نہیں تھا۔ یہ تھے لگن والے شاعر، ادیب، اور وہ جو سیاسی نظریوں کے علم اٹھائے پھرتے تھے، ہر محروم گروہ کے مسئلے کو اپنا مسئلہ بنا لیتے اور ہر انقلاب کو ایسے لبیک کہتے تھے جیسے وہ انھی کی مقدس جنگ ہے۔

ویسے کسی کسی کے یہاں میں نے یہ بھی دیکھا کہ بس کھوکھلی نعرہ بازی ہے خاص طور پر اُن نوجوانوں کے یہاں جو اپنے خیالات و افکار دوسروں پر مسلط کرنے کے جنون میں مبتلا تھے۔ اس جنون نے ان مسیں متشدد مولوی ملاؤں والا کٹر پن پیدا کر دیا تھا اور پرانے زمانے کے محتسبوں کی طرح سنگدل بنا دیا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو دانشوری کو اس طرح برتتے تھے جیسے جعل ساز جعلی سکے چلاتے ہیں۔

اکثر ہمارا ہاتھ تنگ رہتا تھا۔ کہیں اگر میں کہہ دیتی کہ میری اپنی جو رقم ہے اس میں سے کچھ رقم نکال کر اپنا کام چلاتے ہیں یا اس سے چھپا کر اپنی رقم میں سے کچھ پیسے گھر کے کام میں لے آتی تو اس سے اس کے دل کو بہت چوٹ لگتی تھی۔

اگر ہم اپنے خاندان والوں سے کہیں دور رہ رہے ہوتے تو پھر صورت شاید مختلف ہوتی۔ مگر یہاں ان کی موجودگی کا سایہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ انہیں جو بھی حقوق و مراعات حاصل رہے تھے اس ناطے وہ شان تو اب نہیں رہی تھی مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ شان بالکل ہی ختم ہو گئی ہو۔ پرانی شان کی مہک ابھی تک موجود تھی۔ ہم اس مہک کی زد میں تھے۔ امیر یہ سوچتا تھا کہ وہ اپنے طور پر جو کامیابیاں حاصل کرتا ہے وہ بھی انھی کے کھاتے میں چلی جاتی ہیں۔ یعنی لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سب سسرال کے اثر و رسوخ کا فیض ہے۔ اس وقت ہماری نظر میں اس بات کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ سو اس بارے میں کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہماری اقدار ان لوگوں سے بالکل الگ ہیں جن کے بیچ ہم پلے بڑھے ہیں۔ بلکہ شروع میں تو اپنے بزرگوں کو الزام دیتی تھی کہ ان کی دنیا اور ان کی قدریں ہماری دنیا میں دخل دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں اس وقت یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ یہ دخل اندازی ہماری اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے ہے۔

پہلے تو بس پرچھائیاں ہی تھیں لیکن جب ہماری شادی کو ایک برس گزر گیا اور میں نے امیر کو بتایا

کہ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں تو پھر یہ پرچھائیاں ایک ٹھوس شکل میں ڈھلنے لگیں۔ میں تو اپنے حال میں مگن تھی اور بہت اعتماد رکھتی تھی۔ میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ اب سے پہلے کسی کی زندگی میں یہ معجزہ نہیں گزرا کہ ایک بدن کے اندر ایک نئی زندگی کسمسانے لگے اور اسی بدن کے گوشت پوست سے، خون سے، سانس سے توانائی حاصل کرے۔ میں سوچتی تھی کہ یہ ہماری محبت کا کرشمہ ہے، ہمارے وصل کا ظہور ہے۔ اور اب ایک الگ وجود میں ہمارا اس شان سے ملاپ ہوا ہے کہ اب کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔

ایک وقت تھا کہ مجھے ان بچوں پر ترس آیا کرتا تھا جو نفسانی خواہش، وظیفہ زوجیت اور بوریت کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ ترس مجھے ان عورتوں پہ آتا تھا جو ان بچوں کو پیٹ میں رکھتی ہیں، اپنے جسم مردوں کے حوالے کر دیتی ہیں جبکہ انہیں ان سے محبت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بلکہ جسم حوالے کرتے ہوئے ان کے یہاں ایک شرم کا جذبہ بلکہ کراہت کا احساس کام کر رہا ہوتا ہے۔ اور اس گھڑی مجھے یاد آیا کہ ہمیں مرد اور عورت کے تعلق کے بارے میں کیا کچھ بتایا جاتا تھا اور جو کچھ بتایا جاتا تھا وہ سرگوشیوں میں اور اشاروں کنایوں میں بتایا جاتا تھا۔

امیر اب کچھ اداس اور چپ چپ دکھائی دیتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ مجھے اطمینان دلا دیتا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آگے چل کر مجھ پر یہ کھلا، اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے، کہ محبت میں بھی باتوں کو چھپانے اور خفیہ رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ امیر نے اپنا سارا منصوبہ مجھ سے چھپائے رکھا۔ جب تک اس کے سارے مدارج طے نہیں ہو گئے، اس وقت تک اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔

1942ء کے اوائل میں وہ فوج کے محکمۂ تعلقات عامہ سے منسلک ہو گیا اور سال کے ختم ہوتے ہوتے اس کا تبادلہ مشرقِ وسطیٰ میں ہو گیا۔

اپنے اس اقدام کے بارے میں اس نے ایک بیزاری کا رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ اپنا موازنہ وہ اس قسم کے سپاہیوں سے کیا کرتا تھا جو کسی نظریے کسی عقیدے کے تحت بھرتی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ویسے تو شاید وہ اس جنگ کے خلاف بھی تھے مگر چونکہ انہیں اور کوئی روزگار میسر نہیں تھا یا اتنی تنخواہ انہیں کہیں اور نہیں مل رہی تھی اس لیے وہ فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ کہا کرتا تھا کہ جو لیکچرر نوجوانوں کو زندہ رہنے کی تعلیم دیتا ہے اس کی اس افسر کے مقابلے میں کیا اوقات ہے جو نوجوانوں کو مرنے کی تربیت دیتا ہے۔

امیر کے کتنے ہی دوست پہلے ہی فوج میں بھرتی ہو چکے تھے۔ ان میں زیادہ وہ تھے جنہیں اور کوئی مناسب روزگار میسر ہی نہیں آیا تھا۔

امیر کے چلے جانے کے بعد میں نے کرائے کا مکان چھوڑ دیا اور ان پہاڑیوں میں، جو ہمیں بہت مرغوب تھیں، اپنے لیے ایک چھوٹا سا کاٹج خرید لیا۔ مجھ تنہائی کی ماری کی یہ پناہ گاہ تھی۔ میں خوش تھی کہ میں نے رسوم و روایات کی زنجیر توڑ ڈالی اور اپنے خاندان والوں کے ساتھ رہنے کے لیے اُس گھر واپس نہیں گئی۔

ہمارا سب سے گہرا دوست تو اسد تھا۔ مگر جس سال امیر یہاں سے گیا اسی سال اگست میں وہ جیل چلا گیا۔ اس کے خطوں سے بڑی تسکین ملتی تھی۔ اس کے خط جیل سے بھی باقاعدگی سے آتے رہتے تھے۔

میری زندگی اب انتظار کا ایک لامتناہی سلسلہ تھی۔ بچی نے میرے لیے زندہ رہنے کا مقصد مہیا کر دیا تھا۔ بچی پیار اور دیکھ بھال مانگتی تھی۔ میں اس کی یہ ضرورت پوری کر رہی تھی اور اسی میں میرے دن گزر رہے تھے۔

امیر نے جاتے وقت ہنسی ہنسی میں ایک بات کہی تھی۔ کہنے لگا "کم از کم مجھے ایک بات کا اطمینان ہے کہ میرے جانے کے بعد تم حفاظت میں رہو گی۔ شہلا تمہاری خبر گیری کرے گی" (اس نے بچی کا یہی نام رکھا تھا)۔ اس نے سچ کہا تھا۔

سیزن کے دنوں میں کبھی کبھار سیتا یا رومانہ کی طرف سے پارٹی میں شرکت کا دعوت نامہ آ جاتا اور میں ان کی دعوت پر ان کی پارٹی میں چلی جاتی۔ جنگ کے زمانے میں جھیل کے کنارے کتنے ہی ریستوران قائم ہو گئے تھے۔ ان میں یہ پارٹیاں ہوتی تھیں۔ اس جگہ کو لوگوں نے ایک نئے تفریحی مقام کے طور پر دریافت کیا تھا۔ ان لوگوں میں ایک تو وہ تھے جو جنگ کے طفیل امیر بن گئے تھے۔ دوسرے وہ راجہ نواب وغیرہ تھے جو اب جنگ کی وجہ سے سیر و تفریح کے لیے یورپ نہیں جا سکتے تھے۔ کچھ وہ عورتیں تھیں جو اخلاقی پابندیوں سے آزاد زندگی گزارنے کی قائل تھیں۔ کتنا عجیب لگتا تھا کہ ادھر جنگ کی تباہ کاریوں کی خبریں چلی آ رہی تھیں اور ادھر عیش و عشرت کی محفلیں گرم تھیں۔

جہاں میں رہتی تھی وہاں بہت سکون تھا۔ صرف پہاڑی لوگ اور ان کی عورتیں سروں پہ لکڑی اور کوئلے کے بھاری گٹھڑ لادے ڈھلوان پتھریلے رستوں پہ چڑھتے اترتے نظر آتے تھے۔ چیڑ کے پیڑوں میں چلتی ہوا کی سائیں سائیں ضرور سنائی دیتی تھی۔ باقی تو کوئی آواز ہی سنائی نہیں دیتی تھی۔

میرے اندر کوئی قدیمی توہم پرست روح چھپی بیٹھی تھی۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ مجھے اس خوشی کی طرف سے وسواس رہتا تھا۔ جیسے میں اس کا انجام دیکھنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔ جب امیر کے اسیر ہو جانے کی خبر آئی تھی تو اس کے بعد بھی مجھے یہ آس لگی رہی یا شاید میں نے ارادتاً اس آس کو برقرار رکھا کہ وہ واپس ضرور آئے گا۔ لیکن جب یہ خبر ملی کہ وہ فرار کی کوشش کرتے ہوئے مارا گیا تو لگتا تھا کہ لفظ "مارے جانے" کا مفہوم میں کبھی سمجھ نہیں پائی۔

جنگ بس اس برس ختم ہو گئی تھی۔

میرے غم نے میرے یہاں تلخی اور یاس بہت پیدا کر دی تھی۔ لگتا تھا کہ میں ایک بے انت سرنگ میں جی رہی ہوں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرے جسم کا ہر گوشہ ہر مسام کھوکھلا لگتا تھا۔ اس کے باوجود ایک بے شکل بوجھ مجھے اندھیروں میں کھینچے لیے پھرتا تھا۔ اب تو میں اپنی بچی سے بھی غافل ہو گئی تھی۔

نندی ہی اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس کی بھی اور میری بھی۔

پھر یہ بچی ہی مجھے زندگی کی طرف واپس لائی ورنہ میں تو چلتی پھرتی لاش بن کر رہ گئی تھی۔ یہ بچی اور اسد، ان دونوں نے یہ کام انجام دیا۔ اسد ابھی تک جیل میں تھا، لیکن اس کے خط بتاتے تھے کہ زندگی میں اس کا ایمان کتنا پختہ ہے۔ اور ہاں ناصحانہ رنگ ان خطوں میں بالکل نہیں ہوتا تھا۔ ان خطوں ہی کے طفیل میری خودترحمی کے جذبے سے گلو خلاصی ہوئی۔ میں نے یاس کو خیر باد کہا اور زندگی کو مثبت طور پر قبول کرنے اور جدوجہد کرنے کی قائل ہوئی۔

اس نے اپنے خطوں میں یہ تو نہیں کہا کہ تمہاری خلوت گزینی تمہاری خودغرضی کی غماز ہے لیکن میں خوب سمجھتی تھی کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ میں گوشۂ تنہائی سے نکلوں۔ اس نے مجھے اس قسم کا کوئی وعظ نہیں دیا کہ تم نے جو بے عملی کی راہ اختیار کی ہے یہ غلط ہے۔ لیکن اس کی اپنی زندگی مجھے یہی تعلیم دیتی نظر آتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے مجھے خط میں لکھا کہ جب ہم زندگی سے مفاہمت کی کوشش کرتے ہیں تو اس وقت ہم میں سے ہر ایک کو اپنا رستہ خود تلاش کرنا پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا یہ عمل میری اپنی مجبوری ہو۔ میری زندگی کی ضرورت مجھ سے وہ کردار ہی ہو جو میں کر رہا ہوں کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ اسی راستے سے میرا اپنی ذات میں اعتماد بحال ہوتا ہے۔ جب میں اکیلا محض ایک فرد ہوتا ہوں تو اس وقت میں بہت کمزور ہوتا ہوں۔ لیکن جب میں کسی نصب العین سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیتا ہوں تو میں اس نصب العین ہی کی مانند ناقابل شکست بن جاتا ہوں۔ جب میں صرف اپنے لیے جیتا ہوں تو میں ناتواں ہوتا ہوں، ڈرا ہوا ہوتا ہوں۔ جب میں دوسروں کے ساتھ مل کر کسی عمل میں حصہ لیتا ہوں تو ان سب کی طاقت میری طاقت بن جاتی ہے۔

رہائی کے بعد اسد واپس دلی چلا گیا اور غریب لوگوں میں اپنا تعلیمی کام شروع کر دیا۔ لیکن جب 1946ء کے خزاں کے مہینوں میں فسادات ہوئے تو اس کے بعد وہ فساد زدہ مشرقی علاقوں کی طرف نکل گیا اور وہاں فلاحی کام شروع کر دیا۔ پھر جب کانگریس نے عبوری حکومت میں شامل ہونا منظور کر لیا تو واپس دلی آ کر اس نے سیاسی کام شروع کر دیا۔

میں تو دنیا زمانے سے الگ تھلگ اپنے گوشے میں بیٹھی تھی۔ یہ احساس مجھے اسد کے واسطے سے ہوا کہ یہ جو برس گزر رہے ہیں حشر بداماں آئے ہیں اور کسی بڑی تبدیلی کا سامان ساتھ لائے ہیں۔ اپنی نوعمری میں ہم آزادی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ وہ اب آزادی کے اس عمل میں شامل تھا جس کے جلو میں وہ حقیقتیں بھی چلی آئی تھیں جو ہمارے خیال و خواب میں بھی نہیں تھیں، اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ، فوراً بعد پھوٹ پڑنے والے تشدد کے ساتھ۔ سارا سماجی ڈھچر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ڈھیرے ڈھیرے ایک نیا سماجی نظام ابھر رہا تھا۔

اخباروں میں اسد کا نام ایک ابھرتے ہوئے نوجوان کانگریسی نیتا کے طور پر آنے لگا تھا۔ سو جب

وہ اقوام متحدہ میں ایک مندوب کے طور پر بھیجا گیا تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے خطوں میں مجھے وہ دن یاد دلائے۔ جب ہم دنیا کی سیر کرنے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان دنوں یہ بات ہمارے لیے ایسی تھی جیسے کوئی چاند میں جانے کا خواب دیکھ رہا ہو۔ اپنے خطوں میں اس نے کتنے چاؤ سے اُن دنوں کو یاد کیا جب ہم اس نام خدا جوانی میں قدم رکھ رہے تھے اور ہر دم بحثیں کیا کرتے تھے، اُن آدرشوں کی باتیں کیا کرتے تھے جنہیں ابھی کسوٹی پر کسا نہیں گیا تھا۔ اُن دنوں جو اس سے بہت قریب تھے ان میں زاہد کی موت کے بعد تو لے دے کے میں ہی رہ گئی تھی۔

اسد تو عدم تشدد کا ماننے والا تھا۔ زاہد کی موت جس طرح ہوئی وہ اس کے ایمان کی بہت بڑی آزمائش تھی۔ مگر اس نے اپنے اسی ایمان کے ساتھ اس سانحے کو قبول کیا۔ اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تلخی اور انتقام سے تشدد کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور پھر اس تشدد سے متشددانہ کارروائیوں کا ایسا چکر چل پڑتا ہے جس کا کوئی انت نہیں ہوتا۔ اور یہ تو سارا چکر ہی زندگی کی نفی ہے۔ یہ نقطۂ نظر اپنی جگہ، مگر آخر وہ انسان تھا۔ اپنی تلخی کو ضبط کرنے کے لیے اسے اپنے ساتھ بہت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

اگرچہ ہم ایک دوسرے کا بہت پاس کرتے تھے لیکن اس کے باوجود جب ہماری ملاقات ہوتی تھی تو ہم شپٹائے شپٹائے رہتے تھے۔۔۔۔۔ دل میں جو چور تھا۔ ایک دفعہ تو وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آیا۔ کہنے لگا "آخر کس طرح تمہیں ذہن نشین کراؤں کہ میں بھی ہوں آدمی۔ تم نے میرے متعلق جو ایک تصور قائم کر لیا ہے اس سے بندھے رہنا تو مشکل کام ہے۔ میں کوئی صوفی صافی تو ہوں نہیں۔ اور کبھی بھی نہیں رہا۔ آخر اور عورتوں سے بھی تو ہماری ملاقات رہی ہے۔ انہوں نے تو ہمیں دیکھ کے یہی جانا کہ یہ بھی گوشت پوست ہی کی مخلوق ہے۔ ایسے موقعوں پر دل میں ایک ہی خواہش کروٹیں لیتی تھی کہ کاش ان عورتوں کی جگہ تم ہوتیں۔ لیکن تم نے تو ہمیشہ یہی سمجھا کہ میں مَیں نہیں ہوں، بلکہ وہ ہوں جو تم مجھے سمجھتی ہوں۔"

اُس وقت میں بس اس سے یہ نہیں کہہ پائی کہ اسد، میں جانتے بوجھتے تم سے فریب نہیں کرنا چاہتی۔ میرا تو رواں رواں امیر کو یاد کرتا رہتا ہے۔

لیکن اب اس وقت میں حیران ہو رہی تھی کہ مجھ سے میرا دماغ کتنا فریب کرتا رہا ہے اور یہ کہ وہ جو مجھ پہ ایک حد سے بڑھی ہوئی صداقت طاری تھی اس میں کتنا بہت سا جھوٹ ملا ہوا تھا۔

وہ چہرہ جو مجھے گرد آلود آئینے میں سے گھور گھور کے دیکھ رہا تھا اسے میں نے ذرا اور قریب ہو کے دیکھا۔ وہ لڑکی اور امیر تو سدا ایسے ہی رہیں گے۔ مگر میں بوڑھی ہو چلی ہوں۔ وہ مجھ سے کتنی مختلف تھی، وہ لڑکی جس کے بیتے ہوئے کل اور آج ہمیشہ اس کے آنے والے کل کی سمت رواں دواں نظر آتے تھے۔ ادھر میرے آنے والے کل ہمیشہ بیتے ہوئے کلوں میں تحلیل ہوتے دکھائی پڑتے تھے۔

میں نے غیر ارادی طور پر رونا شروع کر دیا۔ اور جب میں نے اس کمرے میں، جہاں مجھے اب

کبھی لوٹ کر نہیں آتا تھا، اپنے آپ کو روتے ہوئے پایا تو میں نے جان لیا کہ میں اصل میں اپنی ہی قید میں ہوں اور یہ کہ اس قید سے رہائی ممکن ہے۔

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ بوڑھا چوکیدار کسی سے کہہ رہا تھا" میں لیلیٰ بٹیا کو یاں پہ گھنٹہ بھر پہلے چھوڑ کے گیا تھا۔ بیٹی اندر ہوں گی۔"

پھر اسد کی آواز سنائی دی" لیلیٰ، تم کہاں ہوں؟"

میں آنکھیں پونچھتی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسد ایک لمبی دبلی پتلی پرچھائیں کی صورت دروازے میں کھڑا نظر آرہا تھا۔

"لیلیٰ!" وہ دھندلکے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا" اس خالی ڈھنڈار گھر میں اتنی دیر سے تم کیا کر رہی ہو؟"

"اسد! میں تمہاری ہی راہ دیکھ رہی تھی۔ اب میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

مجموعے

مجموعہ شفیق الرحمٰن: پچھتاوے، مزید حماقتیں، دجلہ، دریچے، انسانی... — شفیق الرحمٰن

مجموعہ شفیق الرحمٰن: کرنیں، شگوفے، لہریں، مدوجزر، پرواز، حماقتیں — شفیق الرحمٰن

مجموعہ محمد حسن عسکری: (انسان اور آدمی، ستارہ یا بادبان، وقت کی راگنی، جھلکیاں...) — محمد حسن عسکری

مجموعہ احمد ندیم قاسمی: دردودیوار، گھر سے گھر تک، کپاس کا پھول، کوہ پیما، آبلے... — احمد ندیم قاسمی

مجموعہ احمد ندیم قاسمی: آنچل، آس پاس، بازارِ حیات، بگولے، برگِ حنا، نیلا پتھر، سناٹا — احمد ندیم قاسمی

مجموعہ قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا، چاندنی بیگم، میرے بھی صنم خانے — قرۃ العین حیدر

مجموعہ ڈاکٹر محمد یونس بٹ: بٹ پارے، بٹ تمیزیاں، مزاح پرسی، نوک جوک... — ڈاکٹر محمد یونس بٹ

مجموعہ انتظار حسین: گلی کوچے، کنکری، دن اور داستان، آخری آدمی، شہرِ افسوس، کچھوے، خیمے سے دور... — انتظار حسین

مجموعہ عبداللہ حسین: اُداس نسلیں، باگھ، قید، رات، نشیب — عبداللہ حسین

مجموعہ منشی پریم چند: گئودان، نرملا، میدانِ عمل (ناول) — منشی پریم چند

مجموعہ منشی پریم چند: (افسانے) — منشی پریم چند

مجموعہ منشی پریم چند: جلوۂ ایثار، نرملا، چوگانِ ہستی، منورما، بیوہ، روٹھی رانی (ناول) — منشی پریم چند

مجموعہ مرزا ہادی حسن رسوا: (امراؤ جان ادا، مرقع لیلیٰ مجنوں، اختری بیگم، شریف زادہ) — مرزا ہادی حسن رسوا

مجموعہ راشد الخیری: (صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، نوحۂ زندگی، فسانہ سعید، نالۂ زار) — راشد الخیری

ناول افسانے: (تمغۂ شیطانی، ماہِ عجم، عروسِ کربلا، شاہین و دُرّاج، مُرقعِ شہوار، آفتابِ دمشق...) — راشد الخیری

مجموعہ عظیم بیگ چغتائی: مضامین، داستان، ڈرامے، افسانے — تدوین: صلاح الدین محمود

مجموعہ عظیم بیگ چغتائی: ناول، ناولٹ — تدوین: صلاح الدین محمود

مجموعہ عاشق حسین بٹالوی: (تاریخ اور افسانہ) — عاشق حسین بٹالوی

مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد: (ابن الوقت، توبۃ النصوح، بنات النعش، فسانۂ مبتلا...) — ڈپٹی نذیر احمد

مجموعہ ڈاکٹر انور سجاد — ڈاکٹر انور سجاد

مجموعہ سیّد رفیق حسین (آئینۂ حیرت، افسانے، مضامین، شخصی تاثرات) — سیّد رفیق حسین

مجموعہ آغا حشر (ڈرامے)

مجموعہ نثار عزیز بٹ (نگری نگری پھرا مسافر، نے چراغے نے گلے...)

www.sangemeel.com

ISBN 10 969-35-2672-4
ISBN 13 978-969-35-2672-1